اطاعت ونافرمانی، واقعات کی زبانی

عبدالمالک مجاہد

اطاعت و نافرمانی، واقعات کی زبانی

عبدالمالک مجاہد

نام کتاب	:	والدین کی اطاعت ونافرمانی واقعات کی زبانی
تالیف	:	عبدالمالک مجاہد
طابع وناشر	:	مکتبہ بیت السلام مئوناتھ بھنجن (یو۔پی) الہند
سال اشاعت	:	جنوری ۲۰۱۲ء
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار ایک سو
صفحات	:	400
قیمت	:	

- فہیم بکڈپو صدر چوک مئوناتھ بھنجن
- مکتبہ محاذ پتھر گٹی، حیدر آباد
- دکن ٹریڈرس حیدر آباد
- دارالکتب الاسلامیہ دہلی
- مکتبہ الاثر حیدر آباد
- مکتبہ مسلم، بربرشاہ شری نگر کشمیر
- مکتبہ دارالسلام شری نگر کشمیر
- السنۃ بک سینٹر محمد علی روڈ ممبئی
- ھدیٰ بک سینٹر حیدر آباد
- القرآن پبلی کیشنز، میسومہ بازار شری نگر
- فیضی بکڈپو ٹولی چوکی حیدر آباد
- عمری بک ڈپو، اشوک نگر ممبئی

والدین

اطاعت و نافرمانی، واقعات کی زبانی

عبدالمالک مجاہد

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

انتساب

میں یہ کتاب انتہائی محترم اور باوقار شخصیت والد گرامی محمد یونس سپرا کیلانی اور ہمیشہ دعا گو رہنے والی مہربان ہستی والدہ محترمہ رضیہ بیگم رحمۃ اللہ علیہ کے نام معنون کرتا ہوں، جن کی اسلامی اصولوں پر مبنی بہترین تربیت کے باعث ہی اسے مرتب کرنے کے قابل ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے میرے والدین نے عقیدۂ توحید کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی محبت میرے قلب و روح میں ڈالی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ میری زندگی کی تمام تر کوششوں کو قبول فرمائے، انہیں والدین کریمین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے او ان پر اپنی بے پایاں رحمت کی برکھا برساتا رہے۔ آمین!

﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾

مضامین

والدین کو راضی کرنے کے چند اور اصول ②

والدین کو راضی رکھنے کے چند اور اصول ③

والدین کو راضی رکھنے کے چند اور اصول ④

مقدمہ

اسلام نے ہر وہ چیز جس میں اُمت کی بھلائی، خیر خواہی اور فلاح ہو، اس کو کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر وہ چیز جس میں فتنہ وفساد اور اُمت کے لیے نقصان ہو، اُس سے سختی سے منع کیا ہے۔

اسلام نے جن کاموں کا حکم دیا ہے، ان میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی اطاعت اور فرماں برداری بھی شامل ہے۔ شریعت کی نگاہ میں یہ حسنِ خلق ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو نیکی کرنے کا حکم دیا ہے اور حُسنِ اخلاق کی تلقین کی ہے۔ جب اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، ہمسایوں، اہل محلّہ اور تمام مسلمانوں بلکہ بلاتفریق مذہب و ملت ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرنا اور حسن سلوک سے پیش آنا کس قدر ضروری ہے۔

زیر نظر کتاب میں والدین کی اطاعت اور فرماں برداری کے حوالے سے مختلف واقعات جمع کیے گئے ہیں۔ یہ سچے واقعات ہیں جو میں نے مختلف کتابوں سے مطالعہ کے دوران جمع کیے ہیں۔ پہلے خیال آیا کہ صرف والدین سے حسن سلوک والے

واقعات بیان کیے جائیں، پھر سوچا کہ والدین کی نافرمانی کے حوالے سے بھی مختلف واقعات بطور عبرت اس کتاب میں شامل کر دیے جائیں۔

والدین کو کیسے راضی کیا جائے؟ اس عنوان کے واقعات کتاب کے صفحات میں جابجا پھیلا دیے گئے ہیں تاکہ قارئین کرام ان سے استفادہ کر کے اپنے والدین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مستعد ہو کر راہِ عمل پر گامزن ہو جائیں۔

یاد رکھیے کہ والدین ناراض ہوتے ہیں تو اولاد کی طرف سے اظہار ندامت پر فوراً خوش بھی ہوجاتے ہیں...... اس کتاب کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہم والدین کے ساتھ حسن سلوک کے واقعات پڑھ کر ان سے سبق حاصل کریں۔ اپنے والدین کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ وہ زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں، دونوں صورتوں میں ان کو ہماری ضرورت ہے۔

کتاب میں والدین کی نافرمانی کے واقعات بھی موجود ہیں۔ انھیں بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم فوراً اپنا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ خدانخواستہ ہم تو دانستہ یا نادانستہ اس قسم کی غلطی کے مرتکب نہیں ہو رہے۔ یہ عبرتناک واقعات ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ایسی ناخلف اولاد بھی موجود ہے جس کا کام والدین کو تنگ کرنا اور ان کی نافرمانی کرنا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کا جو انجام ہوتا ہے، وہ نہایت عبرتناک ہوتا ہے۔ ایسے واقعات بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہوسکتا ہے انھیں پڑھ کر کوئی شخص راہ راست پر آجائے اور اپنے والدین کی نافرمانی چھوڑ کر ان کا فرماں بردار اور اللہ کی رحمت کا حقدار بن جائے۔

یہ سارے واقعات بڑی حد تک عربی کتابوں اور کیسٹوں سے جمع کیے گئے ہیں۔

اس معاشرے میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو والدین کی بے حد عزت کر کے اپنے لیے جنت کا سامان تیار کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسے بھی بدبخت ہیں جو والدین کی حکم عدولی کر کے اپنے لیے جہنم کا ایندھن بھڑکا رہے ہیں۔

کتاب کی تیاری میں ہمارے ادارے کے مصری رفیق کار اشرف صاوی نے مجھ سے بہت تعاون کیا۔ کتاب کے ترجمہ میں برادرم رضوان اللہ ریاضی نے بھی بڑی مدد کی۔ انھوں نے بہت سی کہانیوں کو عربی سے اردو کے قالب میں ڈھالا۔

میں جناب ڈاکٹر افتخار کھوکھر (اسلام آباد) اور دارالسلام لاہور کے حافظ محمد ندیم، جناب احمد کامران دہلوی، ہارون الرشید، گل رحمٰن اور دیگر رفقائے کار کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کتاب کی تصحیح میں تعاون کیا۔ میں اس کتاب کی پیش کش کے سلسلے میں مدیر دارالسلام لاہور عزیزی حافظ عبدالعظیم اسد کی ہمہ جہت توجہ اور نگرانی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ کرے یہ کتاب برگ و بار لائے اور ہماری نئی نسلوں کو والدین کی مرتبہ شناسی سے مالا مال کرے۔

کتاب کے بارے میں قارئین کرام کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آپ کا بھائی

عبدالمالک مجاہد

مدیر عام، دارالسلام پبلشرز، ریاض۔ لاہور

قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں والدین کا درجہ

قرآن کریم کی روشنی میں والدین کا درجہ

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں والدین کے حقوق کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا ۖ وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾

''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک اور احسان کرو۔'' [1]

امام ابن کثیر نے والدین کے ساتھ احسان کے بارے میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ احسان کی وصیت فرمائی ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمھارے والدین کو تمھیں عدم سے وجود بخشنے کا سبب بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مقامات پر جہاں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی والدین سے حسن سلوک کا بھی حکم دیا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا ۖ وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ﴾

''کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے،

---

[1] النسآء 4:36.

یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔“ [1]

اللہ رب العزت نے والدین کے حقوق کے حوالے سے یوں ارشاد فرمایا:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسٰنًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝﴾

”اور تیرا پروردگار صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا وہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ کرنا نہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا بلکہ ان کے ساتھ ادب واحترام کے ساتھ بات چیت کرنا۔“ [2]

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ربوبیت الٰہی کے تقاضوں کے ساتھ اطاعتِ والدین کے تقاضے پورے کرنا بھی اشد ضروری ہے۔

بڑھاپے میں بطور خاص اُن کے سامنے ”ہوں“ تک کہنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے اور ان کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے منع کیا گیا ہے۔ بڑھاپے میں والدین کمزور، بے بس اور لاچار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اولاد جوان اور وسائل معاش پر قابض ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جوانی کے الھڑ اور دیوانے جذبات اور بڑھاپے کے سرد وگرم چشیدہ تجربات میں تصادم ہوتا ہے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ ان حالات میں والدین کے ادب واحترام کے تقاضوں کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھنا اور ہر وقت بہر حال والدین کی خدمت اور اطاعت کرنا اولاد کے لیے فرضِ لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔

[1] الأنعام 6:151۔ [2] بنی إسرآءیل 17:23۔

احادیث کی روشنی میں والدین کا درجہ

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک مشہور صحابی ہیں۔ خیر کے کاموں میں پیش پیش رہنے والے ہیں، نیکی میں سبقت لے جانے والے ہیں۔ آپ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوجائے۔ وہ اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کررہے ہیں:

«أَيُّ الْأَعْمَالِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰی؟»

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کون سا ہے؟''

اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلصَّلَاةُ عَلٰی وَقْتِهَا» نماز اپنے وقت پر......عرض کیا کہ اس کے بعد کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''والدین کے ساتھ نیکی کرنا، ان کی اطاعت اور فرماں برداری کرنا۔'' [1]

ذرا غور فرمائیں اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کے بعد جس نیک کام کو دوسرے نمبر

---

[1] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، حديث: 527.

پر رکھا وہ والدین کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔

اللہ رب العزت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، انھوں نے ان سوالات کے ذریعے اسلام کی راہوں کو مزید روشن کر دیا۔

بات والدین کے حقوق، ان کی عزت اور توقیر کے حوالے سے ہو رہی تھی تو چلیے ایک اور واقعہ پڑھتے ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت جاہمہ بن عباس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نہایت ادب سے عرض کیا: میں غزوہ میں شرکت کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کی خدمت میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پوری امت کے خیر خواہ اور معلم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

«هَلْ لَّكَ مِنْ أُمٍّ» ''کیا تمھاری ماں زندہ ہے؟''

جاہمہ عرض کرتے ہیں: جی ہاں! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں زندہ ہے۔

کائنات کی سب سے سچی ہستی نے ارشاد فرمایا:

«فَالْزَمْهَا فَإِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا»

''جاؤ اپنی والدہ کی خدمت کرو کہ جنت اُس کے قدموں تلے ہے۔''[1]

عربی زبان میں والدین کی اطاعت اور فرماں برداری کو بر الوالدین کہا جاتا ہے۔

البر کا لغوی مفہوم صدق، اطاعت اور اصلاح ہے اس کا الٹ عقوق ہے۔

البر کا شرعی مفہوم وسیع ہے۔ اس میں والدین کے ساتھ احسان کرنا، جن معروف کاموں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کو پُورا کرنا، والدین کی عزت کرنا، ان کی

[1] سنن النسائي، الجهاد، حديث: 3106، ومسند أحمد: 429/3.

اطاعت کرنا، ان کی خوشنودی کا آرزومند رہنا، اپنے آپ کو ان کی خدمت کے لیے وقف رکھنا، ان کے ساتھ نرمی کرنا، ان کی دیکھ بھال کرنا، ان کی نافرمانی سے بچنا اور ان کو جو تکلیف اور پریشانی لاحق ہو اسے دور کرنا بھی شامل ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

«اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ»

''نیکی کرنا حُسنِ اخلاق میں سے ہے۔'' [1]

---

[1] صحیح مسلم، البر والصلة، حدیث: 2553.

والدین کو راضی رکھنے کے چند اور اصول

(1)

والدین کو راضی رکھنے کے سنہرے اصول

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور خصوصاً والدہ کی اطاعت اور فرماں برداری پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بہت زور دیا ہے۔ خاص طور پر جب والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کی عزت واحترام اور ان کے احکام کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد ان کے سامنے جھک جائے اور ان کی فرمائش پوری کرے۔

حقوق والدین تو کبھی پورے ہو ہی نہیں سکتے، البتہ بعض ایسے طریقے ضرور ہیں جن پر عمل کر کے آپ ان کی رضا حاصل کر سکتے ہیں، ان کو خوش کر سکتے ہیں، مثلاً: مختلف مواقع، جیسے عید الفطر، عید الاضحیٰ یا رمضان مبارک کے آغاز پر، اُن کی خوشیوں کا خیال رکھا جائے۔ بیٹے یا بیٹی، پوتی، بہن یا بھائی کی شادی کے موقع پر ان سے پوچھیں کہ اس موقع پر ان کا مشورہ، رائے اور خواہشات کیا ہیں، آپ شادی کے اس موقع پر کون سا لباس پسند کریں گے، ان سے مشورہ کریں کہ شادی شدہ نئے جوڑے کو کیا چیز تحفے کے طور پر دی جائے۔ اگر آپ کسی دوسرے شہر میں ہیں تو یہ باتیں فون پر بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر کمپیوٹر پر انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہو تو سکائیپ (Skype) کے ذریعے سے ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ کر مشورہ کر لیں۔

والدین کو محسوس کرائیں کہ وہ ہر معاملے اور مشورہ میں شریک ہیں، مثلاً: گرمی کا موسم آرہا ہے یا سردی کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ آپ والدہ صاحبہ سے یا والد صاحب سے کہیں کہ چلیں بازار چلتے ہیں، وہاں سے آپ کی مرضی کے کپڑے خریدتے ہیں۔ اگر وہ کسی وجہ سے جانے پر راضی نہ ہوں تو ان کی پسند اور مرضی کے مطابق کپڑے خرید کر پیش کر دیں۔ اس طرح آپ دیکھیں گے کہ ان کو کتنی خوشی ہوتی ہے اور ان کے منہ اور دل سے آپ کے لیے کتنی دعائیں نکلتی ہیں۔

آپ موقع کی مناسبت سے اُن کو سرپرائز بھی دیں۔ اچانک ان کے سامنے ان کی پسند یا ضرورت کی چیزیں رکھ دیں۔ نہایت ادب اور احترام سے بتائیں کہ اماں جان یا ابا جان میں بازار میں تھا، آپ کی ضرورت اور پسند کی چیزیں میرے دل کو بھا گئیں، اس لیے میں نے آپ کے لیے خرید لیں، انھیں قبول فرمائیں۔ اس قسم کے کاموں سے والدین کو بے حد خوشی ہوتی ہے۔

مجھے اپنی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں ایک کام کی غرض سے امریکہ میں مقیم تھا۔ ہیوسٹن شہر میں پرانی کاروں کا ایک شوروم تھا۔ وہاں سات سیٹوں والی ایک گاڑی میرے دل کو بھا گئی، میں نے اسے خرید لیا۔ میں نے والدہ صاحبہ کو فون کیا، انھیں گاڑی خریدنے کی اطلاع دی اور کہا کہ اس میں ایک سیٹ آپ کے لیے مخصوص ہے۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیے ان کو میری اس بات سے اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ کئی دن تک میرے اس فون کا چرچا کرتی رہیں۔ اپنے ملنے اور جاننے والوں کو بتاتی رہیں کہ میرے عبدالمالک نے گاڑی خریدی ہے جس میں ایک سیٹ میرے لیے بھی رکھی ہے۔ میں نے بلا شبہ ان سے غلط بات نہیں کہی تھی۔ انھیں گاڑی میں بہر حال بیٹھنا

تو تھا ہی مگر صرف میری اس بات سے کہ ''ایک سیٹ آپ کی ہے!'' ان کو جو مسرت نصیب ہوئی اس کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے، مجھے یہ نازک سا خیال ضرور آتا ہے کہ ماں کی محبت کا پیالہ بھی کتنا اُتھلا ہے جو بیٹے کی ایک ننھی سی بات سُن کر ہی خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔

اگر آپ سفر کے لیے روانہ ہو رہے ہیں تو کوشش کریں کہ سب سے آخر میں جنھیں الوداع کہیں وہ آپ کے والدین ہوں اور آپ کی آنکھوں نے سب سے آخر میں ان کا دیدار کیا ہو۔ روانگی سے پہلے ان کے پاس بیٹھ جائیں، ان کو بتائیں کہ میں سفر پر جا رہا ہوں۔ میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالی مجھے کامیاب کرے۔ سفر کی مشکلات سے محفوظ رکھے۔ راستہ میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

آپ والدین کے چہرے ہی سے محسوس کرلیں گے کہ وہ آپ کی ان ننھی ننھی دلنواز باتوں سے کتنے خوش ہیں اور پھر یقیناً ان کی قبول ہونے والی دعاؤں کے بھی آپ حقدار بن جائیں گے ان شاء اللہ۔ اسی طرح جب آپ سفر سے واپس تشریف لائیں تو ممکن صورت میں سب سے پہلے والدین کے پاس جائیں۔ بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ ملاقات کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں۔ اگر ان کی صحت اجازت دیتی ہو اور وہ سو نہ رہے ہوں تو پھر فوراً ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جائیں۔ ان کے پاس بیٹھیں، ان کے حالات، ان کی صحت اور دیگر امور کے بارے میں پورے اطمینان اور احترام سے ان کی باتیں سنیں۔ انھیں اپنے سفر کے حالات بتائیں۔ اگر اس سفر میں کوئی نمایاں کامیابی ہوئی ہے تو انھیں یہ خوش خبری ضرور سنائیں۔

دوران سفر کوشش کریں کہ روزانہ ایک مرتبہ اُن سے بات ضرور ہو جائے۔ یہ

دورانیہ چاہے چند منٹ ہی کا ہو۔ کیونکہ ان کی مامتا کو آپ کی آواز سن کر ہی قرار ملے گا۔ آپ کا فون کرنا ان کے لیے کتنی ناقابل بیان مسرت کا سبب بنے گا؟ شاید آپ اس کا تصور بھی نہ کر سکتے ہوں۔

سفر کے علاوہ اگر آپ اُس شہر میں مقیم نہ ہوں جہاں آپ کے والدین کا گھر ہے تو اس صورت میں آپ لازماً فون پر ان کی خیریت دریافت کرتے رہا کریں۔ انھیں اپنے حالات اور واقعات کی خبر کرتے رہا کریں۔ اگر آپ اسی شہر میں مقیم ہیں جہاں والدین کا گھر ہے اور کسی وجہ سے وہ آپ کے ساتھ نہیں رہتے تو اس صورت میں آپ کوشش کریں کہ روزانہ ان کی زیارت کے لیے جائیں۔ ممکن ہو تو ان کے ساتھ ایک وقت کا کھانا کھائیں۔ چائے نوش کریں۔ ان کے ساتھ دل کو خوش کرنے والی باتیں کریں۔ ان کا دل بہلائیں اور ان سے دعائیں لیں۔

والدہ صاحبہ سے ملاقات کے دوران ان کے ہاتھ اور ماتھے پر بوسہ دیں۔ ممکن ہو تو ان کے قدموں کو چومیں۔ راقم الحروف نے بار بار اپنی والدہ محترمہ کے پاؤں چومنے کی سعادت حاصل کی۔ میں ان کے پاؤں اپنے گالوں پر رکھ لیتا۔ ان کو ہلکا ہلکا تھپتھپاتا۔ کبھی کبھی گدگدی بھی کرتا ان کو چومتا اور لذت لیتا۔

جن لوگوں نے اپنے والدین کی عزت وتوقیر کی، ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو چوما، ان کی اولاد بھی اپنے والدین کی عزت وتوقیر کرتی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم نے اپنی زندگی میں اپنے والدین کی عزت وتوقیر کی۔ ان کے ہاتھوں اور سر کو چوما، آج ہماری اولاد ہمارے ہاتھ چومتی ہے۔ خود میرا بیٹا طلحہ جو ان دنوں انگلینڈ میں زیر تعلیم ہے، تعطیلات میں گھر آیا تو کہنے لگا: ''ابو جان! میں وہاں سے یہ نیت کر کے

آیا ہوں کہ میں روزانہ کم از کم تین مرتبہ آپ کی مالش کیا کروں گا۔ عموماً بچے رات کو پاؤں دباتے ہیں۔ خود میرا تجربہ ہے کہ اگر آپ بیمار ہیں یا تھکے ہوئے ہیں تو بچے آپ کو دبانا شروع کر دیتے ہیں جس سے چند ہی منٹ میں آپ کی طبیعت تروتازہ ہوجاتی ہے۔ آپ کی آدھی سے زیادہ بیماری یا تھکاوٹ ختم ہوجاتی ہے۔

آپ اپنی اولاد کو اپنی دادی جان، دادا جان، نانا جان، نانی جان اور دیگر عزیز و اقارب کے بارے میں بتائیں۔ ان کے مقام اور مرتبے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کو بیان کریں۔ ان کے دل میں ان کی محبت پیدا کریں ان کے سامنے اپنے والدین کی خدمت کریں۔ تاکہ آپ ان کے لیے نمونہ بن سکیں۔

اپنے والدین کی ضروریات زندگی خود اپنے ہاتھوں سے پوری کریں، مثلاً: صفائی سے ان کے بستر لگا دیں، ان کے جوتے پالش کر کے تیار رکھیں، ان کے کپڑے استری کر کے الماری میں لٹکائیں۔ ممکن ہے کہ گھر میں نوکرانی ہو یا آپ کی بیٹی یا بیوی یہ خدمت انجام دے مگر والدین کے یہ ذاتی کام کر کے جو مزہ آپ کو ملے گا وہ دوسروں کے ہاتھوں سے آپ کو کبھی میسر نہیں آئے گا۔ اس طرح آپ دیکھیں گے کہ آپ اپنے والدین کے کس حد تک قریب ہوتے ہیں۔ ان کی چیزوں کو وقت پر ترتیب دیں۔ اگر اُن سے وعدہ کیا ہے کہ میں فلاں وقت آؤں گا تو اُسے ہر حالت میں پورا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر کوئی مجبوری پیش آجائے تو لازماً اُن کو اطلاع کریں۔

زندگی میں آپ کو یقیناً بہت پیاری کامیابیاں ملتی ہیں۔ آپ اُس ترقی اور کامیابی کو ہمیشہ اپنے والدین سے منسوب کریں کہ اُن کی دعاؤں سے اور ان کی اعلیٰ تربیت کے نتیجہ میں مجھے یہ کامیابی ملی ہے۔ والدین کو ان باتوں سے بڑی خوشی اور فخر کا احساس

ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کی تربیت کے نتائج اپنی زندگی میں دیکھ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اولاد کی تمام تر کامیابیاں، والدین ہی کی کامیابی ہوتی ہے۔

اپنی کامیابی اور ترقی کی اطلاع سب سے پہلے اپنے والدین کو دیں۔ اپنے راز کی باتیں اُن کو بتائیں۔ اُن کو اس میں شریک کریں۔ اس سے اُن کو عجیب فرحت اور خوشی ملے گی۔ آپ اُن کے دل کے قریب ہوجائیں گے۔ اُن کو احساس ہوگا کہ ہمارا بیٹا اِس عمر میں بھی ہمارا تابع فرماں ہے۔ بوڑھے والدین کے علاج معالجے، ان کے لیے مطلوبہ آلات اور ادویات مہیا کرنا اپنی اولین ذمہ داری سمجھیں۔ اگر اُن کو بلڈ پریشر ہے یا شوگر کا مرض لاحق ہے تو اچھے ڈاکٹر سے مناسب وقت پر چیک اَپ کرواتے رہا کریں۔ اگر مالی وسائل اجازت دیں تو بلڈ پریشر اور شوگر کے لیے بازار سے مشینیں دستیاب ہیں، ان کو خرید کر گھر میں رکھیں۔ آپ خود ان کے استعمال کا طریقہ سیکھیں۔ ذرا تصور کریں کہ آپ صبح یا شام اپنے والدین میں سے کسی کا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں امّاں جان، ابّا جان میں آپ کا بلڈ پریشر چیک کرنا چاہتا ہوں۔ خاصے دن گزر گئے ہیں آپ کی شوگر چیک نہیں کی۔ لائیے میں آپ کی شوگر چیک کردوں۔ یہ چند منٹوں کا کام ہے مگر اس سے والدین کے دل و دماغ میں آپ کے لیے محبت و پیار کے زمزمے بہہ اٹھیں گے۔

کہتے ہیں کہ بڑھاپا خود ایک بیماری ہے۔ آپ والدین کے ماہانہ چیک اپ کا بندوبست کریں۔ ڈاکٹر سے ان کے لیے وقت حاصل کریں۔ اُن کا ہر دو یا تین ماہ بعد میڈیکل چیک اپ کروائیں۔ اس سے آپ کو بھی اور آپ کے والدین کو بھی صحت کے حوالے سے اطمینان رہے گا۔
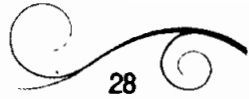
فرض کیجیے والدین کی رپورٹ مثبت آتی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو اپنی خوشی میں شریک کیجیے۔ انھیں بتایئے کہ الحمدللہ! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کی رپورٹ بالکل مثبت اور اطمینان بخش ہے۔ آپ کو اللہ کے فضل سے کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ بالکل تندرست ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کی بیماری خطرناک ہے تو پھر ان کو ہر چیز بتانے کی ضرورت نہیں۔ صبح و شام ان پر آیات اور مسنون اذکار پڑھ کر دم کریں۔ جس مقام پر درد ہے یا کوئی تکلیف ہے، اس جگہ ہلکی ہلکی مالش کریں، سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کریں۔ ان شاء اللہ ان کو راحت ملے گی۔

انھیں تسلی دیں کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، آپ ان شاء اللہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ اُن کو ایسے واقعات نہ سنائیں جن سے ان کی پریشانی میں اضافہ ہو، مثلاً: ان سے یہ کہنا قطعاً نامناسب ہے کہ اس بیماری میں ہمارا فلاں رشتہ دار یا دوست وفات پا گیا تھا۔ بلکہ ان کو حوصلہ دیں کہ اسی کا نام تو زندگی ہے۔ یہاں بیماری اور تندرستی ہر ایک کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ یہ جو آپ پر بیماری آئی ہے ان شاء اللہ یہ آپ کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ بس چند دنوں کی بات ہے کہ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔

تین مقبول دعائیں

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین دعائیں ایسی ہیں جن کی قبولیت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

- دعوة المظلوم (مظلوم کی پکار)
- ودعوة الوالد علی وَلَدِهِ (والد کی اپنے بیٹے کے لیے دعا)
- ودعوة المسافر (مسافر کی دعا) [1]

امام حسن بصری سے پوچھا گیا کہ والدین کی اپنی اولاد کے حق میں کیا دعا ہے۔

کہنے لگے کہ اللہ اُسے آخرت میں نجات عطا فرمائے۔

سوال کرنے والے نے پوچھا کہ والدین کی اپنی اولاد کے لیے بددُعا کیا ہے؟

جواب دیا کہ اُس کی بربادی۔

---

[1] جامع الترمذي، البر والصلة، حديث: 1905، وسنن أبي داود، الوتر، حديث: 1536.

سفاک بیٹے کا عبرتناک انجام

اس کے انتہائی مالدار والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے خاصی دولت چھوڑی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد اس کا یہ اکلوتا بیٹا اپنی ماں کا خدمت گزار تھا۔ باپ کے ترکہ میں سے وہ حتی المقدور اپنی ماں کی خدمت کرتا اور اس کی دیکھ بھال پر خاصی رقم خرچ کرتا تھا۔

ایک دن ایسا بھی آیا جب وہ شادی کے بندھن میں بندھ گیا۔ اب وہ شادی شدہ نوجوان تھا۔ اس کے گھر میں ماں کے ساتھ اب ایک بیوی بھی جلوہ افروز ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی خوبصورت تو ضرور تھی مگر دوسروں کے حق میں اس کا رویہ بہت برا تھا۔ وہ خودغرضی اور مفاد پرستی کی تمام حدیں پار کر چکی تھی۔ اپنے مفاد اور مطلب کے مقابلے میں اُسے ہر چیز ہیچ اور ناقابلِ توجہ نظر آتی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے اپنی ساس سے بڑا ناروا سلوک کیا اور اُس کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہ اپنی ساس کے ساتھ زبان درازی سے بھی باز نہیں آتی تھی۔

اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اُس کی ساس کو مرگی کی بیماری لاحق ہوگئی۔ بس اب کیا تھا، وہ بیچاری بیٹے کے ہوتے ہوئے بھی اپنی بہو کی بدتمیزی بے رخی اور بے حسی کا شکار ہو

گئی۔ بوڑھی ساس کا وجود بہو کے لیے عذاب بن چکا تھا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، کشمکش بڑھتی گئی اور ماحول کی تلخی میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک وقت آیا کہ بہو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ساس کے ساتھ رہنا اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔ ایک دن اس نے اپنے شوہر سے صاف صاف کہہ دیا:

"تمھیں اب دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے: اپنی ماں کے ساتھ رہو، یا میرے ساتھ، اب میں تمھاری ماں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

بیٹے نے ازحد کوشش کی کہ اپنی بیوی کو کسی طرح صبر ورضا پر قائل کر سکے، مگر لاکھ سمجھانے بجھانے کے باوجود اس کی رفیقِ حیات اُس کی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ اب اس کے سامنے دو میں سے ایک ہی راستہ تھا، ماں کی جدائی یا بیوی سے علیحدگی۔

یہ ایسا پُرآشوب اور مشکل وقت تھا کہ اس کے لیے کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا۔ اس نے کافی دیر غور کیا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے ماں کے ساتھ نہیں بلکہ بیوی کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔

اب کیا تھا، اس پر بیوی کی محبت کا بھوت سوار ہوگیا۔ خبیث شیطان نے اس کے فیصلہ کو اُس کی نگاہ میں خوشنما بنا دیا۔ اور وہ اپنی اُس ماں کو جدا کرنے پر راضی ہوگیا جس نے نجانے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا کر اس کی پرورش کی تھی۔

وہ شدید سردی کی رات تھی۔ اس نے اپنے شیطانی فیصلے کی تکمیل کے لیے ماں کو چھت پر چڑھایا اور پھر چھت سے نیچے دھکا دے دیا۔ جی ہاں، چھت سے نیچے...... جی ہاں، اپنی ہی ماں کو اوپر سے نیچے پھینک دیا۔ بے چاری بوڑھی ماں اپنی زندگی کے آخری سانسوں کے ساتھ زمین پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اپنے پروردگار سے اپنے ہی
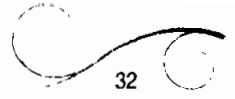
لختِ جگر کی شقی القلبی کی شکایت کر رہی تھی۔ جس نے اسے انتہائی بے دردی سے چھت سے اُٹھا کر نیچے پھینک دیا تھا۔

مجرمین اور منافقین کی یہ عادت ہوا کرتی ہے کہ اپنے کالے کرتوتوں کو نیکی کا نقاب ڈال کر پیش کرتے ہیں۔ اُس بدبخت بیٹے نے بھی ایسا ہی کیا۔ ماں کی تجہیز و تدفین کے بعد اس نے مجلسِ تعزیت منعقد کی، تاکہ لوگ اس سے ہمدردی کے لیے آئیں۔ اس سے تعزیت کریں اور اس کو دعائیں دیں۔ مگر وہ ظالم اِس بات سے بے خبر تھا کہ وہ قادرِ مطلق اللہ رب العالمین اُس کے گھناؤنے کرتوت سے بخوبی واقف ہے جسے اونگھ آتی ہے نہ نیند، جو دلوں میں چھپے ہوئے بھید بھی جانتا ہے۔

دن گزرتے گئے۔ راتیں ڈھلتی رہیں۔ ظالم بیٹا زندگی کی رعنائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ اللہ کی مار سے بے خبر تھا۔ وہ اِس بات سے بے خوف ہو چکا تھا کہ اُسے اس کی سفاکی کی سزا ملنے والی ہے۔ بھلا اللہ تعالیٰ کی مار دنیا کے مجرمین سے کیسے ٹل سکتی ہے؟ اس کے دربار میں انصاف ضرور ملتا ہے، چاہے فیصلے کے نفاذ میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔ کیونکہ اللہ کا فیصلہ اور انصاف اپنے وقت پر ہی ہوتا ہے۔

آخر کار اللہ کی مار کا وقت آن پہنچا۔ اُس ظالم بیٹے کو بھی اچانک وہی بیماری لاحق ہوگئی جس بیماری سے اس کی ماں دوچار تھی۔ اس کے جنون اور مرگی کے دوروں سے اس کی بیوی پریشان ہوگئی۔ اب بیماری لاحق ہونے کے بعد بیوی کا اپنے شوہر کے ساتھ وہی رویہ تھا جو اُس کا ماں کے ساتھ تھا۔ اب وہ ظالم بیٹا اپنی پیاری اور چہیتی بیوی کی بے رُخی کا شکار ہو چکا تھا جس کی خاطر اُس نے اپنی ماں کو چھت سے دھکا دے کر ہلاک کر دیا تھا۔

وہ ایک سرد رات تھی جب وہ عالمِ جنون میں گھر کی چھت پر چڑھ گیا۔ مگر اِس بار وہ کسی کے سہارے چھت پر نہیں چڑھا تھا بلکہ خود ہی ہمت کر کے اوپر گیا تھا۔ اب وہ چھت کے اسی حصے پر پہنچا جہاں سے اس نے اپنی ماں کو دھکا دے کر نیچے پھینکا تھا۔ اُس نے یکدم چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی اور چند ہی لمحوں بعد اُسے اپنے کالے کرتوت کا پورا پورا بدلہ مل چکا تھا۔ [1]

[1] دیکھیے: کتاب: أنين القلوب، تالیف: مصطفیٰ کامل اور کتاب: قصص ومآس من عقوق الوالدين، ص:77,76.

ماں کی دعا سے بیٹے کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں

حافظ ابوبکر طرطوشی رحمہ اللہ مشہور و معروف عالم دین گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں ماں کی دعا کی برکت کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک خاتون بقی بن مخلد رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ بقی بن مخلد رحمہ اللہ سرزمینِ اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کے علم اور تقویٰ کا دُور دُور تک چرچا تھا۔ یہ علم کا سمندر اور فراست کا پہاڑ تھے۔ فن درایت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اُندلس کے نامور علمائے کرام میں ان کا درجہ بڑا ممتاز تھا۔

مذکورہ خاتون نے بقی بن مخلد رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ میرے بیٹے کو اہلِ روم نے گرفتار کر لیا ہے۔ میرے پاس اسے فدیہ دے کر اہلِ روم سے چھڑانے کے لیے ایک چھوٹے سے گھر کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اور اس گھر کو فروخت کرنے کی بھی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ کسی اہل خیر کے بارے میں مجھے بتائیں جو میرے بیٹے کو چھڑانے کے لیے فدیہ کی ادائیگی کر سکے۔ جب سے میرا بیٹا گرفتار ہوا ہے مجھے نہ رات کو چین ہے نہ دن کو قرار ہے۔ میری آنکھوں سے نیند اُڑ چکی ہے۔ میں ہر وقت اپنے بیٹے کی رہائی کی دعائیں مانگتی ہوں۔

بقی بن مخلد رحمہ اللہ نے خاتون کی آہ وزاری سن کر فرمایا: اس سلسلے میں مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو، ان شاء اللہ تعالیٰ جو بن پڑے گا ضرور کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا سر جھکا لیا اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگے۔ادھر والدہ بھی مسلسل دعائیں مانگ رہی ہے۔ اپنے رب سے آہ و زاری کر رہی ہے۔ اور پھر والدہ کی دعائیں رنگ لاتی ہیں۔ چند دنوں کے بعد وہ خاتون دوبارہ بقی بن مخلد رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ساتھ میں اس کا وہ بیٹا بھی تھا جسے رومیوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ بیٹا! ذرا اپنی گرفتاری اور رہائی کی داستان شیخ صاحب کو سناؤ۔ وہ بتانے لگا:

''واقعہ یہ ہے کہ روم کے ایک شہزادے نے مجھے گرفتار کرایا تھا۔ میں اس کے قید خانے میں بند پڑا تھا۔ قیدیوں پر ایک آدمی مامور تھا جس کی ہر ادا ہمیں تکلیف دینے والی تھی۔قید خانہ میں ہماری حالت یہ تھی کہ ہمیں بُری طرح زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ ہم اُس کی ایذا رسانی سہتے۔ اُس کی زبان درازی برداشت کرتے۔ ایک رات ہم قیدیوں سے انتہائی مشقت کا کام لیا گیا۔ جب ہم کام کر کے قید خانے میں واپس آئے تو اچانک میرے پاؤں کی زنجیر ٹوٹ کر زمین پر گر پڑی۔''

زنجیر گرنے کا وقت وہی تھا جب اس کی والدہ اور شیخ بقی بن مخلد رحمہ اللہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا۔ نوجوان نے کلام کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مزید بیان کیا:

''زنجیر گرتے ہی وہ آدمی جو قیدیوں کی نگرانی پر مامور تھا، میری طرف متوجہ ہوا اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

’’تم نے زنجیر توڑ دی؟‘‘

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا: نہیں نہیں، میں نے اپنی زنجیر کو ہاتھ تک نہیں لگایا، بلکہ یہ خود ہی میرے پیر سے ٹوٹ کر گر گئی ہے، چنانچہ اسی وقت لوہار کو بلایا گیا اور زنجیر کی مرمت کروا کر میرے پاؤں میں پہنا دی گئی۔ میں ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ یکا یک زنجیر پھر ٹوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ اتنی مضبوط زنجیر کا یکا یک ٹوٹ جانا بڑا تعجب خیز معاملہ تھا، سپاہیوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ یہ معمولی واقعہ نہ تھا۔ سپاہی نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بلوایا۔ ان کو اس واقعہ سے آگاہ کیا اور پھر بات جیل کے بڑے افسروں تک جا پہنچی، انھوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کو بلا کر سارا ماجرا سنایا۔ بڑا پوپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ میرے پاس آیا۔ اس نے پوچھا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ کہنے لگا:

’’تیری والدہ کی دعا نے قبولیت حاصل کر لی ہے، جب اللہ تعالیٰ نے تجھے رہائی دے دی ہے تو پھر ہم کیونکر تجھے پابند سلاسل رکھیں۔‘‘

چنانچہ رومی سپاہیوں نے مجھے نہایت عزت و اکرام کے ساتھ مسلمانوں کے قافلے کی طرف روانہ کر دیا۔‘‘ [1]

ایک دکھی ماں کی دعا اپنے بیٹے کے حق میں قبول ہو چکی تھی۔

---

[1] دیکھیے کتاب: الدعاء المأثور و آدابہ، تالیف ... ابوبکر طرطوشی، ص: 42.

ماں کے ساتھ حسن سلوک پر بیٹی کی مغفرت

اِس واقعے کے راوی یحییٰ بن ابی کثیر ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو عامر رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور آپ ﷺ سے بیعت ہوئے تو آپ نے انؓ سے دریافت فرمایا: «مَا فَعَلَتِ امْرَأَةٌ مِنْكُمْ تُدْعٰى كَذَا وَكَذَا؟»

''تمھارے قافلے میں ایک خاتون تھی جسے فلاں نام سے پکارا جاتا تھا، اس کا کیا حال ہے؟''

انھوں نے عرض کیا: ہم نے اُس خاتون کو اُس کے خاندان والوں میں چھوڑ دیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَإِنَّهُ قَدْ غُفِرَ لَهَا»

''واقعہ یہ ہے کہ اُس کی مغفرت ہو گئی۔''

انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آخر کس وجہ سے اس کی مغفرت ہو گئی؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «بِبِرِّهَا وَالِدَتَهَا»

''ماں کے ساتھ اُس کے حسن سلوک کی بنا پر۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«كَانَتْ لَهَا أُمٌّ عَجُوزٌ كَبِيرَةٌ فَجَاءَ هُمُ النَّذِيرُ: أَنَّ الْعَدُوَّ يُرِيدُ أَنْ يُغِيرُوا عَلَيْكُمُ اللَّيْلَةَ فَجَعَلَتْ تَحْمِلُهَا عَلٰى ظَهْرِهَا، فَإِذَا أَعْيَتْ وَضَعَتْهَا، ثُمَّ أَلْزَقَتْ بَطْنَهَا بِبَطْنِ أُمِّهَا وَجَعَلَتْ رِجْلَيْهَا تَحْتَ رِجْلَيْ أُمِّهَا مِنَ الرَّمْضَاءِ حَتّٰى نَجَتْ»

"اس کی ماں بہت بوڑھی تھی، ایک ڈرانے والے منادی نے اس کی قوم میں آواز لگائی کہ دشمن تم پر آج رات حملہ کرنے والا ہے (اس لیے تم بستی چھوڑ کر نکل بھاگو)، چنانچہ وہ اپنی بوڑھی ماں کو پیٹھ پر لاد کر نکل پڑی۔ جب وہ تھک کر چور ہو جاتی تو اپنی ماں کو نیچے بٹھا دیتی۔ پھر اپنا پیٹ ماں کے پیٹ سے چپکا دیتی۔ ماں کے پیروں تلے اپنے دونوں پیر رکھ دیتی تا کہ ماں کے پاؤں شدید گرمی سے جھلنے نہ پائیں، چنانچہ وہ عورت اپنے اِس عمل کی وجہ سے نجات پا گئی۔ (اور اللہ تعالیٰ نے اُس کی مغفرت فرما دی۔)" [1]

---

[1] دیکھیے: مصنف عبدالرزاق: 133/11، حدیث: 20124، وشعب الإيمان للبيهقي: 208/6، حدیث: 7924.

باپ کی دعا سے بیٹا اونچے رُتبے پر پہنچ گیا

یہ اُس آدمی کا تذکرہ ہے جس کی روزمرہ کی زندگی عیش وعشرت سے بالکل خالی تھی۔ وہ معاشی تنگی کا شکار رہتا تھا۔ وہ دن میں جو کچھ بھی کماتا اپنے بوڑھے والد کے ہاتھ پر لاکر رکھ دیتا۔ اُس کا معمول تھا کہ دن میں کام کی تلاش میں نکل جاتا اور جو کچھ بھی آمدنی ہوتی لے کر گھر واپس آجاتا اور اپنے بوڑھے والد کے سامنے رکھی ہوئی میز پر رکھ دیتا۔ اُس کے خیال کے مطابق اگر وہ خود اپنے ہاتھ سے یہ روپیہ اپنے والد کی طرف بڑھاتا تو اسے لینے کے لیے لامحالہ والد کا ہاتھ بھی آگے بڑھتا۔ اس لیے وہ والد کے ہاتھ کا اپنی طرف بڑھنا اپنے والد کی شان میں گستاخی سمجھتا تھا۔ دراصل وہ یہ سب کچھ اپنے بوڑھے والد کے احترام واکرام میں کرتا تھا۔ وہ جب بھی والد کے سامنے اپنی آمدنی لاکر رکھتا، والد کی زبان سے یہ دعا نکلتی:

"الٰہ العالمین! میرے بیٹے کو قرآن کریم سکھلا دے اور اسے قرآن کریم کا عالم بنا دے۔"

بیٹے کی عمر کوئی بیس سال ہو چکی تھی۔ وہ رات دن محنت ومشقت کے ذریعے حصولِ رزق کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے کام سے واپس گھر آرہا تھا

کہ اتفاق سے اس کی ملاقات ایک عالم دین سے ہو گئی۔ عالم دین اسی کے شہر کا رہنے والا تھا۔ شہر کے لوگ فتویٰ کے لیے اُسی عالم کا رخ کرتے تھے کیونکہ اُسے علم فتویٰ میں کمال حاصل تھا۔ عالم دین نے نوجوان سے دریافت کیا: ''ان دنوں تم کیا کر رہے ہو؟''

نوجوان نے جواب دیا: حصولِ رزق کے لیے کوشاں ہوں۔

عالم دین نے فرمایا:

''کیا تم تعلیم و تعلم کے لیے ہفتہ میں ایک دن مجھے دے سکتے ہو؟''

نوجوان نے جواب دیا: یقیناً میں ہفتہ میں ایک دن آپ کو دے سکتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ تعلیم و تعلم سے مجھے دلی سکون ملے گا۔

نوجوان نے عالم دین کی خدمت میں ہفتہ میں ایک بار حاضر ہونا شروع کر دیا اور کسبِ فیض کرنے لگا۔ تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ وہ نوجوان ایک محنتی اور ذہین طالب علم کی شکل میں سامنے آیا۔ ایک عرصہ تک وہ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ وہ علم کے حصول کا شیدائی تھا۔ اس کا بیشتر وقت پڑھنے میں گزرتا تھا۔ قرآن کریم سے اسے خصوصی شغف تھا۔ وہ بتدریج علم حاصل کرتا چلا گیا۔ پہلے اس نے بی اے کیا اور پھر ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے والد کی دعائیں ......اس کے رب نے سن لی تھیں۔ اب اس کی آخری منزل پی ایچ ڈی تھی۔ اس نے اپنے مقالہ کا موضوع سوچنا شروع کیا۔ اسے اپنے والد کی دعا یاد آ گئی کہ اللہ اسے قرآن کا عالم بنا دے۔ پھر اس نے قرآن کریم کی تفسیر کو اپنے مقالہ کے لیے منتخب کیا۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ وہ دن بھی آ گیا جب اس نے یونیورسٹی کے حکام کو اپنا (Thesis) پیش کر دیا۔

طالب علم کے لیے وہ دن بڑا اہم ہوتا ہے جب اس کا حتمی امتحان ہوتا ہے۔ جیوری کے ارکان بیٹھتے ہیں۔ طالب علم گویا کٹہرے میں کھڑا ہے۔ اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں، بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ جیوری کے ارکان دوسرے کمرے میں جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر اپنے فیصلے کا اعلان کرتے ہیں۔

آج اس نوجوان کو بھی اس کی محنت کا صلہ ملنے والا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی مکالمے کے ہال میں پہنچ گیا۔ اس کے دوست احباب بھی موجود تھے۔ جیوری کے ارکان تشریف لائے۔ اس نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جیوری کے ارکان میں وہ شخصیت بھی شامل تھی جنھوں نے سب سے پہلے اسے علم کے حصول کی طرف توجہ دلائی تھی اور وہ اس کے اولین اساتذہ میں سے تھے۔

جیوری کے ارکان نے اپنی نشستیں سنبھالیں۔ عموماً طالب علم سے لمبی بحث ہوتی ہے۔ وہ کئی گلاس پانی پی جاتا ہے۔ مگر یہ کیا؟

اس کے استاد اٹھے۔ انھوں نے کوئی سوال جواب کیے بغیر اپنے مایہ ناز شاگرد کا ہاتھ پکڑا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں شروع دن سے اس نوجوان میں علم کا شوق دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی محنت سے قرآن کریم کی تفسیر پر اپنا مقالہ لکھا ہے۔ میں اسے بغیر نقد و نظر پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ ہم سب کو اس کی تعظیم و تکریم کرنی چاہیے۔

نوجوان نے اپنے استاد کا فیصلہ سنا تو بے اختیار رو دیا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اللہ رب العزت کے حضور شکرانے اور عجز کے آنسو تھے۔ یہ کوئی معمولی ڈگری نہ تھی۔......

کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کامیابی کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟ یہ اس کے والد گرامی کی

دعائیں تھیں جو اس نے اپنے بیٹے کے لیے کی تھیں۔

استاد نے اپنے شاگرد کی طرف دیکھا...... اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ آپ رو رہے ہیں۔ وہ بولے۔ ہم تو آپ کی عزت و تکریم کر رہے ہیں۔ کیا یہ وقت رونے کا ہے؟

نوجوان کہنے لگا: اِس وقت مجھے اپنے مرحوم والد کی دعا یاد آ رہی ہے جو وہ بارہا میرے لیے کیا کرتے تھے۔ وہ دعا یہ تھی:

"الٰہ العالمین! میرے بیٹے کو قرآن کریم سکھلا دے اور اسے قرآن کریم کا عالم بنا دے۔"

نوجوان نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے قرآن کریم کے علم کی بدولت اُسے اِس قدر عظیم مقام و مرتبہ پر فائز فرمایا۔ [1]

---

[1] یہ واقعہ کتاب: نوادر وعجائب، ص: 155 سے نوٹ کیا گیا ہے جبکہ اس کتاب کے مؤلف نے شیخ محمد شنقیطی کی کیسٹ سے اسے نقل فرمایا ہے۔ میں نے اس میں معمولی تصرف کیا ہے۔ مگر مفہوم وہی ہے۔

اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت وفضیلت کا راز

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ خَيْرَ التَّابِعِينَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ: أُوَيْسٌ، وَلَهُ وَالِدَةٌ هُوَ بِهَا بَرٌّ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰه لَأَبَرَّهُ، وَكَانَ بِهِ بَيَاضٌ، فَمُرُوهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ»

''تابعین میں سے ایک بزرگ ہیں جن کا نام اویس ہے۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ وہ قسم پوری کر دے، انھیں سفید داغ (برص) تھا، (اگر تمھاری ان سے ملاقات ہو تو) تم ان سے گزارش کرو کہ وہ تمھارے لیے دعائے مغفرت کریں۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد جب سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت کا وقت آیا تو ان کا معمول یہ ہو گیا کہ ملک یمن سے کوئی قافلہ آتا تو آپ قافلے والوں سے پوچھتے: کیا تم میں اویس بن عامر ہیں؟

مؤرخین کے مطابق 23 ہجری میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حج کے موقع پر اویس بن عامر رحمۃ اللہ علیہ کو تلاش کرایا۔ پھر جب اویس بن عامر رحمۃ اللہ علیہ حاضر ہوئے تو آپ نے اُن سے دریافت فرمایا: کیا آپ اویس بن عامر ہیں؟

اویس بن عامر: جی ہاں، مجھے اویس بن عامر کہتے ہیں۔

عمر بن خطاب: آپ کی والدہ زندہ ہیں؟

اویس بن عامر: جی ہاں۔

عمر بن خطاب نے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

«يَأْتِي عَلَيْكُمْ أُوَيْسُ بْنُ عَامِرٍ مَعَ إِمْدَادِ أَهْلِ الْيَمَنِ مِنْ مُرَادٍ ثُمَّ مِنْ قَرْنٍ، كَانَ بِهِ بَرَصٌ، فَبَرَأَ مِنْهُ إِلَّا مَوْضِعُ دِرْهَمٍ، لَهُ وَالِدَةٌ هُوَ بَرٌّ بِهَا، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ، فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَسْتَغْفِرَ لَكَ فَافْعَلْ»

''یمن کی امدادی فوج کے ساتھ تمھارے پاس اویس بن عامر نامی ایک شخص آئے گا۔ وہ قبیلہ مراد سے ہے جو قبیلہ قرن کی شاخ ہے۔ اس (کے بدن) پر برص کا نشان تھا جو صحیح ہو گیا، البتہ درہم برابر باقی ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے۔ اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اُس کی قسم پوری فرما دے، اگر تم اس سے اپنی مغفرت کی دعا کرا سکو تو (ضرور) کرانا۔''

یہ حدیث بیان کر کے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کی، چنانچہ انھوں نے دعا کی۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: حج کے بعد کہاں جانے کا ارادہ ہے؟

اویس بن عامر: کوفہ جانا چاہتا ہوں۔

عمر بن خطاب: «أَلَا أَكْتُبُ لَكَ إِلٰى عَامِلِهَا؟»

”میں آپ کے بارے میں کوفہ کے گورنر کو نہ لکھ دوں (کہ وہ آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔)“

اویس بن عامر: «أَكُونُ فِي غَبْرَاءِ النَّاسِ أَحَبُّ إِلَيَّ»

”مجھے کمزور اور گمنام لوگوں ہی میں رہنا زیادہ پسند ہے۔“ [1]

قارئین کرام! ذرا والدہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے کی فضیلت اور اس کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کریں کہ سیدنا اویس بن عامر قرنی جو صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں، رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام کو اُن سے دعائے مغفرت کرانے کا حکم دے رہے ہیں۔ فی الواقع سیدنا اویس بن عامر قرنی کو یہ مقام و مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسنِ سلوک کی بدولت ہی ملا تھا۔

[1] اس واقعے کی تفصیل صحیح مسلم، البر و الصلة، حدیث: 2542، میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بیٹے کا ایکسیڈنٹ اور ماں کی دعا

وہ ایک نوخیز جوان تھا۔ اس کی کار پوری رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اچانک اس کی کار سامنے سے آنے والے ٹرک کے نیچے آ گئی۔ اس سے پہلے کہ لوگ اس کے پاس پہنچیں پٹرول کی ٹینکی پھٹی اور اس کی کار کو آگ لگ گئی۔ اور پھر یہ چند لمحات کی بات تھی کہ آگ نے اس کی کار کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایکسیڈنٹ اتنا خوفناک تھا کہ جو دیکھتا دہشت زدہ ہو جاتا۔ تھوڑی ہی دیر میں سڑک پر بڑا ہجوم ہو گیا۔ لوگ اپنی گاڑیوں سے اتر کر دیکھنے لگے کہ کیا ہوا۔ کچھ باہمت نوجوان آگے بڑھے اور نوجوان کو کار سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ سب کے ذہن میں یہی بات آ رہی تھی کہ وہ بُری طرح جھلس چکا ہو گا۔

''اللّٰه أكبر، اللّٰه أكبر، لا إله إلا اللّٰه'' سب کی زبان پر تکبیر و تہلیل کی آواز تھی۔ سب خوشی سے اللّٰه أكبر اور لا إله إلا اللّٰه کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنا زبردست ایکسیڈنٹ اور پھر بھی نوجوان بالکل صحیح سلامت! یہ منظر دیکھ کر تمام لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

حاضرین میں سے ایک شخص نوجوان کے قریب آیا اور پوچھنے لگا:

''کیا تو نے کوئی ایسا عمل کیا ہے جس کے بارے میں تجھے یقین ہو کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے تجھے اس بھڑکتی ہوئی آگ میں بھی محفوظ رکھا؟''

نوجوان نے جواب دیا: میں جدہ (سعودی عرب کا ایک مشہور شہر) میں کام کرتا ہوں۔ آج جب مجھے تنخواہ ملی تو میں جدہ سے سیدھا اپنی والدہ کے پاس رابغ پہنچا۔ میری والدہ رابغ میں مقیم ہے۔ میں نے اپنی تنخواہ اپنی والدہ کی جھولی میں ڈال دی۔ میری والدہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ بے حد خوش تھی کہ اس کا بیٹا کتنا فرماں بردار اور ماں سے کتنی زیادہ محبت کرنے والا ہے۔ اور پھر میری والدہ نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ میرے لیے ڈھیروں دعائیں کر رہی تھی۔ والدہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

میرے رب! میرے بچے کو میرے لخت جگر کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔

بس میرے رب نے میری والدہ کی دعا کو میرے حق میں قبول فرما لیا۔ میں نے اپنی والدہ کو راضی کیا اور آسمانوں والے نے مجھے ایک بڑی مصیبت بلکہ یقینی موت سے نجات عطا فرمائی۔ [1]

---

[1] دیکھیے کتاب: ساعة وساعة، ص. 156.

ماں کی اطاعت کا شاندار صلہ

یہ واقعہ بنی اسرائیل کا ہے۔ان میں ایک شخص انتہائی مالدار تھا۔ اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ ایک غریب بھتیجے کے علاوہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ مالدار آدمی کی وفات کا وقت آن پہنچا تھا۔مگر اس کے بھتیجے کو لالچ آ گیا۔اس نے مالدار چچا کو وقت سے پہلے ہی جان سے مار ڈالا، تا کہ اس کی تمام دولت حاصل کر لے۔قتل کرنے کے بعد اس نے چالاکی یہ کی کہ لاش ایک دوسری بستی میں لے جا کر کسی کے صحن میں پھینک دیا، تا کہ اُس پر کسی کو شک نہ ہو سکے۔

صبح ہوتے ہی وہ ڈرامائی انداز میں شور مچانے لگا اور 'خون کا بدلہ چاہیے، خون کا بدلہ چاہیے، کی دہائی دینے لگا۔ اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ کر چند بے گناہ افراد پر قتل کا مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اُن لوگوں سے باز پرس کی تو انھوں نے اپنی براءت کا اظہار کیا۔ اور ٹھوس دلیلوں سے ثابت کر دیا کہ ہم قتل کے اِس معاملے سے بالکل بے خبر ہیں۔ ہمارے اوپر قتل کا الزام سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔ہم مکمل طور پر بے گناہ ہیں۔

مقدمہ کی سماعت کے بعد سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے لیے فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا۔ حاضرین

نے تجویز پیش کی کہ آیئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ قاتل کا پردہ فاش کر دے۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہ تجویز پسند آئی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ﴾

''اللہ تعالیٰ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دے رہا ہے۔'' [1]

بنی اسرائیل کہنے لگے: موسیٰ! آپ ہمارے مقدمے کی سماعت کے بعد اسے حل کرنے کی بجائے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟ ہم نے تو آپ سے مقتول کے قاتل کا پتہ لگانے کے بارے میں درخواست کی ہے اور آپ ہیں کہ ہمیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم صادر کر رہے ہیں، بھلا قاتل اور مقتول کے قضیے میں گائے ذبح کرنے کا سوال کہاں سے آ گیا؟

بنی اسرائیل بڑی عجیب و غریب قوم تھی۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ ماننا اور اس پر مختلف انداز میں طرح طرح کے اعتراضات لگانا ان کا عام وطیرہ تھا۔ انھوں نے اس حکم پر بھی اپنی پرانی عادت کے مطابق عمل کیا۔ وہ حکمت الٰہی سے بے خبر تھے۔ انھیں اس بات کا شعور نہ تھا کہ انھیں یہ حکم دینے والا کوئی معمولی انسان نہیں بلکہ نبی نے انھیں یہ حکمِ الٰہی سنایا تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا:

﴿أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝﴾

''میں ایسا جاہل بننے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں۔'' [2]

مطلب یہ ہے کہ میں ایک نبی ہوں، میری شان کے خلاف ہے کہ میں اپنے مومن

---

[1] البقرۃ 67:2. [2] البقرۃ 67:2.

بھائیوں کا مذاق اڑاؤں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم میرے پاس ایک مقتول کا مقدمہ لے کر آئے ہو اور میں اس مقدمہ کو حل کرنے کے بجائے تمھیں اپنے مذاق کا نشانہ بناؤں؟

بنی اسرائیل کو جب یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو حکم فرما رہے ہیں یہ اُن کی طرف سے نہیں بلکہ منجانب اللہ ہے تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ چلیں ہم گائے تو ذبح کرتے ہیں مگر ذرا ہمیں یہ بھی بتلا دیں کہ وہ گائے کیسی ہونی چاہیے اور کن کن کمالات کی حامل ہونی چاہیے؟

بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے گائے کی نوعیت دریافت کر کے خواہ مخواہ اپنے مقدمہ کو پیچیدہ بنا دیا۔ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق فوراً کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو مقصد پورا ہو جاتا۔ لیکن انھوں نے گائے کی نوعیت کے بارے میں پے در پے سوال کر کے خود ہی مقدمے کو اُلجھا دیا، چنانچہ اُن کا بے جا سوال اللہ تعالیٰ کو بھی پسند نہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کے مقدمہ کو پیچیدہ بنا کر انھیں مشکلات میں ڈال دیا۔

یہ جو کچھ ہوا، اِس کے پسِ پردہ بھی دراصل ایک حکمت کارفرما تھی۔ اس بارے میں مختلف مفسرین نے جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

بنی اسرائیل ہی میں ایک آدمی تھا۔ اس کا ایک ہی بچہ تھا۔ جب اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو وہ اپنے بچھڑے کو لے کر جنگل کی طرف گیا۔ یہ بچھڑا اس کی محنت کی کمائی اور اس کی زندگی بھر کا سرمایہ تھا۔ جنگل میں پہنچ کر اس نے بچھڑے کو چھوڑ دیا اور کہا:

”الٰہی! میں نے تیرے بھروسے پر گائے کے بچھڑے کو جنگل کے حوالے کیا ہے، یہاں تک کہ میرا بچہ بڑا ہو جائے (اور اِس گائے کا مالک بن جائے)۔“

گائے جنگل میں گھومنے پھرنے لگی۔ وہ نوخیز تھی۔ کسی بھی انسان کو دیکھتے ہی

بھاگ کھڑی ہوتی۔ کچھ دنوں بعد اس آدمی کا انتقال ہو گیا۔ وہ پسماندگان میں بیوی اور ایک چھوٹا سا بچہ چھوڑ گیا۔ باپ کے انتقال کے بعد بیٹے کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری ماں پر عائد ہوئی۔ ماں نے اپنی حیثیت کے مطابق پرورش و پرداخت کے تقاضے پورے کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بچہ بھی نشوونما پاتا گیا۔ ایک دن آیا کہ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ وہ ماں کا انتہائی وفادار، فرماں بردار اور خدمت گزار تھا۔

اِس نوجوان نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک تہائی رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتا، ایک تہائی نیند سوتا اور ایک تہائی وقت اپنی ماں کی خدمت میں بسر کرتا۔ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی جنگل کی طرف روانہ ہو جاتا، جنگل میں لکڑیاں چنتا، انھیں پیٹھ پر لاد کر بازار لے جا کر فروخت کرتا۔ جو بھی آمدنی ہوتی اس میں سے ایک تہائی مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتا، ایک تہائی کھانے پینے میں خرچ کرتا اور ایک تہائی لا کر اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔

ماں نے ایک روز بیٹے سے کہا: تمھارے والد نے ورثہ میں ایک گائے چھوڑی ہے۔ وہ گائے فلاں جنگل میں ہے۔ مرنے سے پہلے تمھارے والد نے اُسے اللہ کے بھروسے پر جنگل میں لے جا کر چھوڑ دیا تھا، تاکہ جب تم بڑے ہو جاؤ تو اس کے مالک بن جاؤ۔ تم اُس جنگل میں جاؤ اور سیدنا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے رَب سے دعا کرو کہ وہ گائے تمھیں واپس کر دے۔ اور ہاں، اس کی نشانی یہ ہے کہ جب تمھاری نگاہ اُس پر پڑے گی تو تمھیں یوں محسوس ہوگا جیسے اس کی کھال سے سنہری شعاعیں نکل رہی ہیں۔

نوجوان نے ماں کے حکم کی تعمیل کی اور اُس جنگل کی طرف چل پڑا جس کی ماں

نے نشاندہی کی تھی۔ تلاشِ بسیار کے بعد اُسے گائے نظر آ گئی۔ اس نے آواز دی:

’’میں سیدنا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے رب کا واسطہ دے کر تجھے اپنے پاس بلاتا ہوں۔‘‘

یہ آواز سنتے ہی گائے نوجوان کی طرف دوڑ پڑی اور چند لمحے بعد وہ نوجوان کے سامنے کھڑی تھی۔ نوجوان نے اس کی گردن میں رسی ڈالی اور جنگل سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے گائے کی زبان کھول دی اور وہ نوجوان سے مخاطب ہو کر بولی:

’’ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے نوجوان! میرے اوپر سوار ہو جاؤ۔ اس طرح تمھیں آسانی ہو جائے گی۔‘‘

نوجوان گویا ہوا:

’’میری ماں نے مجھے تمھاری پیٹھ پر سواری کرنے کا حکم نہیں دیا، اس نے اتنا ہی کہا ہے کہ گائے کو گردن سے پکڑ کر لانا۔‘‘

گائے بولی:

’’بنی اسرائیل کے رب کی قسم! اگر تم میرے اوپر سوار ہو جاتے تو مجھ پر ہرگز قابض نہیں ہو سکتے تھے۔ چلو، اب اگر تم پہاڑ کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا حکم دو گے تو وہ بھی اپنی جڑ سے اکھڑ کر تمھارے ساتھ چلنے لگے گا۔ یہ اپنی ماں کے ساتھ تمھارے حسنِ سلوک کا صِلہ ہے۔‘‘

نوجوان گائے کو لے کر ماں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ماں نے بیٹے سے کہا: یہ تم بھی جانتے ہو کہ تمھارے پاس اِس گائے کے سوا کوئی مال نہیں ہے، دن بھر مشقت

کر کے لکڑیاں چنتے ہو اور رات کو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہو، جاؤ اور اِس گائے کو بیچ آؤ، تاکہ تمھاری مالی حالت کچھ مستحکم ہو جائے۔

بیٹے نے پوچھا: امی جان! میں گائے کی کیا قیمت لوں؟

ماں: تین دینار قیمت بتانا اور ہاں میرے مشورہ کے بغیر مت بیچنا۔

نوجوان گائے کو لے کر بازار پہنچ گیا۔ وہ گاہک کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک فرشتہ انسانی شکل میں نمودار ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو نوجوان کا امتحان لینے بھیجا تھا کہ دیکھیں وہ ماں کی فرماں برداری میں پورا اترتا ہے یا اپنے نفس کی بات پر جھک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم تھا مگر وہ بندے کو آزمائش میں ڈال کر کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرتا ہے۔ بندے کا امتحان لیتا ہے۔

فرشتے نے پوچھا: یہ گائے کتنی قیمت میں فروخت کرو گے؟

نوجوان: تین دینار میں، بشرطیکہ اپنی ماں سے پوچھ لوں۔

فرشتہ: میں چھ دینار دے رہا ہوں، ماں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ دینار لو اور گائے مجھے دے دو۔

نوجوان: ''اگر تم مجھے اِس گائے کے برابر سونا بھی دو گے تب بھی میں اپنی ماں سے مشورہ کیے بغیر تمھیں نہیں دوں گا۔''

فرشتہ: تو پھر جاؤ اور اپنی ماں سے مشورہ کرنے کے بعد آجاؤ۔

نوجوان بازار سے گھر کو روانہ ہوا۔ اس نے اپنی ماں کو وہ ساری باتیں کہہ سنائیں جو بازار میں سامنے آئی تھیں۔ گائے کی قیمت کے بارے میں بھی بتلایا۔ ماں نے کہا: جاؤ گائے کی قیمت چھ دینار بتانا، مگر بیچنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لینا۔

نوجوان گائے لے کر بازار پہنچا تو وہی فرشتہ آدمی کی شکل میں دوبارہ اُس کے پاس آیا اور کہا: اپنی ماں سے مشورہ لے کر آ گئے؟ کیا کہا ہے تمھاری ماں نے؟

نوجوان: ہاں، میں نے اپنی ماں سے مشورہ لیا ہے اس نے چھ دینار میں فروخت کرنے کی ہامی تو بھر لی ہے، البتہ فروخت کرنے سے پہلے اس نے مشورہ لینے کو کہا ہے۔

فرشتہ: میں تمھیں بارہ دینار دینے کو تیار ہوں مگر مجھے گائے ابھی چاہیے۔ پیسہ لو اور گائے دے دو۔ ماں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

نوجوان: نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، میں اپنی ماں سے پوچھے بغیر کسی قیمت پر گائے فروخت نہیں کرسکتا۔

نوجوان بازار سے واپس آ گیا اور اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہو کر بازار میں ہونے والی ساری باتیں کہہ سنائیں۔ ماں نے بیٹے کی باتیں سن کر فرمایا:

"در اصل تمھارے پاس آنے والا شخص انسانی صورت میں فرشتہ ہے۔ وہ تمھیں آزمانا چاہتا ہے۔ اب اگر وہ آئے تو اس سے پوچھنا کہ ہم اس گائے کو بیچیں یا نہیں؟"

نوجوان نے ماں کے حکم کی تعمیل کی۔ جب فرشتہ بازار میں اُس کے پاس گاہک بن کر آیا تو اُس نے ماں کا بتلایا ہوا سوال پوچھا۔ فرشتے نے کہا: اپنی ماں کے پاس جاؤ اور اس کو بتاؤ کہ وہ گائے کو ابھی اپنے پاس ہی رکھے۔ کیونکہ موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقتول کا مقدمہ دائر ہوگا۔ وہ لوگ اُسے بھاری قیمت میں خریدیں گے۔ فرشتے کی تجویز کے مطابق وہ گائے فروخت نہیں کی گئی۔ اللہ تعالیٰ، بنی اسرائیل کے ذریعے اس گائے کو بھاری قیمت میں فروخت کرا کے مطیع وفرماں بردار بیٹے کو اچھا

بدلہ دینا چاہتا تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بنی اسرائیل نے اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام سے گائے کی نوعیت کے بارے میں سوال کر کے اپنے اوپر خواہ مخواہ کا بوجھ ڈال لیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جس نوعیت کی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا وہ پوری دنیا میں صرف ایک ہی آدمی کے پاس تھی۔ وہ آدمی یہی نوجوان تھا جس نے زندگی میں کبھی اپنی والدہ کی حکم عدولی نہیں کی تھی بلکہ اس کا تمام تر وقت ماں کی فرماں برداری ہی میں گزرتا تھا۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب گائے کی نوعیت کے بارے میں بنی اسرائیل کو بتلایا تو انھوں نے کافی تگ ودو کی اور تلاشِ بسیار کے بعد نوجوان کے پاس مطلوبہ گائے کو پالیا۔ قیمت یہ مقرر ہوئی کہ گائے کے وزن کے برابر دینار گائے کے مالک کو دیے جائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب گائے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں لائی گئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق گائے کا گوشت کاٹ کر اسے مقتول کے جسم پر مارنے کا حکم دیا۔

گوشت کو مقتول کے جسم پر مارنا تھا کہ وہ اللہ کے اِذن سے زندہ ہو گیا۔ اس کے جسم سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے بتلایا کہ مجھے میرے بھتیجے نے قتل کیا ہے۔ پھر وہ اسی جگہ گر کر مر گیا۔ چنانچہ قاتل کو اس کی وراثت سے محروم کر دیا گیا۔ [1]

---

[1] اس قصے کی تفصیل سورۂ بقرہ 2:67-69 کی تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ قصہ جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے جمہور مفسرین نے اس کی تفصیل لکھی ہے۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی

وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ اس کے سوا گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ ہاں، ایک نوکرانی تھی جو گھر کے کام کاج کے علاوہ اس کی بوڑھی ماں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ بُری طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے معاملات اور رہن سہن سے اس کی سخت دلی کا پتہ چلتا تھا۔ وہ اپنے دل میں دوسروں کے لیے تو کُجا، اپنی ماں کے حق میں بھی نرم گوشہ نہیں رکھتا تھا۔ جبکہ اس کی ماں فالج کے شدید حملہ کے علاوہ بینائی سے بھی محروم ہو چکی تھی اور اپنے نوجوان بیٹے کی محبت اور دیکھ بھال کی محتاج تھی۔ ماں کی خدمت کا کیا ذکر، اس نے تو اپنی بوڑھی ماں کی طرف کبھی پیار بھری نظر سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

وہ اپنی ماں کی خدمت نہیں کرتا تھا۔ ماں کے سارے معاملات کی نگرانی اور دیکھ بھال نوکرانی ہی پر چھوڑ دی تھی۔ اُس کی بدقسمتی کی انتہا تھی کہ وہ اپنی عمر رسیدہ ماں کی خدمت اور اطاعت کے بجائے اس کے ساتھ تلخ کلامی سے پیش آتا تھا اپنی کڑوی کسیلی باتوں سے اس کو تکلیف دیتا اور اس کے جذبات کو بڑی ٹھیس پہنچاتا تھا

اُس نالائق اور نافرمان بیٹے کی جرأت دیکھیے کہ وہ اپنی ماں کی پنشن (Pension) کی رقم وصول کرنے کے لیے اسے وہیل چیئر (Wheel Chair) پر بینک میں لے

جاتا۔ اس دوران اپنی اُسی ماں کے ساتھ بدتمیزی کرتا جس کی پنشن کی رقم سے وہ اپنی جیب گرم کیا کرتا تھا۔ ماں عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے محروم اور فالج کے حملے سے اپاہج ہو چکی تھی۔ وہ عمر کے آخری حصے میں اپنے نافرمان بیٹے کی اذیت ناک باتیں سنتی مگر کر بھی کیا سکتی تھی۔ بہت مجبور تھی۔ وہ نالائق بیٹا ماں سے یہاں تک کہہ دیتا:

''تو اندھی، فالج زدہ اور لقوہ کی ماری ہوئی ہے، تیری وجہ سے میں ابتلا وآزمائش میں پڑ گیا ہوں۔''

جب عمر کے آخری دنوں میں بوڑھی ماں اپنی ہی اولاد سے ایسی کڑوی کسیلی باتیں سنے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ قارئین کرام اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ بیٹے کی باتیں سن کر بڑے صبر وتحمل اور ضبط سے کام لیتی مگر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس کے دل سے آہ نکل جاتی اور وہ زار وقطار رونے لگتی۔

ماں کے آنسو دیکھ کر بجائے اس کے کہ بیٹے کا دل پسیج جائے، الٹا اس کی زبان سے نازیبا الفاظ نکلنے لگتے۔ ایک دفعہ تو اس نے ماں کے آنسو دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا:

''اللہ کی قسم! اگر تیری پنشن میری روزی سے مربوط نہ ہوتی تو میں تجھے بوڑھوں کے گھر چھوڑ آتا۔

نالائق بیٹا یہ جملہ کہتے ہوئے ناک بھوں چڑھاتا، چیں بہ جبیں ہوتا۔ مگر اس کی بوڑھی ماں کی جو کیفیت ہوتی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ بیٹے کے جارحانہ کلمات سے اس کا کلیجہ منہ کو آتا۔ شدتِ تکلیف اور غم سے اس کا دل پھٹ رہا ہوتا۔

بینک سے گھر واپس آتے ہی نالائق بیٹا اپنی ماں کی پنشن کا پیسہ جیب میں ڈالتا

اور ماں کو نوکرانی کے حوالے کر کے باہر نکل جاتا۔ دوستوں کے ساتھ شب بسری کرتا، ان کے ساتھ لہو ولعب میں وقت برباد کرتا اور کبھی کہیں سفر پر نکل جاتا۔ اِس دوران وہ اپنی ماں کی فکر کرتا، نہ اس کے حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا۔ بلکہ اُس کی سنگ دلی دیکھیے کہ وہ اپنے دوست احباب کو بھی ماں کی خیرت دریافت کرنے سے منع کر دیتا۔ ماں کے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو ماں سے ملاقات کرنے سے سختی سے روک دیتا۔

بے چاری ماں، اپنے اِس نالائق بیٹے کی انتہائی تکلیف دِہ باتیں برداشت کرتی۔ لیکن پھر بھی زبان پر حرفِ شکایت نہ لاتی۔ وہ بے چاری کر بھی کیا سکتی تھی۔

کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ ماں کا یہ نافرمان بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ ایک پڑوسی ملک کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس کا یہ سفر جہاز سے نہیں بلکہ کار کے ذریعے تھا۔ پڑوسی ملک پہنچ کر اُس نے دوستوں کے ساتھ خوب گل چھرے اڑائے، لہو ولعب میں وقت گزارا، اس دوران ماں کی خیریت دریافت کرنے کی کوشش کی، نہ اس کے دل میں اس سلسلے میں کوئی خیال پیدا ہوا۔

پڑوسی ملک میں سیر سپاٹے کے بعد وہ دوستوں کی ٹولی کے ساتھ اپنے وطن واپس آ رہا تھا۔ اس کی گاڑی ہوا سے باتیں کرتے ہوئے سفر کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ گاڑی کے اندر گپ شپ میں مشغول تھا کہ اچانک اس کی گاڑی اُلٹ گئی اور سب کے سب گاڑی کے نیچے دب گئے۔ مگر اِتنے بڑے حادثہ کے باوجود سارے نوجوان محفوظ رہے۔ انھیں تھوڑی بہت خراش آئی تھی، البتہ اُن میں سے اگر کسی کو شدید چوٹیں آئی تھیں تو وہ آنکھ سے محروم اور فالج کے حملے کی شکار ماں کا وہ

نافرمان بیٹا تھا جس نے ماں کی طرف کبھی محبت کی نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی، جس کی پنشن کی رقم بینک سے نکلوا کر وہ پڑوسی ملک میں رنگ رلیاں منانے گیا تھا۔

اِس شدید حادثے کے بعد نافرمان بیٹے کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ تقریباً ایک ماہ تک پابندِ بستر رہا۔ ڈاکٹروں نے حتی المقدور اس کے پاؤں بچانے کی کوشش کی مگر آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ ایک ماہ بعد اسے ڈاکٹروں نے ہسپتال سے جانے کی اجازت دے دی۔ مگر اَب وہ پہلے کی طرح ہٹا کٹا نوجوان نہیں تھا نہ اپنے پاؤں پر چل کر ہسپتال سے نکلا تھا، بلکہ وہ اسی طرح کی کرسی پر نکلا جس طرح کی کرسی پر وہ اپنی ماں کو بٹھا کر پنشن کی رقم لینے بینک جایا کرتا تھا۔

پھر ایک وہ دن بھی آیا جب اپنی والدہ کا یہ نافرمان بیٹا بینک کے پھیرے لگا رہا تھا۔ مگر وہ اپنی ماں کی پنشن ہتھیانے نہیں بلکہ حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔

[1] دیکھیے کویت سے نکلنے والا جریدہ: الأنباء، نیز دیکھیے کتاب: قصص ومآس من عقوق الوالدین، ص: 87,88.

امریکی نرس کی کایا پلٹ گئی

وہ امریکہ کی رہنے والی ایک غیر شادی شدہ نرس تھی۔ اُس نے کبھی اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں نہ تو جاننے کی کوشش کی تھی، نہ کسی نے اُسے اسلامی تعلیمات کی آفاقیت کے بارے میں کچھ بتلایا تھا۔ وہ آزاد خیال دوشیزہ تھی۔ ایک ہسپتال میں نرس کی خدمات انجام دیتی اور ڈیوٹی کے بعد ٹیلی ویژن دیکھنے میں اپنا وقت گزارتی۔ ایک روز وہ ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھنے میں مشغول تھی کہ اس کے ریموٹ کا بٹن ایک ایسے چینل پر دب گیا جس میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے پروگرام ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کوئی چینل دیکھا تھا۔ اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑے وقت کے لیے سہی، اسلامی تعلیمات پر مبنی پروگرام کا بغور مشاہدہ کیا۔ مگر اُس پروگرام میں کوئی بات اسے ایسی نہیں لگی جو متاثر کن ہو۔ چنانچہ اُس نے اِس پروگرام کو ایک غیر ضروری پروگرام قرار دیا، بلکہ اسے یہ پروگرام مضحکہ خیز لگا اور یکا یک اس کی ہنسی نکل گئی۔

اس کا بیان ہے کہ میں نے پہلی بار اسلام کے بارے میں جو کچھ سنا وہ اسی چینل سے سنا۔ چینل میں جو معلومات پیش کی جا رہی تھیں وہ میرے لیے مضحکہ خیز تھیں۔ میں

ایک ہسپتال میں نرس کا کام کرتی تھی۔ دوسری مرتبہ مجھے اسلام کے بارے میں اسی ہسپتال میں سننے کا موقع ملا جس میں میری ڈیوٹی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلم جوڑا ہسپتال میں داخل ہوا۔ ان کے ساتھ ایک سن رسیدہ بیمار خاتون بھی تھی۔ خاتون کو انھوں نے داخل کرا دیا۔ اتفاق سے یہ مریضہ میری ہی نگرانی میں تھی۔ دونوں میاں بیوی مریضہ کی حالت سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

شوہر نے بیوی کو مریضہ کے پاس ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ بیمار خاتون، شوہر کی ماں اور بیوی کی ساس تھی۔ میں نے اپنی نگرانی کے دوران دیکھا کہ بیوی بار بار مریضہ کی کیفیت پر افسوس کا اظہار کرتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رُکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ مجھے اُس کا رونا اور بوڑھی مریضہ پر اِس قدر آنسو بہانا فضول محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس بارے میں اُس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتی تھی، مگر پوچھ ہی بیٹھی۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اِس بوڑھی مریضہ پر اِس قدر آنسو بہا رہی ہو؟ یہ تو عمر رسیدہ ہے اور عمر رسیدہ لوگ بیمار پڑ ہی جاتے ہیں؟ پھر اس قدر آنسو بہانے کی وجہ کیا ہے؟

عورت نے جواب دیا: میں اپنے شوہر کے ساتھ ساس کے علاج کے لیے بیرونِ ملک سے یہاں آئی ہوں۔ میرا شوہر اندرونِ ملک علاج کراتا رہا، جب وہاں مناسب علاج نہیں ہو سکا تو ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق ہم مریضہ کو لے کر علاج معالجہ کے لیے یہاں آ گئے، تاکہ یہاں مناسب علاج ہو سکے۔

دورانِ گفتگو وہ عورت اپنی ساس کی شفایابی اور صحت یابی کے لیے بار بار دعائیں کرتی تھی اور اس کے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹتی نہیں تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔

میں چند لمحے کے لیے کسی سوچ میں کھوگئی۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی:

''اِس عورت کو دیکھو جو اپنے شوہر کے ساتھ اس کی ماں کے علاج کے لیے بیرونِ ملک آئی ہے اور ساس کی کس قدر خدمت گزار ہے۔ میں نے تو کبھی اپنی ماں کی خدمت کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ چار ماہ ہو گئے ہیں، میں نے اپنی ماں سے ملاقات تو کجا، اس کی خیریت معلوم کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ بلکہ آج بھی میرے دل میں اپنی ماں سے ملاقات کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اپنی سگی ماں کے ساتھ میرا یہ رویہ ہے، بھلا شوہر کی ماں ہوتی تو میں کہاں تک اس کی خدمت کرسکتی تھی؟''

اُن دونوں میاں بیوی کا ماں اور ساس کے ساتھ حسنِ سلوک دیکھ کر میں حیرت زدہ تھی۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ ماں کی حالت ناگفتہ بہ حد تک تشویش ناک تھی۔ مجھے اِس بات سے بھی بڑا تعجب ہوا کہ بھلا یہ مریض خاتون جس نے زندگی کے دن پورے کر لیے ہیں اور اب اس کے مرنے کا وقت قریب پہنچا ہے، تو بھلا ایسی صورت میں کون سا ایسا جذبہ ہے جس نے اِس جوڑے کو مجبور کیا کہ بیرونِ ملک علاج کے لیے جائیں جبکہ یہ علاج بھی خاصا مہنگا ہے۔

میں ساس کے بارے میں بہو کی کیفیت اور ماں کے بارے میں بیٹے کی بے چینی دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ میرے دل ودماغ میں اب اس حوالے ہی سے سوالات اٹھتے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے سلوک اور امریکیوں کے اپنی ماؤں کے بارے میں جو ناروا سلوک دیکھتی تھی، اس پر میں بار بار غور کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بوڑھی مریضہ کی اِس قدر خدمت ہوتے دیکھ کر مجھے رشک آنے لگا کہ اے کاش! اس بوڑھی خاتون کی

جگہ میں خود مریضہ ہوتی۔ اے کاش! میرے بارے میں بھی میرے عزیز و اقارب اِس قدر فکر مند ہوتے؟

مجھے اِس بات سے بھی سخت تعجب ہو رہا تھا کہ جب سے میاں بیوی نے اپنے مریض کو ہسپتال میں داخل کیا تھا، اسی دن سے انھیں اپنے ملک سے بار بار ٹیلی فون آرہے تھے۔ کوئی اُن سے مریض کی حالت پوچھتا، کوئی ان کے حالات دریافت کرتا، کوئی اپنی ہمدردی جتاتا، کوئی اپنی خدمات پیش کرنے کی یقین دہانی کراتا۔

ایک روز میں ویٹنگ ہال میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ وہ خاتون تنہا بیٹھی ہے۔ اس کا شوہر ساتھ نہیں تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے اپنے ذہن میں ابھرتے ہوئے سوالات کے بارے میں پوچھنا چاہا۔ اُس نے میری باتیں سننے کے بعد اسلام کے حوالے سے بہت ساری مفید باتیں بتلائیں اور اسلامی تعلیمات میں والدین کے حقوق و احترام کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

میں نے حقوقِ والدین کے بارے میں اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سنیں تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ آج تک مذہب اسلام کی تسکین بخش روحانیت بھری تعلیمات سے کوسوں دور تھی۔ والدین کے حقوق سے متعلق کس قدر صاف ستھری اور دل کو لگنے والی اسلامی تعلیمات ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے اندر اسلام کی محبت کا جذبہ بیدار ہوا اور اسلام کے حوالے سے معلومات حاصل کرنے کی طلب پیدا ہوئی۔

اُن دونوں میاں بیوی نے مریضہ کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بیٹا اور بہو دونوں رات بھر اس کی خدمت میں لگے رہتے۔ جب کبھی مریضہ کی حالت بہتر

لگتی تو ان کے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے۔ جب صحت ناسازگار ہوتی تو اُن پر افسردگی چھا جاتی۔ ایک دن اچانک مریضہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔ جب اس کے بیٹے اور بہو کو وفات کی اطلاع دی گئی تو اُنھوں نے رونا شروع کر دیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگی۔ وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئے، جیسے بچے بلک بلک کر روتے ہیں۔

اس واقعے کے بعد میرا اپنا حال یہ ہوگیا کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں میرا نظریہ یکسر بدل گیا۔ میں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔ جب سے میں نے اس خاتون سے حقوقِ والدین کے سلسلے میں سنا تھا اور خود بھی میاں بیوی کا مریضہ کے ساتھ پُرسوز طرزِ عمل دیکھا تھا، میں اسلام کے بہت قریب آ گئی تھی۔ میں نے اپنے نمایندے کو ایک اسلامی مرکز میں بھیج کر حقوقِ والدین کے موضوع پر کتابیں منگوائیں اور مطالعہ شروع کر دیا۔ جوں جوں میرا مطالعہ وسیع ہوتا گیا میں اسلام کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ والدین کے حقوق کے حوالے سے جب میں کتابوں کے مطالعہ میں محو ہوتی تو میں خود کو ایک بوڑھی ماں خیال کرتی اور تصوراتی دنیا میں چلی جاتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں ایک عمر رسیدہ ماں ہوں اور میرے اردگرد میرے بچے ہیں جو میری بے انتہا خدمت کر رہے ہیں اور مجھ سے اپنی ہمدردی اور محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔

اسلام میں ماں باپ کے حقوق کی تعلیمات پڑھ کر ہی مجھے اسلام سے شدید محبت ہوگئی، چنانچہ میں نے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ میں نے اسلام کی جملہ روح پرور تعلیمات اور اس کے پاکیزہ اسباق پڑھے بغیر صرف والدین کے حقوق ہی کے حوالے

سے معلومات حاصل کر کے قبولیت اسلام کا اعلان کر دیا۔ حقوق والدین کے علاوہ میں نے اسلام کی دوسری تعلیمات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔

الحمد لِلّٰہ آج میں ایک مسلمان خاتون ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم سے میں نے ایک انتہائی شریف النفس صالح مسلمان سے شادی بھی کر لی ہے۔ اس سے میری اولاد بھی ہوئی ہے۔ میں برابر اُن کی ہدایت وتوفیق کی دعائیں کرتی رہتی ہوں۔ آج میں ''ام عبد الملک'' ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ جہاں بھی ہوں مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ میری اور میری اولاد کی ثابت قدمی کے لیے دعا کرنا نہ بھولیں۔ [1]

[1] یہ واقعہ مختلف جرائد میں شائع ہوا ہے۔ مگر میں نے یہ معلومات انٹرنیٹ سے لی ہیں۔ دیکھیے:
www.gesah.net

ماں کو مارنے والے بدبخت بیٹے پر فالج گر گیا

وہ بڑا ہی بدبخت تھا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث بے حد لاڈلا بھی تھا۔ شروع دن سے وہ بڑا خودسر تھا۔ اس نے کبھی اپنے والدین کو اہمیت نہیں دی۔ ان کے خلاف بدزبانی کرتا۔ ان کے بارے میں اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی۔ بسااوقات والدین کو گالی بھی دے دیتا تھا۔ اُسے اِس بات کا کوئی خیال نہیں تھا کہ شریعتِ اسلامیہ نے والدین کی خدمت پر کتنا بڑا اجر اور ثواب رکھا ہے۔ وہ کبھی سوچتا بھی نہیں تھا کہ والدین کی اطاعت وفرماں برداری اور ان کی عزت واحترام سے دنیا وآخرت میں کس قدر بلند درجات ملتے ہیں۔ والدین کی اطاعت وفرماں برداری کے حوالے سے دین اسلام نے جو عظیم تعلیم دی ہے کہ ماں باپ کو تکلیف دینا تو درکنار، انھیں ''اُف'' کہنا بھی جرم ہے۔ اس حکم کے وہ بالکل برعکس تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ پروان چڑھتا گیا مگر اس کے دل ودماغ میں والدین کی محبت کا جذبہ بیدار نہ ہو سکا۔ وہ کہاوت ''کریلا اور نیم چڑھا'' کا مصداق بنتا گیا کہ ایک تو والدین کی خدمت نہ کرتا، دوسرے والدین پہ زبان درازی کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ انھیں اپنے جارحانہ الفاظ سے تکلیف دیتا۔ باپ نے اپنی

زندگی میں بیٹے کی زبان سے اپنے بارے میں کبھی کلمۂ خیر نہیں سنا، یہاں تک کہ اس کی موت آ گئی اور وہ اپنے رب سے جا ملا۔

اب گھر میں اکلوتے بیٹے کے ساتھ صرف ماں رہتی تھی۔ باپ کی وفات کے بعد بھی بیٹے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اپنی ماں سے حسنِ سلوک کی بجائے انتہائی بدتمیزی سے پیش آتا۔ بلکہ باپ کا سایہ اٹھنے کے بعد تو ماں کے ساتھ اس کا رویہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ مگر ماں بہر حال ماں ہوتی ہے، اس کے اندر اولاد کے لیے بے تحاشا محبت ہوتی ہے۔ اولاد لاکھ سرکشی کرے مگر وہ صبر وضبط سے کام لیتی ہے اور ہمیشہ اولاد کے حق میں بھلائی چاہتی ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد اُسے اپنے نوجوان بیٹے سے بہت تکالیف پہنچیں مگر اِس کے باوجود وہ اپنے بیٹے سے شدید محبت کرتی۔ ہمیشہ اسے نصیحت کرتی۔ بُرے ساتھیوں کے ساتھ میل جول رکھنے، گھومنے پھرنے اور اُن کی صحبت اختیار کرنے سے منع کرتی۔ ماں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بُرے ساتھیوں کی صحبت کے سبب اس کا بیٹا سرکش اور نافرمان ہو چکا ہے۔ اس کی دین اسلام سے بیزاری، اخلاقِ حمیدہ سے دُوری اور پڑھائی لکھائی سے نفرت دراصل بُری صحبت ہی کا نتیجہ تھی۔

ماں کے لاکھ سمجھانے بجھانے اور نصیحت کرنے کے باوجود اس کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس وہ اپنی ماں کی نصیحت کو اپنے حق میں بُرا سمجھتا، بلکہ ماں کو گالیاں بکتا تھا۔ ماں نے جب دیکھا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے تو اس کے صبر کا جام چھلک گیا۔ اس نے بیٹے کو دھمکی آمیز الفاظ میں کہا:

''تیری بدتمیزی اور زبان درازی کی حد ہو گئی، اب بھی وقت ہے۔ سدھر جا اور سیدھے راستے پر چل۔ اگر تو نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو میں اپنے بھائی سے کہہ کر تجھے

ادب سکھلاؤں گی۔"

اِس دھمکی کا بیٹے پر کیا اثر ہوتا، الٹا وہ ماموں ہی پر برس پڑا اور اُول فول بکنے لگا۔ اس نے ماموں کو دھمکی دی کہ اگر اُس نے میرے خلاف کوئی حرکت کی تو میں اس کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔

اب اُس کی عمر کوئی چوبیس سال ہو چکی تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا جوان لگتا تھا۔ اپنے وفاع کی طاقت رکھتا تھا۔ کوئی اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرتا تو وہ اُس پر برس پڑتا تھا۔ ایک دفعہ اُس کی ماں اسے نصیحت آمیز کلمات کہہ رہی تھی۔ اُسے گھناؤنی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ اس پر بیٹے کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے پاؤں سے جوتا نکالا اور اپنی ماں کو دے مارا۔ ماں نے جوتے سے بچنے کی کوشش کی مگر جوتا اس کی کمر پر جا لگا۔

ماں بیٹھ گئی اور زار وقطار رونے لگی۔ وہ اپنی قسمت کو رو رہی تھی کہ ایسے بدبخت بیٹے نے اس کی کوکھ سے کیوں جنم لیا۔ شدتِ رنج وغم سے اس کا کلیجہ جھلس رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن اُسی کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ جوان ہو کر اسے جوتا

مارے گا۔ اس کی زبان سے اپنے نافرمان بیٹے کے لیے بددعا نکل گئی۔

بددعا اور وہ بھی ماں کی، ...... یہ نافرمان بیٹا ماں کو جوتا مارنے کے بعد گھر سے نکل گیا۔ اسے اپنے کرتوت پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ حسبِ معمول بُرے ساتھیوں کی مجلس میں پہنچ گیا۔ گپ شپ میں رات ہوگئی۔ اب وہ تھکا ہارا گھر واپس آیا۔ اس نے اب بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کہ اُس کے ظالمانہ رویہ سے ماں کو کتنی تکلیف پہنچی ہے؟ وہ بستر پر لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔ اِدھر ماں کا حال یہ تھا کہ اسے مارے رنج وغم کے نیند نہیں آ رہی تھی۔

صبح ہوئی۔ نافرمان بیٹا پوری نیند کے بعد بیدار ہوا۔ اور یہ دیکھ کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُس کا وہ ہاتھ مفلوج ہو چکا ہے جس سے اُس نے ماں کو جوتا مارا تھا۔ اُس کا داہنا ہاتھ بے حس رحرکت ہوگیا۔ اُس نے فوراً دروازہ بند کرلیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ ادھر ماں بھی صبح سویرے بیدار ہو کر گھر کے ضروری کام نمٹا رہی تھی کہ اسے نافرمان بیٹے کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کی طرف لپکی۔ بیٹے کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آخر تھی تو ماں! ماں کی محبت کا اندازہ بھلا کون کر سکتا ہے۔ بیٹے کو ماں کی نافرمانی کا بدلہ مل چکا تھا۔ اب ماں کے سامنے بیٹے کی شفایابی کے لیے دعا اور آہ وزاری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اُس نے فوراً ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں گڑگڑا رہی تھی، بیٹے کے حق میں دعائے خیر کر رہی تھی، پروردگار سے بیٹے کا ہاتھ ٹھیک ہو جانے کے لیے رو رو کر فریاد کر رہی تھی مگر آسمان کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا۔ [1]

---

[1] دیکھیے کتاب: کما تدین تدان، تالیف: سید عبداللہ بن سید عبدالرحمٰن الرفاعی۔

میری کتاب پڑھنے والے بھائیو اور بہنو! آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس نافرمان بیٹے کا کتنا بھیانک انجام ہوا، جس نے جوتا مارتے ہوئے اپنی عمر رسیدہ ماں کی ذرہ بھر پروا نہیں کی تھی۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اس نافرمان اور نالائق بیٹے کا کیا حشر کیا کہ جس ہاتھ سے اس نے ماں کو جوتا مارا تھا، وہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو گیا، یہ عرش کا فیصلہ تھا۔

مگر غور کریں اُس ماں کی اپنے نافرمان بیٹے سے محبت اور ہمدردی پر، کتاب ''قصص ومآس من عقوق الوالدین'' کے مؤلف کے الفاظ یہ ہیں:

''ذرا اُس ماں کا دل بھی دیکھو جس نے اپنے ساتھ بیٹے کے ظالمانہ سلوک کو یکسر فراموش کر دیا اور بیٹے کی حالت زار دیکھ کر اس کی شفایابی کے لیے بارگاہِ الٰہی میں اُس کے ہاتھ بے ساختہ اٹھ گئے۔''

میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا:

''کیا اِس جہانِ رنگ وبو میں اولاد کے حق میں ماں باپ کے دل سے بھی زیادہ نرم گوشہ رکھنے والا کوئی دل پایا جاتا ہے؟ میں اس سوال کے جواب کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوں۔''[1]

---

[1] دیکھیے کتاب: قصص ومآس من عقوق الوالدین، ص: 129,128۔

والدہ کے حقوق

اللہ کے رسول ﷺ کے ایک پیارے صحابی معاویہ بن حیدہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں نہایت ادب سے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ آخرت میں کامیابی کے امیدوار ہیں۔ خیر کے طلب گار ہیں۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں اللہ کے رسول ﷺ سے ایک سوال کرتے ہیں:

«يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَنْ أَبَرُّ»

''اللہ کے رسول ﷺ نیکی کا زیادہ حقدار کون ہے؟''

اللہ کے رسول ﷺ کا چہرہ اقدس تمتما اٹھا۔

ارشاد فرمایا: «أُمَّكَ» ''تمھاری والدہ۔''

صحابی نے عرض کیا: ثُمَّ مَنْ؟ پھر کون ہے، (کس کا مقام اور مرتبہ ہے؟)

مکرر ارشاد فرمایا: «أُمَّكَ» تمھاری والدہ۔

صحابی نے پھر نہایت ادب سے پوچھا: پھر کس کا درجہ ہے؟

اب بھی ارشاد ہوا: تمھاری والدہ۔

صحابی نے ہمت کر کے پھر پوچھ لیا: اللہ کے رسول ﷺ پھر کون؟

ارشاد ہوا: تمھارا باپ۔[1]

اللہ کے رسول ﷺ نے نہایت واضح انداز میں اپنی امت کو والدہ کی اہمیت و منزلت اور اس کے حقوق کے بارے میں بتا دیا۔ کیا ہم اُن لوگوں میں سے ہیں جو اپنی والدہ محترمہ کے حقوق ادا کرتے ہیں؟

[1] جامع الترمذي، البر والصلة، حديث: 1897، وسنن أبي داود، الأدب، حديث: 5139.

لمبی عمر پانے اور دولتمند بننے کا آسان نسخہ

ہم میں سے ایسا کون ہے جو لمبی عمر پانے کا خواہشمند نہیں؟ کوئی فرد ایسا نہیں جو مرنا چاہتا ہو۔ ہر شخص کی خواہش ہے کہ وہ تادیر اس دنیا میں رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے رزق میں اضافہ ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان خواہشات کے حصول کا بڑا آسان فارمولا بتا دیا ہے۔ آیئے ایک حدیث شریف پڑھتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُمَدَّ لَهُ فِي عُمُرِهِ وَيُزَادَ لَهُ فِي رِزْقِهِ فَلْيَبَرَّ وَالِدَيْهِ، وَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»

”جس کی خواہش ہو کہ اس کی عمر لمبی اور اس کے رزق میں اضافہ ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے والدین کی اطاعت وفرماں برداری اور صلہ رحمی کرے۔“ [1]

اللہ کے رسول ﷺ کے ایک اور فرمان کو امام ترمذی نے اس طرح بیان کیا ہے:

«لَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ»

والدین کے ساتھ حسن سلوک عمر میں اضافہ کا سبب ہے۔ [2] بعض حکماء نے بیان

[1] مسند أحمد: 3/267. [2] جامع الترمذي، القدر، حديث: 2139.

کیا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، عمر اور مال میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ خواہ ایسا کرنے والا گناہ گار ہی ہو۔

گویا یہ ایسا فارمولا ہے کہ اگر کوئی گناہ گار، اللہ کا نافرمان بلکہ کافر بھی والدین اور عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک کرے تو اس کا یہ عمل لمبی عمر اور رزق میں برکت کا سبب ہے۔

اللہ اللہ! ابراہیم علیہ السلام مشرک باپ کی ہدایت کے لیے کس قدر بے قرار تھے

قرآن کریم نے سابقہ امتوں کے قصے بیان کیے ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام اپنے والدین کے فرماں بردار تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے والدین کے لیے جو دعا کی قرآنِ کریم نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا﴾

''اے میرے رب تو مجھے اور میرے والدین اور جو بھی ایماندار بن کر میرے گھر میں آئے، سب کو بخش دے۔''[1]

مفسرین نے لکھا کہ وہ کثرت سے اپنے والدین کی مغفرت کے لیے دعا کرتے تھے۔ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے نہایت اطاعت گزار اور ان سے محبت کرنے والے فرزند تھے۔ ان کا باپ مشرک تھا۔ ان پر ایمان نہیں لایا مگر اس کے باوجود وہ اپنے والد کو مسلسل نصیحتیں کرتے رہتے۔ سورۂ مریم، آیت: 42 سے

---

[1] نوح 28:71.

47 میں قرآن کریم نے اپنے باپ سے محبت کرنے والے بیٹے کی اپنے والد سے گفتگو کا تذکرہ کیا ہے۔ اسے پڑھیے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ انھوں نے کس محبت بھرے لہجے میں اپنے کافر باپ سے بات چیت کی اور اسے حق کی دعوت دی۔

جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! آپ ان کی پوجا پاٹ کیوں کر رہے ہیں جو نہ سُن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟

میرے مہربان باپ! دیکھیے میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس آیا ہی نہیں۔ اس لیے آپ میری بات مانیں۔ میں آپ کی بالکل سیدھی راہ کی طرف رہبری کروں گا۔

میرے ابا جان! آپ شیطان کی پرستش سے باز آجائیں۔ شیطان تو رحم فرمانے والے اللہ کا بڑا نافرمان ہے۔

ابا جی! مجھے خوف لاحق ہے مبادا آپ پر کوئی عذاب الٰہی آپڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں۔

باپ نے جواب دیا: اے ابراہیم! کیا تو ہمارے معبودوں سے روگردانی کر رہا ہے؟ سن اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھروں سے مار ڈالوں گا۔ جا چلا جا۔ ایک مدت دراز تک مجھ سے الگ رہ، (یعنی مجھے میرے حال پر چھوڑ دے کہیں مجھ سے اپنے ہاتھ پیر نہ تڑوا بیٹھنا)

اتنے سخت جواب کے بدلے میں سیدنا ابراہیم نے جو کچھ فرمایا، ذرا اُسے ملاحظہ فرمائیں۔

''......اچھا تم پر سلام ہو، میں تو اپنے رب سے تمھاری بخشش کی دعا کرتا رہوں گا،

وہ مجھ پر حد درجہ مہربان ہے۔''

معزز قارئین کرام! اوپر والے مکالمہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سیدنا ابراہیم کو اپنے والد سے کس قدر محبت تھی۔ باپ ان کو ڈرا، دھمکا رہا ہے، پتھروں سے سنگسار کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ادھر آدابِ فرزندی میں ڈوبی ہوئی باپ سے بہت محبت کرنے والی عظیم شخصیت اپنے والد سے کہہ رہی ہے کہ تم پر سلام ہو۔ میں تو اپنے رب سے تمھاری بخشش کی دعا کرتا رہوں گا۔.... غور فرمائیے! باپ کی زبردست محبت، خیرخواہی، بھلائی اور ہدایت طلبی کا یہ کیسا عظیم الشان مقامِ رفیع ہے جس پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام فائز تھے!

بیٹے کے انتظار میں بھٹکتی ہوئی ماں

اُس کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ وہ ساحلِ سمندر پر چادر بچھا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ایک چائے دانی تھی جس سے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔ وہ کبھی سورج کی طرف دیکھتی جو دن بھر روشنی بکھیرنے کے بعد غروب ہونے والا تھا۔ اس کی شعاعیں افق میں سمٹ رہی تھیں۔ وہ سطحِ سمندر پر اُس کی کرنوں کی جھلملاہٹ کا نظارہ کر رہی تھی جس نے اپنے حسن و جمال سے سمندر کو چار چاند لگا دیے تھے۔

سمندر میں موجیں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ اِس حسین نظارے کو دیکھ کر وہ اِس خیال میں غرق تھی کہ نجانے ٹھاٹھیں مارتے اِس سمندر نے کتنی دلخراش داستانیں اور کتنے ناقابلِ فراموش واقعات کو اپنے سینے میں دفن کر رکھا ہوگا۔ اُس کی اپنی زندگی بھی کئی

پہلوؤں سے سمندر سے مشابہ لگ رہی تھی۔

وہ ساحل سمندر پر بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔ اُس کے قریب ہی ایک فیملی بھی تھی جو زندگی کے روزمرہ معمولات سے وقتی طور پر نجات پانے کے لیے سمندر کے کنارے سیر کے لیے آئی تھی۔ خاندان کے افراد مختلف امور پر گفتگو کر رہے تھے۔ چائے اور قہوہ کا دَور چل رہا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اُن کے گھر جانے کا وقت آیا تو گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی۔ اس وقت بھی ستر سالہ بوڑھی عورت، اکیلی بیٹھی تھی اور گاہے گاہے چائے کی چسکی لے رہی تھی۔ اس کی نگاہیں سمندر ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں، دیکھنے والا اس کی غور وفکر سے بھرپور نگاہیں آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔

سیر کے لیے آئے ہوئے خاندان میں ایک شخص کی نگاہ بار بار اُس بوڑھی پر پڑ رہی تھی۔ وہ شاید اُس عمر رسیدہ خاتون کی کیفیت کو بھانپ رہا تھا۔ جب وہ فیملی چلنے کے لیے تیار ہوئی تو اُس سے رہا نہ گیا اُس نے قریب آ کر پوچھا:

خالہ جان! کیا میں آپ کو آپ کے گھر پہنچانے کی سعادت حاصل کر سکتا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تن تنہا بیٹھی ہیں، کوئی آپ کے پاس نہیں ہے، اگر اجازت ہو تو میں آپ کی یہ خدمت کر دوں؟

عمر رسیدہ خاتون: نہیں بیٹا، اللہ آپ کو جزائے خیر دے! میں اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی ہوں، وہ آتا ہی ہوگا۔ شاید راستے میں اسے تاخیر ہوگئی ہے۔

اجنبی: خالہ جان! اب رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت ہے۔ ساحلِ سمندر سکوت کا منظر پیش کر رہا ہے۔

عمر رسیدہ خاتون: ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔ مگر میں بیٹے کے انتظار کے علاوہ اور کیا

کرسکتی ہوں؟ اچھا بیٹا! یہ کاغذ دیکھنا، میرا بیٹا مجھے سمندر کے کنارے چھوڑ کر جاتے وقت یہ رقعہ دے گیا تھا۔ ذرا پڑھنا کہ اِس میں کیا لکھا ہے۔

اُس نے رقعہ کھولا۔ اس کا مضمون یہ تھا: ''یہ رقعہ پڑھنے والے سے درخواست ہے کہ اِس خاتون کو اولڈ ہاؤس (Old People House) پہنچا دے۔''

خط کا مضمون پڑھنا تھا کہ پڑھنے والے شخص کے خاندان کے افراد چیخ اٹھے۔ انھیں اُس بڑھیا پر بڑا ترس آیا کہ جس ماں نے بیٹے کو جنم دیا، دو سال دودھ پلایا، اس کے چین وسکون کے لیے رات کی نیندیں اپنے اوپر حرام کرلیں، لیکن اُس کا صلہ اُسے کیا ملا؟! اُس نافرمان بیٹے نے ماں کو زندگی کے آخری ایام میں ساحلِ سمندر پر لے جا کر یوں بے یار ومددگار چھوڑ دیا۔ جس طرح سمندر کی موجیں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ساحل پر سمندر کا جھاگ چھوڑ جاتی ہیں۔ [1]

---

[1] دیکھیے کتاب: أنیس القلوب۔ تالیف: مصطفیٰ کمال۔ بحوالہ کتاب: قصص ومآس من عقوق الوالدین، ص: 131,130۔

والدین کی دعا سے زنجیریں ٹوٹ گئیں

مالک بن ابوعوف اشجعی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کو دشمنوں کے لشکر نے گرفتار کر لیا۔ بیٹے کی گرفتاری کی اطلاع مالک اشجعی رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ کو ملی تو دونوں بے حد پریشان ہوئے۔ ماں تو بیٹے کی گرفتاری کی تاب نہ لا کر گریہ وزاری کرنے لگی۔

سیدنا مالک رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

«أُسِرَ ابْنِي عَوْفٌ»

''میرا بیٹا عوف گرفتار ہو گیا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف رضی اللہ عنہ کے والدین کو کثرت کے ساتھ ''لا حول ولا قوۃ إلا باللّٰہ'' پڑھنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی ''لا حول ولا قوۃ إلا باللّٰہ'' کا ورد کرنے لگے۔ ان کی کثرتِ دعا رنگ لائی۔ ان کے صاحبزادے عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ جو دشمنوں کے نرغے میں تھے اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی گئی تھیں، والدین کی دعا کی بدولت اُن کی بیڑیاں ٹوٹ کر قید خانے میں گر گئیں۔ پھر وہ دشمنوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ انھوں نے فوری طور پر اپنے آپ کو سنبھالا اور دشمنوں

سے چھپ چھپا کر نکل بھاگے۔

سامنے دشمنوں کی ایک اونٹنی نظر آئی۔ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے اونٹنی کو اپنے قبضے میں لیا اور اُس پر سوار ہو گئے۔ جونہی بھاگنے کے لیے اونٹنی کی لگام کھینچی، اُن کی دشمنوں کے اونٹوں پر نظر پڑی۔ انھوں نے اونٹوں کو بھی ہانکنا شروع کر دیا، پھر اونٹ بھی عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلنے لگے۔

عوف بن مالک رضی اللہ عنہ راستے میں کہیں نہیں ٹھہرے۔ جب اُن کا پاؤں رکا تو وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ آواز سنتے ہی اُن کے والد کی زبان سے نکلا:

«عَوْفٌ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ!»

''ربِ کعبہ کی قسم! یہ میرا بیٹا عوف ہی ہے۔''

ماں نے جب یہ آواز سنی تو مارے خوشی کے چیخ پڑی کہ سبحان اللہ! میرا بیٹا دشمنوں کے نرغے سے بچ کر آ گیا۔

اِدھر عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ دشمنوں نے انھیں زنجیر میں جکڑ دیا تھا،

اُس کی وجہ سے اُن کے قُویٰ جواب دے چکے تھے اور ان کی جسمانی قوت کمزور پڑ گئی تھی۔ وہ شدتِ درد سے کراہ رہے تھے۔ ماں، باپ اور خادم جلدی جلدی دروازے سے باہر آئے۔ دیکھا کہ اُن کا لختِ جگر درد سے کراہ رہا ہے۔ وہ فوراً بیٹے کو گھر میں لے گئے۔ انھوں نے ابھی دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا کہ بیٹے کے ساتھ ڈھیر سارے اونٹ بھی گھر کے آنگن میں داخل ہو گئے۔ ماں باپ اور خادم کو یہ اونٹ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا:

''ابو جان! جب میں دشمنوں کے لشکر سے نظریں بچا کر بھاگ رہا تھا تو اُن کے اونٹ میرے سامنے تھے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ انھیں بھی ساتھ ہانک لایا۔ یہ دشمنوں ہی کے اونٹ ہیں۔''

مالک رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اپنے بیٹے عوف رضی اللہ عنہ

کی داستان کہہ سنائی۔ ساتھ ہی اونٹوں کے بارے میں بھی بتلایا۔ آپ ﷺ نے ان کی باتیں سن کر فرمایا:

«اِصْنَعْ بِهَا مَا أَحْبَبْتَ، وَمَا كُنْتَ صَانِعًا بِإِبِلِكَ»

''جو سلوک تم اپنے اونٹوں کے ساتھ کرتے ہو، ویسا ہی اِن اونٹوں کے ساتھ بھی کرو۔'' اِس واقعے کے پس منظر میں قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہوگا۔'' [1]

اِس واقعے میں ہمارے موضوع سے مطابقت رکھنے والی جو بات ہے وہ سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کے والدین کی بیٹے سے شدید محبت ہے۔ جب بیٹے کی گرفتاری کا علم ہوا تو فوراً بارگاہِ نبوی ﷺ میں ان کے والد مالک رضی اللہ عنہ اور ایک روایت کے مطابق ماں باپ دونوں ہی حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے بیٹے کی گرفتاری پر اپنی تشویش اور بیٹے سے اپنی شدید محبت کا اظہار کیا۔

سیدنا عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ بھی اپنے والدین سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کی کنیت ابو عبد الرحمن تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے جنگ خیبر میں حصہ لیا۔ فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ اَشجع کا جھنڈا اُنھی کے ہاتھ میں تھا۔ آخری عمر میں ملک شام

---

[1] الطلاق 65:2، 3.

میں جا کر بس گئے تھے۔ ان سے صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ شفاعت نبوی ﷺ کے حوالے سے درج ذیل حدیث سیدنا عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے:

«أَتَانِي آتٍ مِنْ عِنْدِ رَبِّي فَخَيَّرَنِي بَيْنَ أَنْ يُدْخِلَ نِصْفَ أُمَّتِي الْجَنَّةَ، وَبَيْنَ الشَّفَاعَةِ، فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ، وَهِيَ لِمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً»

''میرے پاس رب کریم کا نمایندہ آیا اور مجھے دو باتوں میں کسی ایک کا اختیار دیا، میری امت کی آدھی تعداد کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرما دے، یا مجھے (اُمت کے حق میں) شفاعت کا موقع دے، چنانچہ میں نے (قیامت کے روز) شفاعت کرنے کو اختیار کیا۔ میری یہ شفاعت وسفارش اُس شخص کے لیے ہوگی جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔'' [1]

سیدنا عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کی وفات دمشق میں سن 73 ھ میں ہوئی۔ [2]

[1] دیکھیے: جامع الترمذي، صفة القيامة، حديث: 2441، و صحيح ابن حبان: 186/6، و مسند أحمد: 28/6. [2] اس واقعے کی تفصیل اِن کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے: الترغيب والترهيب، حديث: 2446، وأسد الغابة: 301,300/4 و 37/5، وجامع العلوم والحكم: 493/1، والإصابة: 617/4، والاستيعاب، ص: 587,586.
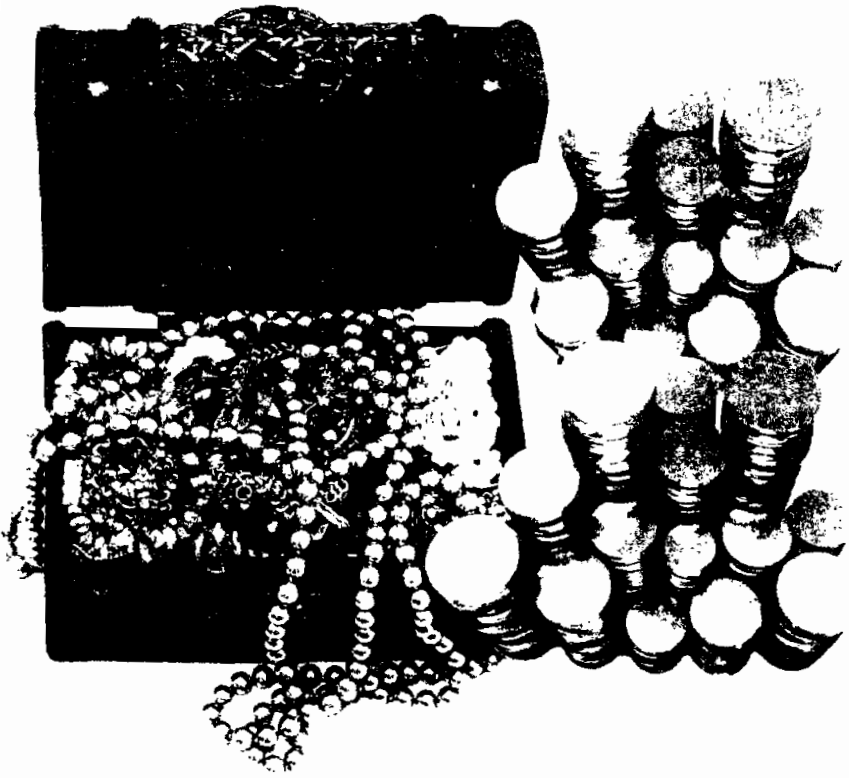
آپ اور آپ کا سارا مال آپ کے والد کا ہے

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک جوان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا:

«يَا رَسُولَ اللّٰهِ! يُرِيدُ أَبِي أَنْ يَّأْخُذَ مَالِي»

''اے اللہ کے رسول! میرا باپ میرے مال پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔''

رسول اکرم ﷺ نے اُس سے فرمایا: «ائْتِ بِأَبِيكَ عِنْدِي»

''اپنے باپ کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔''

وہ جوان باپ کے پاس گیا اور کہا: رسول اکرم ﷺ نے آپ کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم فرمایا ہے، اس لیے آپ چلیں۔

باپ آیا تو نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا: «يَقُولُ ابْنُكَ أَنْتَ تَأْخُذُ مَالَهُ»

''تمھارے بیٹے نے شکایت کی ہے کہ تم اس کے مال پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔''

باپ گویا ہوا: اے اللہ کے نبی! ذرا میرے بیٹے سے پوچھیں کہ آیا میں نے اپنے اور بچوں کے اخراجات کے لیے اس کا مال لیا ہے یا اس کے رشتے داروں کے اخراجات کے لیے لیا ہے۔

اسی دوران جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتلایا:

«يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ هٰذَا الشَّيْخُ فِي نَفْسِهِ شِعْراً مَا وَصَلَ إِلٰى أُذُنِهِ»

''اے اللہ کے رسول! اس بزرگ نے دل ہی دل میں چند اشعار کہے ہیں جن کی رسائی اس کے کانوں تک نہیں ہوئی ہے۔''

رسول اکرم ﷺ نے بزرگ سے دریافت فرمایا:

«هَلْ قُلْتَ فِي نَفْسِكَ شِعْرًا؟»

''کیا تم نے اپنے دل میں کچھ اشعار کہے ہیں؟''

بزرگ نے اس کی تصدیق کی اور عرض کیا:

«لَا يَزَالُ يَزِيدُنَا اللّٰهُ تَعَالٰى بِكَ بَصِيرَةً وَيَقِينًا»

''اللہ تعالیٰ آپ کے بارے میں ہماری بصیرت اور یقین میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔''

چنانچہ اس کے بعد بزرگ نے اپنے دل میں کہے ہوئے سات اشعار سنائے۔ان اشعار کا مختصر مفہوم درج ذیل ہے:

''یہ پیدا ہوا تھا تو میں نے اس کی دیکھ بھال میں بڑی مشقتیں برداشت کی تھیں۔اسے بخار ہو جاتا تو میری نیند حرام ہو جاتی۔میں رات بھر جاگتا رہتا۔ میرا دل بیٹے کی تکلیف کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا اور میں گھبرا اٹھتا، حالانکہ میرے دل کو یہ بھی معلوم تھا کہ موت تو کسی نہ کسی دن آنی ہی ہے، مگر یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ مرتے دم تک بیٹے کو تحفظ فراہم کرنا باپ اپنا فرض سمجھتا ہے۔لیکن آج مجھے اپنے اس بیٹے کے ناروا سلوک سے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اس کا باپ نہیں بلکہ غیر ہوں۔ بیٹے! جب تم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو میں تمھارے بارے میں حسین خواب دیکھنے لگا کہ میرا بیٹا جوان ہو کر کمائے گا، میرا ہاتھ بٹائے گا۔ سبحان اللہ! تم نے مجھے کیا خوب بدلہ دیا کہ میرے بارے میں تمھارا انداز ہی بدل گیا، تمھارا رویہ سخت ہو گیا۔تم مجھ سے معمولی سا تعاون کر کے میرے بہت بڑے محسن بن بیٹھے۔اب میں تمھارے احسان تلے دبا ہوا ہوں۔ کاش!تم حقوقِ والدین سے بخوبی واقف ہوتے تاکہ تم میرے ساتھ غیر جیسا معاملہ نہ کرتے۔''

یہ واقعہ بیان کرنے والے صحابی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب

یہ اشعار سنے تو رو پڑے۔ آپ ﷺ نے بزرگ کے بیٹے کا گریبان پکڑا اور فرمایا:

«اِذْهَبْ! أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ»

''چلے جاؤ! تم اور تمھارا مال، سب تمھارے باپ کا ہے۔'' [1]

اس واقعے سے باپ کے حقوق کا پتہ چلتا ہے کہ ایک بیٹے پر باپ کا کتنا حق ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواہ باپ بیٹے کا پورا مال خرچ کر ڈالے، بیٹے کو اس پر باپ سے ناراض نہیں ہونا چاہیے کہ باپ ہی کے وجود سے تو بیٹے کا وجود ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے مذکورہ حدیث میں بیٹے کو ملامت کرتے ہوئے فرمایا کہ جاؤ، تمھارا ہی نہیں بلکہ تمھارے تمام مال کا مالک بھی تمھارا باپ ہی ہے۔

[1] دیکھیے: أبجد العلوم :1/330-332، دارالکتب العلمیة بیروت، تحقیق عبدالجبار زکار: 1978، ودلائل النبوة للبیهقي:6/305.

بوڑھی ماں کی جان بچانے کا صلہ

ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اُس عمارت کے چاروں طرف کھڑی تھیں۔ ان کی آوازیں سُن کر قرب و جوار کے سارے لوگ ہوشیار ہو گئے۔ وہ رہائشی عمارت تھی جس کے نچلے حصے میں کئی اسٹور بنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اُن میں آگ لگ گئی تھی۔ آگ بجھانے کے لیے سرکاری وغیرسرکاری عملہ پہنچ چکا تھا۔ آواز بلند ہو رہی تھی کہ عمارت میں جتنے لوگ ہیں وہ فوراً عمارت خالی کر دیں۔

وہ عورت اپنے فلیٹ میں سو رہی تھی۔ اس کا شوہر اتفاق سے اُس روز گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ عورت کی گود میں ایک شیرخوار بچہ تھا۔ بستر پر اُس کی دو بچیاں بھی سو رہی تھیں۔ اس کی عمر رسیدہ ماں کا بستر بھی ایک طرف لگا ہوا تھا، جو چلنے پھرنے سے عاجز تھی۔ لوگوں کے چیخنے چلانے کی آواز سے عورت بیدار ہو گئی۔ اس نے فلیٹ کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ جب اُس نے دیکھا کہ عمارت کے اسٹور والے حصے میں آگ لگ چکی ہے اور لوگ چیخ رہے ہیں اور بہت سے لوگوں کی آوازیں

بھی آ رہی تھیں کہ بلڈنگ خالی کرو، جلدی نکلو، بھاگو، نیچے اترو۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر عورت بُری طرح گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اَب کرے تو کیا کرے۔

عورت نے فوراً اپنی دونوں بچیوں کو جگایا۔ بچیاں بھاگ کر چھت پر چڑھ گئیں اور بچاؤ کے بارے میں سوچنے لگیں۔ آگ کے شعلے عورت کے فلیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ اب اس عورت کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنے شیر خوار بچے اور عمر رسیدہ ماں دونوں ہی کو فلیٹ سے باہر نکال لے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اُن میں سے کسی ایک ہی کو بچا سکتی تھی کیونکہ چند ہی لمحوں بعد آگ کے شعلے پورے فلیٹ کو اپنی لپیٹ میں لینے والے تھے۔

اب ایک مشکل مرحلہ تھا، آیا اپنے شیر خوار بچے کو فلیٹ سے نکالے یا اپنی عمر رسیدہ ماں کو، جو بہت بوڑھی تھی اور اپنے آپ اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ ذرا غور کریں یہ موقع کس قدر گھمبیر تھا اور ایسے نازک وقت میں فیصلہ کس قدر مشکل تھا۔ عورت نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی بوڑھی ماں کو کندھے پر اٹھایا، فلیٹ سے نکلی اور چھت پر چڑھ گئی۔ ادھر فلیٹ سے اُس کا نکلنا تھا کہ آگ پوری طرح فلیٹ میں پھیل گئی۔ بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس کی آواز تو باہر سنائی دے رہی تھی مگر فلیٹ کے اندر کسی کو جانے کی ہمت نہیں تھی۔

عورت عمارت کی چھت پر بچے کے لیے فکر مند تھی۔ اس کا جگر رنج وغم سے پھٹ رہا تھا۔ اسے اپنی فکر کم، شیر خوار بچے کی زیادہ تھی۔ وہ سینے کو دبا کر چھت پر بیٹھ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ سب لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔ ماں اپنے بچے کے لیے نڈھال تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہی تھی۔ ادھر فائر بریگیڈ والے بھی پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے جلد ہی آگ پر قابو پا لیا۔

یکا یک لوگ یہ دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے کہ بچہ زندہ ہے، اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچی، آگ نے اسے کچھ نقصان نہیں پہنچایا۔ سب لوگ بے حد خوش تھے۔ لوگوں کے شور وغل کی آواز ماں کے کانوں سے ٹکرائی اور بچے کو صحیح سلامت دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے فوراً بچے کو سینے سے لگا لیا اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگی۔

قارئین کرام! آپ نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا خوش کن انجام دیکھا۔ آپ نے دیکھا کہ ماں کو اپنے بچے پر ترجیح دینے والی خاتون کے شیر خوار بچے کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح بچایا۔ کاش! ہم بھی اپنی ماؤں کو اسی طرح فوقیت دیں جیسے اس خاتون نے دی تھی۔[1]

---

[1] یہ واقعہ انٹرنیٹ سے ماخوذ ہے۔ کئی ایک جرائد میں بھی شائع ہوا ہے۔

والدین کی خدمت بھی جہاد ہے

ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی۔

آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «أَحَيٌّ وَالِدَاكَ» ''کیا تمھارے والدین حیات ہیں؟''

اس نے عرض کیا: جی ہاں!

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ» ''ان دونوں ہی میں جہاد کرو۔'' یعنی اُن دونوں کی خدمت کرو، یہی تمھارا جہاد ہے۔'' [1]
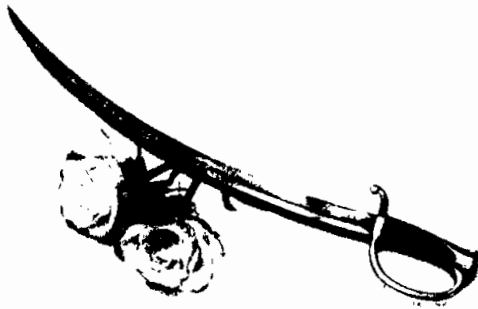
[1] جامع الترمذي، البر والصلة، حديث: 1904، وصحيح ابن حبان: 177,176/2، حديث: 435.

خالہ سے نیکی کا برتاؤ کرو

ایک شخص نہایت شکستہ دل، پریشان حال اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔عرض کی: اللہ کے رسول ﷺ مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوگیا ہے۔کیا میرے لیے توبہ ہے؟

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«هَلْ لَكَ مِنْ أُمٍّ»

کیا تمھاری والدہ زندہ ہیں؟

اس نے عرض کیا: جی نہیں۔

ارشاد ہوا:

«هَلْ لَكَ مِنْ خَالَةٍ»

کیا تمھاری خالہ زندہ ہیں؟

اس نے کہا: جی ہاں وہ زندہ ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«فَبِرَّهَا»

جاؤ اس کے ساتھ نیکی کرو۔[1]

اللہ کے رسول کے اس فرمان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خالہ کا مرتبہ والدہ کے برابر ہے۔

[1] جامع الترمذي، البروالصلة، حديث: 1904، وصحيح ابن حبان: 2/177,176، حديث:435.

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

ملک یمن سے تعلق رکھنے والا عبد اللہ بانعمہ نامی شخص ان دنوں سعودی عرب کے معروف تجارتی شہر جدہ میں مقیم ہے۔اس کا دھڑ مکمل طور پر فالج زدہ ہے۔ صرف اُس کا سر اور جسم کا اوپر والا حصہ سلامت ہے۔ وہ بستر پر پڑا رہتا ہے۔ اس قدر معذوری کے باوجود آج وہ ایک کامیاب داعی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ معمولی سی بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ سامنے رکھے ہوئے قرآن کریم کا صفحہ بھی الٹ کر نہیں پڑھ سکتا۔ اس کا بیان ہے کہ اُسے باپ کی بد دعا لگ گئی ہے۔ اس کے پاس اُس کی ماں بیٹھی رہتی ہے اور اس کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔ والدین کی نافرمانی کے حوالے سے اس کا قصہ عرب ممالک میں بڑا مشہور ہے۔ مختلف عربی چینلز اُس کی تقریریں نشر کرتے رہتے ہیں۔

آیئے ہم عبد اللہ بانعمہ کا معروف قصہ اور انٹرویو آپ کی نذر کرتے ہیں۔

استاذ عبد اللہ بانعمہ! آپ کے بارے میں وہ قصہ جس کا تعلق حقوقِ والدین سے ہے، بڑا معروف ہے۔ اس میں اُن لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو والدین کی اہمیت وعظمت کو نہیں پہچانتے۔ کیا آپ اس بارے میں ہمیں کچھ بتلانے کی زحمت

فرمائیں گے؟

استاذ عبداللہ بانعمہ: حمد وثنا کے بعد میں کہنا چاہوں گا کہ میں ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ آپ نے مجھ سے اپنا قصہ بیان کرنے کی فرمائش کی ہے۔ میں یہ قصہ بطور درسِ عبرت سناتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾

''اور آپ نصیحت فرمائیں کہ نصیحت مومنوں کو نفع پہنچاتی ہے۔'' [1]

آپ نے والدین کی نافرمانی کے حوالے سے جو قصہ سننے کی خواہش کا اظہار کیا ہے وہ قدرے طویل ہے مگر میں اختصار کے ساتھ آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ میں اپنا قصہ بیان کرنے سے پہلے آپ سے کہنا چاہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر انتہائی فضل وکرم اور احسان ہے کہ اُس نے مجھے توبہ کرنے کی توفیق بخشی۔ میری زندگی بھی باقی رکھی، تاکہ میں اُس کے دین کی خدمت کرسکوں اور زندگی بھر اسلام کی سچی اور صحیح راہ کی طرف لوگوں کو دعوت دے سکوں۔ یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا اتنا عظیم احسان ہے کہ میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ میرے جسم کا نچلا دھڑ فالج زدہ اور ناکارہ ہے مگر اِس کے باوجود میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے پروردگار کی طرف سے توبہ کرنے کو توفیق ملی۔ مجھے دین کی تھوڑی بہت خدمت کا موقع بھی ملا۔ اِس نعمت پر میں اللہ تعالیٰ کا جتنا زیادہ شکر ادا کروں، کم ہے۔

اَب میں آپ کو اپنی زندگی کا وہ لمحہ بیان کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جسے سن کر

[1] الذّٰریٰت 55:51.
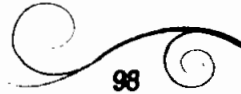
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔قصہ یہ ہے کہ میں نے بُرے ساتھیوں کی صحبت اختیار کر لی اور سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ اسٹائل کے ساتھ سگریٹ کے کش لینا میری عادت تھی۔

والدِ محترم کو کسی نے میری اِس بُری عادت کے بارے میں اطلاع دے دی۔ ماں باپ کے لیے بہرحال یہ ایک تکلیف دہ بات ہے کہ اُن کی اولاد سگریٹ نوشی کرے یا اِس طرح کی دیگر بری عادتوں میں مبتلا ہو، چنانچہ میرے والد فوراً میرے پاس تشریف لائے اور غصے میں پوچھا: میں نے سنا ہے کہ تم سگریٹ پینے لگے ہو، کیا یہ بات صحیح ہے؟

''نہیں نہیں، آپ کو یہ جھوٹی خبر کس نے سنا دی؟ میں نے تو کبھی سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

مجھے اِس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ میں اپنے والد کے سامنے جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرے اندر خوفِ الٰہی کی کمی تھی۔ میں جان بوجھ کر جھوٹ بول گیا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث کے مطابق جان بوجھ کر جھوٹ بولنے والا دوزخ میں اپنا ٹھکانہ بناتا ہے۔[1]

''کیا تم سچ بول رہے ہو کہ واقعی تم سگریٹ نہیں پیتے اور مجھے تمھارے بارے میں جو رپورٹ پہنچی ہے وہ غلط ہے؟'' والد نے پوچھا

''میں بار بار آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں سگریٹ نہیں پیتا، نہیں پیتا، نہیں پیتا پھر بھی آپ مجھ سے یہی سوال کیے جا رہے ہیں، آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟!

میں نے بآوازِ بلند انھیں ڈانٹ دیا اور کہا کہ میرے کمرے سے نکل جائیے۔

میرے والد نے میرے کمرے سے نکلتے ہوئے بڑے درد سے کہا:

---

[1] معرفة الصحابة لأبي نعيم:8/247، حديث:2611.

''اگر تم سگریٹ پیتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمھاری گردن توڑ دے۔''

یہ میرے والد کی میرے لیے ایک قسم کی بد دعا تھی۔ میں نے اُن کی بد دعا کی کوئی پروا نہیں کی۔ میرے لیے یہ گفتگو ایسی ہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میرے بھائی! آپ مجھے اِس حالت میں دیکھ رہے ہیں کہ میں فالج زدہ انسان ہوں مگر کم سے کم زندہ تو ہوں اور راہ ہدایت پر آچکا ہوں۔ مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ سلامت رکھا۔ یوں مجھے توبہ کرنے کا موقع مل گیا۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوتا کہ میں اپنے والد کی بد دعا کے بعد مر جاتا تو میرا کیا حشر ہوتا؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ والدین کی رضا وخوشنودی میں اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی ہے؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ والدین کی ناراضی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ماں باپ کے قدموں تلے جنت ہے اور ان کی نافرمانی مول لینے والے پر جہنم واجب ہے؟

میں نے اپنے والد کو اپنی چرب زبانی اور جھوٹے جواب سے قائل کرنے کی کوشش تو کی، بلکہ اُنھیں ڈانٹ بھی دیا۔ مگر میرے والد کو سو فیصد یقین تھا کہ میں سگریٹ پیتا ہوں، یہی وجہ تھی کہ وہ ناراض ہو کر اور مجھے بد دعا دے کر میرے کمرے سے چلے گئے۔

شام ہوئی۔ میں گھر آیا۔ کھا پی کر سو گیا۔ صبح ہوئی۔ ہاتھ منہ دھو کر میں اسکول روانہ ہو گیا۔ اسکول سے واپسی پر میں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ سوئمنگ پول (Swimming pool) کا رخ کیا۔ ہمارا معمول تھا کہ ہم چند دوست ہمیشہ سیر وتفریح کی غرض سے سوئمنگ پول پہنچ جاتے تھے، چنانچہ اِس مرتبہ بھی ہم سوئمنگ پول جا پہنچے۔

میں سوئمنگ میں بہت تیز تھا۔ دس دس منٹ تک ڈبکی لگائے رکھتا تھا۔ جب ہم سب ساتھی سوئمنگ پول کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ پانی کا نل بند ہے۔ ساتھیوں نے

فیصلہ کیا کہ واپس چلتے ہیں۔مگر میں نے انھیں کہا کہ چلنے کی ضرورت نہیں، میں نل کھولتا ہوں۔نل سوئمنگ پول کے نچلے حصہ میں تھا۔ سوئمنگ پول کی گہرائی کوئی تین ساڑھے تین میٹر تھی، جبکہ میرا قد ایک میٹر اور بیاسی سینٹی میٹر تھا۔ میں نے ایک کرسی کی مدد سے اندر جانے کی کوشش کی۔ میں نے سوئمنگ پول کے اندر داخل ہو کر نل کھولنے کے لیے ابھی ڈبکی ہی لگائی تھی کہ میں یکا یک کرسی کے نیچے ہی دب کر رہ گیا۔ میرے ساتھی یہ سمجھتے رہے کہ میں چونکہ دیر تک پانی کے اندر ڈبکی لگائے رکھنے کا عادی ہوں، اس لیے میرے اوپر نہ آنے سے انھیں کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ میں پانی کے اوپر آ جاؤں مگر اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کچھ اور ہی مقدر کر رکھا تھا۔ میں نے پانی کے اندر جسم کو حرکت دینے کی لاکھ کوشش کی مگر جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا، پھر جب میں پانی کے اوپر آیا تو میرے جسم کا نچلا حصہ فالج زدہ ہو چکا تھا۔

سوئمنگ پول کے اندر جب میں پانی میں ڈوبا ہوا تھا تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اب میں زندگی کے آخری مرحلے میں ہوں اور میرا جنازہ آج ہی اٹھایا جائے گا۔ مجھے اُس وقت یاد آیا کہ رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق مصیبت کی گھڑی میں اپنے نیک اعمال کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی جائیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ میں نے بھی جلدی جلدی اپنے ایک نیک عمل کے حوالے سے دعائیں مانگنی شروع کیں۔ وہ نیک عمل یہ تھا کہ میں ایک زمانے میں اپنی آمدنی سے کچھ حصہ ایک ضرورت مند بڑھیا کو دے دیا کرتا تھا۔ وہ بڑھیا میرے حق میں دعائے خیر کیا کرتی تھی۔ میں جب بھی اس کو صدقہ دیتا اس کے دونوں ہاتھ میرے لیے آسمان کی طرف بلند ہو جاتے۔اللہ تعالیٰ نے اسی دوران پانی کے اندر نبی کریم ﷺ کی اِس حدیث کی

طرف بھی میری رہنمائی فرمائی:

«مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ»

''دنیا میں جس کا آخری جملہ لا اِلٰہ اِلا اللہ ہوگا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔''[1]

چنانچہ میں نے کلمۂ شہادت کا وِرد شروع کر دیا۔ اِس دوران میرے پیٹ میں بہت سارا پانی چلا گیا۔ اب مجھ پر بے ہوشی طاری ہو چکی تھی۔ میرے بھائی کا بیان ہے کہ تقریباً پندرہ منٹ بعد مجھے سوئمنگ پول سے باہر نکالا گیا۔ گر اس طویل وقفہ کو دیکھیں تو میں ایک مردہ انسان تھا۔ مگر نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«صَنَائِعُ الْمَعْرُوفِ تَقِي مَصَارِعَ السُّوءِ»

''بھلائی کے کام بُری موت میں رکاوٹ بنتے ہیں۔''[2]

میرے بھائی کا بیان ہے کہ سوئمنگ پول سے نکالنے کے بعد مجھے اوپر نیچے کیا گیا۔ میرے پیٹ پر ہاتھ رکھ رکھ کر دبایا گیا تو میرے منہ سے کئی لیٹر پانی نکلا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ چار سال تک میں ہسپتال میں رہا۔ ہسپتال میں میرا جو پہلا علاج ہوا وہ میرے حلق میں سوراخ کے سلسلے میں تھا۔ مجھے سانس لینے میں بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ تقریباً نو ماہ تک میں نے کوئی کلام نہیں کیا۔ کیونکہ سانس کی ہوا حلق کے راستے نکل جاتی تھی۔ آکسیجن کا بھی بڑا مسئلہ تھا۔ کم وبیش سولہ چھوٹے بڑے آپریشن میرے جسم کے ہوئے۔ میری پشت کا سارا حصہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ دس بارہ برس تک میری کمر کا علاج چلتا رہا۔ آج مجھے بسترِ مرض پر

[1] سنن أبي داود، الجنائز، حديث: 3116، علامہ البانی ؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [2] صحيح الجامع الصغير، حديث: 3795.

پڑے ہوئے کوئی چودہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں بہت صبر و تحمل کے ساتھ یہ وقت گزار رہا ہوں۔

آج مجھے آپ ایک فالج زدہ انسان کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ اس کا سبب میں خود ہوں۔ میں نے جوانی میں اپنے باپ کی نصیحت کی کوئی پروا نہیں کی۔ غفلت کی زندگی گزاری۔ جھوٹی قسم کا سہارا لیا اور بُرے ساتھیوں کی صحبت میں رہا، چنانچہ اُس کا انجامِ بد اس صورت میں سامنے آیا کہ میں جوانی کے خوشگوار ایام سے محروم رہا۔ آج میں آپ کے سامنے ایک اپاہج کی حیثیت سے بستر پر پڑا ہوں۔

میں اپنی ماں کے حوالے سے بھی چند باتیں آپ کے گوش گزار کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے آج اس بات کا شدید احساس ہے کہ ہماری نئی نسل اپنے ماں باپ

کی خدمت میں پیچھے کیوں ہے؟ ہم نے آخر اپنے والدین کو کیا دیا ہے؟ جبکہ انھوں نے ہمیں جنم دیا۔ ہماری پرورش و پرداخت کی، ہمیں عدم سے وجود میں لانے کا وہی سبب بنے۔

میرے پاس ایک دفعہ بیس یتیموں پر مشتمل ایک ٹیم آئی۔ وہ لوگ میرے ارد گرد بیٹھ گئے۔ میں نے اُن کو اپنا واقعہ تفصیل سے سنایا۔ انھوں نے مجھ سے جو کچھ پوچھا میں نے اس کا جواب دیا۔ جب وہ میرے پاس سے اُٹھ کر جانے لگے تو ان میں سے ایک نوجوان میرے پاس ہی کھڑا رہ گیا۔ وہ ٹیم کے ساتھ باہر نہیں نکلا۔ وہ زار وقطار رو رہا تھا۔ اُس کے آنسو دیکھ کر میرے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے بھی آنسو نکل پڑے۔ میں نے اُس سے دریافت کیا: عزیزم! آخر تمھیں یکایک کیا ہوگیا کہ تم زار و قطار رونے لگے؟ نوجوان نے عرض کیا:

''عبد اللہ! میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ کاش! آپ کی جگہ میں ہوتا۔''

میں نے نوجوان سے کہا:

''میرے بھائی! اللہ کا خوف کرو، تم کیوں چاہتے ہو کہ میری جگہ تم آجاؤ؟''

اس نے انتہائی معصومیت سے کہا: تمھارے پاس ماں باپ ہیں اور ہم ماں باپ کے سائے کے بغیر جی رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ آپ ناگفتہ بہ حالت میں ہیں پھر بھی آپ بے حد خوش قسمت ہیں کہ آپ کے والدین ابھی زندہ ہیں اور آپ کے پاس موجود ہیں۔ جبکہ ہمارے پاس یہ عظیم نعمت موجود نہیں۔ بھلا ماں باپ جیسی انمول دولت دنیا میں کہاں ملتی ہے۔
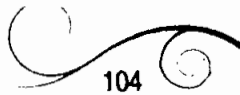
قارئین کرام! یہ تھا یمن کے اُس نوجوان کا قصہ جو آج بھی زندہ ہے اور جدہ میں مقیم ہے۔ اس کے والدین بھی الحمد للہ اب تک بقید حیات ہیں۔ عبد اللہ با نعمہ نامی یہ نوجوان آج ایک کامیاب داعی بن چکا ہے۔ دنیا کے مختلف معروف چینلز پر اس کے پروگرام نشر ہو چکے ہیں۔ جب آپ اُس سے ملیں گے تو وہ سلام دعا کے بعد انتہائی محبت سے آپ سے محوِ گفتگو ہوگا۔ آپ جب اُس سے اُس کی حالت کے بارے میں پوچھیں گے تو وہ آپ کو اپنا یہ قصہ ضرور سنائے گا۔ [1]

---

[1] اس مضمون کی تفصیل کے لیے دیکھیں: www.saaid.net، نیز دیکھیں: www.bdr130.net.

جب دیا رنج بُتوں نے تو خدا یاد آیا!

اُس کا اِس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ سسرال میں نہ میکے میں، وہ اکیلی تھی۔ گود کا ایک بچہ ہی اس کی کل کائنات تھا۔ اُس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے پیچھے ایک چھوٹے سے مکان کے علاوہ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ مکان بھی قیمتی نہ تھا۔

شوہر کے انتقال سے صرف ایک مہینہ پہلے اُس کی گود ایک خوبصورت بچے سے بھری تھی، چنانچہ شوہر کی وفات کے بعد اُس کی ساری توجہ اپنے ننھے بچے کی طرف مرکوز تھی۔ ماں کی تمام تر کوششیں صرف اس مقصد کے لیے وقف تھیں کہ کسی طرح اپنے بچے کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائے۔

وقت کے ساتھ اس کا بچہ کچھ بڑا ہوا اور اسکول میں داخلہ لینے کے قابل ہو گیا۔

وہ دن اُس کے لیے انتہائی خوشی کا دن تھا جب وہ اپنے بچے کو پہلی دفعہ اسکول لے کر گئی۔ دن گزرتے رہے اور ماں نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے ننھے بچے کو اسکول پہنچاتی رہی۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب بیٹے نے پرائمری تعلیم مکمل کر کے سرٹیفکیٹ ماں کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیا۔ ماں کو اُس دن جو خوشی ہوئی اُس کا اظہار زبان و بیان کے کسی بھی اسلوب میں ممکن نہیں۔

ایک وقت آیا کہ اُس کا اکلوتا بیٹا کالج کی تعلیم سے بھی فارغ ہو چکا تھا۔ کالج کی ڈگری اُس نے اپنے ملک کے دار الحکومت کے ایک مشہور کالج سے حاصل کی تھی۔ اتفاق سے وہ اسی شہر میں رہتا تھا۔ ایک غریب ماں کے لیے واقعی یہ بڑی خوشی کی بات تھی کہ اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔ بیٹے کی خواہش تھی کہ وہ آگے بھی اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھے۔ اس کے نمبر بھی ما شاء اللہ اتنے اچھے تھے کہ سرکاری طور پر اسے بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے کی پیش کش کی جا چکی تھی۔

اس کی ماں بھی اپنے لختِ جگر کو بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنے پر راضی ہو گئی۔ ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑے سے بڑے عہدے پر فائز ہو۔ ایسی صورت میں اعلیٰ تعلیم ہی انسانی زندگی کی معراج ٹھہرتی ہے۔ آخر وہ دن آ گیا جب بیٹے کی فلائٹ روانہ ہونی تھی۔ ٹیکسی دروازے پر کھڑی تھی۔ ڈرائیور ہارن بجا رہا تھا۔ ماں اپنے لختِ جگر کو تیار کر کے دروازے سے باہر نکلی۔

ٹیکسی کا دروازہ بند ہوا اور پھر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ٹیکسی ماں کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر ہوائی اڈے چلی گئی۔ ماں کو بیٹے کی جدائی سے بے حد صدمہ پہنچا۔ وہ گھر کے اندر گئی۔ بستر پر لیٹ گئی اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔

بیٹا بیرونِ ملک پہنچ چکا تھا۔ اُس زمانے میں ٹیلی فون اور انٹرنیٹ کی سہولتیں نہیں تھیں۔ دور پردیس میں بسنے والے لوگوں کے لیے اپنے وطن یا گھر سے رابطے کی فقط ایک ہی سہولت تھی، یعنی ڈاک۔ ماں کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا۔ وہ پڑوسیوں کی منت سماجت کر کے بیٹے کے نام خط لکھواتی۔ بیٹے کا جواب آتا تو پڑوسیوں ہی سے پڑھواتی۔

وقت بھی اُڑان بھر کر کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ دن سے ہفتہ، ہفتے سے مہینہ،

مہینے سے سال، زندگی کے لیل ونہار لمبے لمبے ڈگ بھر کر اسی طرح گزرتے چلے گئے۔ ایک دن بیٹے کا خط پڑوسی کے گھر آیا۔ اس میں بیٹے نے اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کا تذکرہ کیا تھا۔ ماں نے جب یہ خبر سنی کہ بیٹا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکا ہے تو اس کی خوشی کا کیا پوچھنا!

دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک بار دو بار تین بار... ماں گہری نیند سورہی تھی۔ برسوں بعد اسے آج اچھی طرح نیند آئی تھی۔ دستک کی ہلکی ہلکی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ پائی۔ اس نے پہلے کی نسبت زور سے دستک دی۔ جسے سن کر اچانک ماں کی آنکھ کھلی اور وہ بے تابی سے دوڑتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔ دروازہ کھلا تو سامنے ایک نہایت خوبرو نوجوان انگریزی لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔ ماں نے یک دم بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ پھر کیا تھا؟ بیٹا بھی آنسو بہا رہا تھا اور ماں کے آنسو تو رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ماں بیٹا گھر میں بیٹھے چھ برس کی لمبی جدائی اور پھر اِس دوران رُونما ہونے والے حالات و واقعات پر بے صبری سے باتیں کر رہے تھے۔ ماں اپنے بیٹے سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھی۔

بیٹا بھی بوڑھی ماں کو جدائی کے ماہ و سال کی سرگزشت سُناتا رہا۔

اب حالات نے پلٹا کھایا۔ بیٹے کو مناسب نوکری مل گئی۔ اس کی ماہانہ آمدنی بھی کافی تھی۔ پڑھنے لکھنے کے بعد بیٹے کا مزاج اپنی بوڑھی ماں سے یکسر مختلف ہو چکا تھا۔ چند مہینے اسی ٹوٹی پھوٹی موروثی رہائش گاہ میں گزارنے کے بعد بیٹے نے ماں کی اجازت سے مکان فروخت کر دیا۔ اور شہر کے ایک اچھے علاقے میں ایک خوبصورت بنگلہ خرید لیا۔

اس کے بعد ماں بیٹا اس بنگلے میں منتقل ہو گئے۔ ماں کو اب بیٹے کی شادی کی فکر تھی۔ دورانِ گفتگو اُس نے ایک لڑکی کا نام لیا جو انتہائی خوش اخلاق، باکردار، خوش رنگ، خوش شکل، فرماں بردار، اطاعت گزار اور خدمت گزار تھی۔ کئی ماہ سے ماں نے اُس لڑکی کو اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا اور دل ہی دل میں اسے اپنے بیٹے کے لیے منتخب بھی کرلیا تھا۔ مگر وہ لڑکی ماڈرن زمانے کی لڑکیوں کی طرح زرق برق لباس کی شوقین اور بازاروں میں گھومنے پھرنے والی نہیں تھی، بلکہ وہ شرم وحیا کی پُتلی تھی۔ چنانچہ ماں نے بیٹے کے سامنے اپنی تمنا کا اظہار کر ہی دیا۔

بیٹا ماں کا انتخاب جان کر بے پروائی سے بولا: ''چھوڑو بھی ماں! آخر شادی کی اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی وقت ہے، کہیں نہ کہیں شادی ہو ہی جائے گی۔''

وقت گزرتا گیا، ماں بیٹا ایک چھت کے نیچے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن بیٹے نے ماں سے اپنی شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُس نے ماں کو ہونے والی بیوی کے بارے میں بتلایا جس کا اس نے خود انتخاب کیا تھا۔ یہ لڑکی ایک بڑے باپ اور نامور خاندان کی بیٹی تھی۔ چنانچہ شادی دھوم دھام سے ہوئی اور بنگلے میں حسن کی ملکہ جلوہ افروز ہوگئی۔

لڑکی بڑے باپ اور نامور خاندان کی ہونے کی وجہ سے اسی مزاج کی حامل تھی جو عام طور پر ایسے خاندان کی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ غرور، تکبر، دوسروں کو حقارت آمیز نگاہ سے دیکھنا۔

بیٹا جب بھی بوڑھی ماں سے اپنی بیوی کے بارے میں پوچھتا کہ بیوی کا اُس کے ساتھ کیسا رویہ ہے؟ وہ میری عدم موجودگی میں تمھاری خدمت کرتی ہے یا نہیں؟ تو

ماں کا صرف ایک ہی جواب ہوتا ''اچھی بہو ہے بیٹا، میرے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتی ہے۔'' ماں بیٹے سے بہو کے بارے میں یہ سب کچھ اس لیے کہتی تاکہ بیٹے کے جذبات کو ٹھیس نہ لگنے پائے اور گھر کا ماحول خراب نہ ہو۔

یہ سلسلہ چلتا رہا، بیٹا بھی اَب ماں سے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ آفس سے آتا، بیوی سے بات چیت کرتا۔ کھا پی کر سو جاتا اور صبح ڈیوٹی پر روانہ ہو جاتا۔ یہی اُس کا روزانہ کا معمول تھا۔ آہستہ آہستہ اُس کے دل سے ماں کی محبت زائل ہوتی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُسے رات دن میں کبھی ماں کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ ایک دن وہ آفس سے دوپہر ہی کو واپس آ گیا۔ اُس دن بیوی کی سہیلیاں اُس کے گھر ضیافت پر آنے والی تھیں۔ اس کی نگاہ ماں پر پڑی جو باتھ روم میں اپنے کپڑے خود اپنے ناتواں ہاتھوں سے دھو رہی تھی۔ وہ باتھ روم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ماں کپڑے صاف کرنے میں مشغول تھی۔ اُس کی بیوی بھی اُس کے پیچھے اپنی زلفیں لہرا رہی تھی۔ اُس نے ماں سے مخاطب ہو کر کہا:

''میں تم سے یہ کہنے کے لیے آفس سے آیا ہوں کہ میری بیوی کی سہیلیاں گھر آنے والی ہیں، ہمارے گھر اُن کی دعوت ہے، اِس لیے تم میری بیوی کی شان وشوکت کا خیال رکھتے ہوئے آج کوئی اچھا لباس پہن کر اُن کا استقبال کرنا، اور ہاں! ہال میں اُن کے ساتھ بیٹھنے کی کوشش نہ کرنا، یہ میری اور میری بیوی کی عزت کا سوال ہے۔''

ماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج اسے اپنے اُسی بیٹے سے کیا کچھ سننے کو مل رہا ہے، جس کی تعلیم وتربیت میں نجانے اُس

نے کتنا خون پسینہ بہایا تھا۔ اُس نے اپنے چند کپڑے پلاسٹک کی ایک تھیلی میں رکھے اور گھر سے باہر نکل گئی۔ بنگلے پر الوداعی نظر ڈالی۔ اس کے آنسو ٹپک پڑے۔ پھر اس کے دل سے آہ اور زبان سے یہ جملہ نکلا:

''اللہ تجھے معاف کرے بیٹا! اللہ کی قسم! میں نے تیرے اور تیری بیوی کے لیے ہمیشہ بھلائی کا کام کیا ہے۔ اللہ کی قسم! مجھے یاد نہیں کہ میں نے تیری بیوی کو کبھی کسی قسم کی کوئی تکلیف دی ہو۔ اللہ تم سب کو معاف فرمائے بیٹا۔''

اور پھر وہ کسی نامعلوم منزل کی طرف چل پڑی۔

کئی مہینے بیت گئے، بوڑھی ماں کبھی اس کے در پر کبھی اُس کے در پر، کبھی ایک کے گھر کبھی دوسرے کے گھر اپنی زندگی کے دن گزارتی رہی۔ وہ گاہے بگاہے لوگوں سے اپنے بیٹے کی خیریت بھی دریافت کرتی رہتی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ بہو بیٹا ماں کی یاد سے غافل ہوتے چلے گئے۔ اب انھیں بھول کر بھی ماں یاد نہیں آتی تھی۔ اس واقعے کو کئی سال گزر چکے تھے۔ اچانک بیٹے کو کوئی بیماری لاحق ہوئی۔ دیکھنے میں تو یہ عام سی بیماری لگ رہی تھی۔ ایک کلینک کا ڈاکٹر علاج میں کامیاب نہ ہو سکا تو اُس نے اُسے ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ بیوی نے اُسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ اُدھر ماں کو کسی نے بیٹے کی نازک حالت کے بارے میں بتلایا تو وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے فوراً ٹیکسی کرائے پر لی اور ہسپتال پہنچ گئی۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ماں کی ممتا اور اس کی محبت کی مثال اِس دنیا میں کہاں مل سکتی ہے؟ بیٹے کی بیماری کے بارے میں جب سے اس نے سنا تھا، بے چین ہو گئی تھی اور بیٹے سے ملاقات کے لیے تڑپ رہی تھی۔ مگر بہو کے کہنے پر ہسپتال کے اسٹاف نے

اسے بیٹے سے نہ ملنے دیا۔

ایک مدت تک ہسپتال میں علاج چلتا رہا، پھر ڈاکٹروں نے کہا کہ مریض کو گھر لے جائیں اور وہیں علاج کریں۔ گھر میں علاج چلتا رہا۔مگر علاج میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ جب اُس کا بینک بیلنس ختم ہو گیا تو گھر کی اشیاء فروخت کرنے کی نوبت آ گئی۔اِدھر بیوی بھی خدمت کرتے کرتے پریشان ہوگئی۔ وہ بات بات پر شوہر پر ٹوٹ پڑتی اور جلی کٹی باتیں سُناتی تھی۔ لاچار شوہر، بستر پر پڑا بیوی کی باتیں برداشت کرتا رہتا تھا۔

ایک دن بیوی نے غصہ میں آ کر کہا: ''بس۔ بہت ہو گیا۔ جب سے میں نے تمھارے گھر میں قدم رکھا ہے، مشکلات اور پریشانیوں کی چکی میں پس رہی ہوں۔ کچھ دنوں تک تمھاری ماں کو جھیلتی رہی۔ اب تمھاری بیماری جھیل رہی ہوں۔اب میرا اور تمھارا ساتھ نہیں نبھ سکتا۔ مجھے طلاق چاہیے۔تم نے سنا نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ مجھے طلاق چاہیے آج اور ابھی طلاق چاہیے۔''

''بیوی کی باتیں سُن کر یوں لگا جیسے اُس نے میرے چہرے پر آہنی تھپڑ رسید کر دیا ہے۔''

اُس نے بیوی کے مطالبے پر فوراً طلاق نامہ تیار کرایا اور طلاق ہو گئی۔طلاق کے بعد اس کی صحت دن بدن گرنے لگی۔اب اسے اپنی ماں کی یاد ستانے لگی۔ گرتی ہوئی صحت اور مفلسی کی حالت میں اسے اپنی ماں کی ضرورت بہت شدت سے محسوس ہوئی روئے زمین پر صرف ایک ہی ہستی تھی جو اسے زندگی کی طرف لا سکتی تھی اور وہ اس کی ماں تھی۔
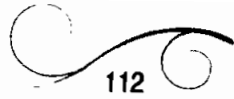
لیکن ماں ..... اللہ جانے وہ کہاں گم ہو چکی تھی۔ عرصۂ دراز سے لوگوں کو اُس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ ماں کی تلاش میں سرگرداں شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتا رہا۔ دَر دَر جاتا اور ''ماں ماں'' کی رَٹ لگاتا۔ ایک دن وہ ایک محلّہ کی مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا۔ مغرب کا وقت آن پہنچا۔ وہ اُسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے رک گیا۔ مسجد میں داخل ہوا تو دروازے پر اُس کی نگاہ ایک بوڑھی خاتون پر پڑی جو ہاتھ میں کاسۂ گدائی لیے کھڑی تھی اور نمازیوں سے بھیک مانگ رہی تھی۔ یہ اُس کی وہی ماں تھی جس نے اُسے پال پوس کر بڑا کیا تھا اور اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ وہ ماں جس نے بیٹے کو پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنایا تھا اور یہ تصور کر بیٹھی تھی کہ اُس کا بیٹا بڑا آدمی بن جائے گا تو اس کے درد کا درماں ثابت ہوگا لیکن آج وہ حالات کے دوراہے پر کاسۂ گدائی لیے کھڑی تھی اور مسجد کے سامنے بھیک مانگ رہی تھی۔

بیٹے کو بڑا جھٹکا لگا وہ فوراً ماں کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر معافی مانگنے لگا۔ پھر اُس نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور گھر روانہ ہو گیا۔ وہ راہ چلتا جاتا تھا اور بآوازِ بلند کہتا جاتا تھا:

> ''اللہ کی لعنت اور فرشتوں کی پھٹکار ہو ایسی بے وفا بیوی پر جس نے مجھے ماں جیسی عظیم ہستی سے جدا کر دیا۔ لعنت ہو میری پی ایچ ڈی کی ڈگری پر جس نے میرے دل سے ماں کی محبت نکال دی۔ لعنت ہو اُس بنگلے پر جس نے مجھے ماں سے بے گانہ کر دیا۔ لعنت ہو میری بھاری تنخواہ پر جس نے میرے دل کو اندھا کر کے ماں کی عظمت شناسی چھین لی۔''

گھر پہنچ کر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ اس نے ماں کے پاؤں پکڑے اور معافی مانگی۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے، اُس کے جذبۂ محبت کی مثال کہاں مل سکتی ہے۔ اُس نے بیٹے کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی: ''نہیں بیٹا! کوئی بات نہیں، مجھے تم سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔''[1]

[1] اس واقعے کی تفصیل کتاب: قصص ومآس من عقوق الوالدین، ص: 68-74 میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مشرک والدین سے کیا سلوک کیا جائے؟

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ مکہ کے رہنے والے یہ قریشی نوجوان اپنی والدہ کے نہایت اطاعت گزار تھے۔ والدہ سے بڑی محبت کرنے والے تھے۔ جب ان کی قسمت جاگی تو انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے مسلمان ہونے کا شرف حاصل کرلیا۔ اب یہ مسلمان تھے اور ان کی والدہ کافرہ تھیں۔ جس قدر یہ اسلام میں پختہ اور جذبہ توحید سے سرشار تھے، اتنا ہی ان کی والدہ بتوں کی پجارن اور اللہ کے رسول ﷺ کی دشمن تھیں۔

اُن کی والدہ کو معلوم ہوا کہ سعد نے اسلام قبول کرلیا ہے تو اپنے بیٹے سے کہنے لگیں کہ سعد تم نے کون سا دین قبول کرلیا ہے؟ کیا تم نے اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ دیا ہے؟ میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ اس نئے دین کو چھوڑ دو، پھر دھمکی دیتے ہوئے کہنے لگیں کہ اگر تم نے محمد عربی ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا تو پھر میں مرتے دم تک کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی، پھر اہل عرب تمھیں زندگی بھر طعنہ دیں گے کہ تم اپنی والدہ کے قاتل ہو۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اماں جان! کھانا پینا چھوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ میں اپنے اسلام کو چھوڑنے والا نہیں۔

اُن کی والدہ نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اُس پر نقاہت طاری ہوگئی۔ ایک دن اور ایک رات گزر گئی۔ اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص نے اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھا تو کہا: اللہ کی قسم! اگر تمھاری سو جانیں بھی ہوں اور یکے بعد دیگرے تمھاری ساری جانیں چلی جائیں، تب بھی میں اپنے دین کو چھوڑنے والا نہیں۔ اب تمھاری مرضی ہے کہ کھانا کھاؤ یا نہ کھاؤ۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص کی اس دو ٹوک گفتگو کے بعد اُن کی والدہ کو یقین ہوگیا کہ سعد اپنی بات کا پکا ہے۔ میری بات ماننے والا نہیں تب اُس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے بندے پر پیار آ گیا اور قرآن کریم میں آیات نازل فرما دیں۔

﴿وَإِنْ جَٰهَدَاكَ عَلَىٰٓ أَن تُشْرِكَ بِى مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِى ٱلدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ﴾ (لقمان15:31)

”اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح بسر کرنا۔“ [1]

[1] صحیح مسلم، فضائل الصحابة، حدیث: 1748، بعد الحدیث: 2412، وجامع الترمذي، تفسیر القرآن، حدیث: 3189، ومسند أحمد: 186,185/1.
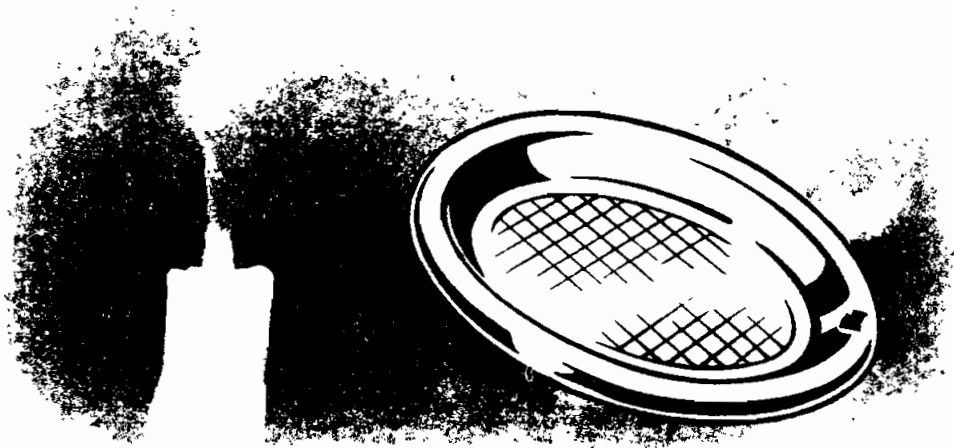
پلاسٹک کی پلیٹ

یہ اُس آدمی کا قصہ ہے جس کے پاس مال و دولت اور اولاد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ہر طرح سے خوش حال تھا۔ اُس کی زندگی ہی میں اُس کی ساری اولاد کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ بیٹیاں شادی کے بعد سسرال جا کر بس گئیں اور بیٹے شادی کے بعد بیویوں کو ساتھ لے کر الگ الگ مکانوں میں رہنے لگے۔ اب گھر میں صرف بوڑھے ماں باپ باقی رہ گئے اُن کی خدمت کے لیے ایک ڈرائیور اور ایک نوکرانی گھر میں موجود تھی۔

بچوں کا معمول تھا کہ چھٹی کے دن زیادہ تر وقت اپنے والدین کے پاس ہی گزارتے۔ اِس طرح بوڑھے والدین کو کوئی خاص تنہائی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ انھیں

نواسا، نواسیوں، پوتا اور پوتیوں کو گاہے بگاہے دیکھنے اور ان کے ساتھ خوش کلامی کا موقع مل جاتا تھا۔ لیکن چند برس کے بعد ماں کا انتقال ہو گیا اور گھر میں باپ اکیلا رہ گیا۔ چنانچہ اُس نے اپنے بڑے بیٹے کے سامنے تجویز رکھی کہ میں تنہا اِس گھر میں نہیں رہنا چاہتا۔ اس لیے اب میں تمھارے ساتھ رہوں گا۔

بیٹے نے باپ کی خواہش بخوشی قبول کی اور بوڑھے والد کو لے کر گھر کو روانہ ہو گیا۔ گھر میں اس نے ایک کمرے کی اچھی طرح صفائی کرائی اور اسے اپنے والد کے لیے وقف کر دیا۔ باپ کی خدمت میں اُس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جب بھی ڈیوٹی سے آتا باپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور خیریت دریافت کرتا۔

مگر یہ سلسلہ زیادہ دن تک نہ چل سکا۔ اُس کی بیوی سسر کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتی تھی۔ اُس کا شوہر شام کو آفس سے تھکا ہارا گھر آتا تو وہ اس کے بوڑھے باپ کے خلاف شکایات کا ڈھیر لے کر بیٹھ جاتی۔ ایک دن اُس نے شوہر کے سامنے بلا جھجک کہہ دیا:

''اب اِس گھر میں مَیں رہوں گی یا تمھارا باپ!''

یہ سنتے ہی شوہر کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ اُس نے بیوی کو کافی سمجھایا بجھایا۔ بہت بحث کے بعد آخر کار دونوں میاں بیوی میں اِس بات پر اتفاق ہو گیا کہ بوڑھے باپ کو گراؤنڈ فلور سے نکال کر چھت سے ملحق کمرے میں منتقل کر دیا جائے تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ مل سکے۔ چنانچہ بیٹے نے باپ سے کہا:

''میں نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو چھت سے ملحق کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ چھت پر صاف ستھری ہوا بھی آئے گی، سورج

کی روشنی سے بلاواسطہ فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور چھت کی فضا سے آپ لطف اندوز بھی ہوتے رہیں گے۔"

"ہاں ہاں بیٹا! بھلا تمھاری اِن باتوں سے اختلاف کیوں کر ہو سکتا ہے، تم نے میرے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے وہ میرے حق میں صحیح ہے۔ اس طرح میری صحت بھی اچھی رہے گی۔" باپ نے بیٹے کے جواب میں کہا۔

وہ گھر کے نچلے حصے میں رہتا تھا تو گاہے بگاہے اس کے ننھے منّے پوتے اور پوتیاں من بہلا دیا کرتے تھے اور وہ اُن کے ساتھ گھل مل کر کچھ باتیں کر لیا کرتا تھا مگر چھت پر آنے کے بعد اُسے وہی تنہائی ڈسنے لگی جو بیوی کے انتقال کے بعد اُسے اپنے گھر میں ڈستی تھی۔

بے چارہ باپ اِس تنہائی اور بہو بیٹے کی جانب سے بے پروائی کو صبر و تحمل سے جھیلتا رہا۔ غم کی شدت اسے کھائے جا رہی تھی مگر وہ اِس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اُس کے ساتھ بیٹا اور بہو کوئی اچھا برتاؤ نہیں کر رہے۔ اسے یہ دیکھ کر اندر ہی اندر بڑا دکھ ہوتا تھا کہ گھر میں اچھی اچھی اور قیمتی پلیٹیں موجود ہیں۔ اس کے باوجود اُس کا کھانا ہمیشہ ایک پلاسٹک کی پلیٹ میں آتا ہے اور وہ بھی صاف ستھری نہیں ہوتی تھی۔ بہو نوکرانی سے کہا کرتی تھی:

"کھانا اِسی پلاسٹک کی پلیٹ میں دیا کرو، شیشے کی پلیٹ میں کھانا دوگی تو وہ توڑ دیں گے یا اسے گندا کر دیں گے۔"

بوڑھا باپ اَب عمر کے آخری حصے میں قدم رکھ چکا تھا۔ اُس کی زندگی اور قبر کے مابین بس تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اِدھر گھر میں کوئی بھی اس کا دھیان رکھنے والا نہیں

تھا۔ اس کے کپڑے گندے، اُس کا کمرہ بھی گندا اس پر مستزاد تنہائی کا زہر۔ اب وہ جی نہیں رہا تھا، جینے کی نقل کر رہا تھا۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جس سے کسی کو مفر نہیں۔ بوڑھا باپ فوت ہو گیا۔

بوڑھے باپ کو اِس دنیا سے رخصت ہوئے کوئی چار پانچ ہفتے گزرے تھے کہ نافرمان بیٹا اپنے بچوں اور نوکروں کے ساتھ باپ کے کمرے میں داخل ہوا اور کمرے کی صفائی ستھرائی میں لگ گیا۔ وہ کمرہ گھر کے ڈرائیور کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ کمرے کی صفائی کے دوران اُس نافرمان بیٹے کے ایک بچے کی نظر پلاسٹک کی اُس پلیٹ پر پڑ گئی جو اُس کے بوڑھے دادا کے لیے خاص کر دی گئی تھی۔ بچے نے لپک کر پلیٹ اپنے ہاتھ میں اٹھا لی۔ باپ نے فوراً کہا: اِس پرانی اور گندی پلیٹ کا کیا کرو گے؟ اسے پھینک دو۔ یہ رکھنے کے قابل نہیں ہے۔

لیکن چھوٹے بچے نے باپ کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا اور کہنے لگا: نہیں نہیں، مجھے اس کی ضرورت ہے، میں اِس کی حفاظت کروں گا، میں اسے پھینک نہیں سکتا۔

باپ نے اپنے بچے کی باتیں سن کر پوچھا: بھلا اِس گندی پلیٹ کا کیا کرو گے؟ بچے نے جواباً کہا: میں پلاسٹک کی اِس پلیٹ کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں، تاکہ کل جب آپ بوڑھے ہو جائیں تو میں آپ کو اِسی پلیٹ میں کھانا دے سکوں۔

ننھے مُنّے بچے کی یہ بات سن کر نافرمان بیٹے کے کان کھڑے ہو گئے۔ اَب اسے احساس ہو چکا تھا کہ بوڑھے باپ کے ساتھ اُس کا سلوک اچھا نہیں تھا اور وہ اپنے محسن باپ کا نافرمان بیٹا ہے۔ بچے کی بات سے وہ بہت شرمندہ ہوا پھر اس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ کمرے کی صفائی کا کام چھوڑ کر وہ اپنے باپ کے بستر پر لیٹ

گیا اور آنسو بہاتے بہاتے باپ کے کمرے کا فرش چومنے لگا۔ لیکن
''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔'' [1]

---

[1] یہ واقعہ شیخ محمد العریفی کی کیسٹ سے لیا گیا ہے۔ ویسے اس کی تفصیل انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ اسے انٹرنیٹ کی ویب سائٹ http:www.gesah.net پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

قبرستان کی بُڑھیا

میں ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ ایک دفعہ چند خواتین کو قبرستان پہنچانے کا اتفاق ہوا۔ وہ میری ٹیکسی پر سوار ہوئیں اور میں انھیں لے کر قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ خواتین کو قبرستان پہنچا کر واپس ہو رہا تھا کہ میری نظر ایک بڑھیا پر پڑی جو قبرستان کے ایک کونے میں ایک قبر کے پاس بیٹھی تھی۔ بڑھیا نابینا تھی۔ جس قبر کے پاس وہ بیٹھی تھی وہ اُس کے بیٹے کی تھی۔ یہ کوئی مغرب کا وقت تھا۔ آفتاب غروب ہونے والا تھا۔

میں نے بڑھیا کو دیکھا تو ضرور مگر اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ قبرستان سے میری ٹیکسی باہر آ گئی اور میں سواری کی تلاش میں سڑک پر گاڑی دوڑاتا ہُوا کچھ دور نکل گیا۔ نہ جانے میرے تصور میں اُس نابینا بڑھیا کا چہرہ بار بار کیوں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ بڑھیا اس وقت جبکہ ساری دنیا کام کاج سے فارغ ہو کر گھروں کو واپس جا رہی ہے، قبرستان میں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ یکا یک میری ٹیکسی کا اسٹیرنگ مڑ گیا۔ میں اب قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔

قبرستان پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بڑھیا بدستور وہیں بیٹھی ہے جہاں میں نے اُسے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ میں نے ٹیکسی ایک جانب کھڑی کر دی اور بڑھیا کے پاس گیا۔

میں نے پوچھا: اماں جان! آپ اکیلی یہاں قبرستان میں کیا کر رہی ہیں؟

وہ کہنے لگی: ''بیٹا! میں اپنے بیٹے کی قبر کی زیارت کے لیے آئی ہوں۔''

میں نے پوچھا:

''کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں؟''

بڑھیا میری بات سن کر مسکرائی اور کہنے لگی:

''بیٹا! اللہ تجھے اِس کا بہتر بدلہ عنایت فرمائے، بات یہ ہے کہ میرا بیٹا ابھی آنے والا ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گھر جائے گا۔''

جب مجھے یقین ہو گیا کہ بڑھیا کا بیٹا اسے گھر لے جانے کے لیے آنے والا ہے تو میں واپس چلا آیا۔ کہنے کو میں گھر واپس تو آ گیا مگر اَب بھی میرے خیالات کا رُخ اسی نابینا بڑھیا کی طرف تھا۔ مجھے اس کے بارے میں نہ جانے کیوں بار بار کچوکا سا لگ رہا تھا۔ میں خود کو ملامت کر رہا تھا کہ آخر میں نے اِس اندھیری رات میں بے چاری بڑھیا کو قبرستان میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا؟ اسے اس کے گھر کیوں نہیں پہنچا دیا؟ مجھے دل ہی دل میں ندامت ہو رہی تھی۔ میرا دل ڈر رہا تھا کہ بڑھیا کو کچھ ہو نہ جائے۔

اگلے روز وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ صبح شہر میں چاروں طرف شور مچ گیا کہ قبرستان میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ رات کسی درندے نے ایک بوڑھی خاتون کو مار ڈالا ہے۔ میں ٹیکسی پر سوار ہوا اور قبرستان کی طرف گاڑی بھگا دی۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بڑھیا زمین پر پڑی ہے۔ اس کے جسم کو ایک کالے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ دراصل رات کو جب بڑھیا کا بیٹا اسے گھر لے جانے کے لیے نہیں آیا تو وہ قبرستان ہی میں سو گئی۔ رات کو کوئی خونخوار جانور قبرستان آیا اور اس نے بڑھیا کو

چیر پھاڑ کر مار ڈالا۔

بڑھیا کے بیٹے کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی بوڑھی اور نابینا ماں سے بیزار تھا۔اُس ظالم نے دوسرے بیٹے کی قبر کی زیارت کے بہانے ماں کو قبرستان لے جا کر چھوڑ دیا اور واپس لانا بھول گیا۔ بھول کیا گیا، جان بوجھ کر ماں کو لینے ہی نہیں گیا تا کہ اسے کوئی جانور مار ڈالے، چنانچہ رات کو ایک بھیڑیے نے بڑھیا کو چیر پھاڑ کر مار ڈالا۔

میں کفِ افسوس ملتے ہوئے قبرستان سے واپس گھر آ گیا اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ کاش! میں نے گزشتہ رات ہی بڑھیا کو اُس کے گھر پہنچا دیا ہوتا تو شاید یہ حادثہ رونما نہ ہوتا۔ پھر میں اُس کے حق میں دعائیں کرنے لگا۔

اِس قصے میں ایک خاص سبق یہ ہے کہ بعض اولاد اتنی بد بخت ہوتی ہے کہ اسے ماں جیسی نعمت کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ وہ ماں کے ساتھ عمر کے آخری مرحلے میں اتنا بھیانک سلوک کرتی ہے کہ تاریخ اسے ناقابلِ معافی مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے پھر وہ تا قیامت اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کے نیک بندوں کی لعنت کا ہدف بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنا نصیب کرے۔ آمین [1]

---

[1] اس قصے کی تفصیل مختلف کتابچوں کے علاوہ انٹرنیٹ کی سائٹ www.gesah.net پر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

ماں کی غمخوار بیٹی کے لیے اللہ کی مدد

اِس واقعہ کی راوی خود اُس لڑکی کی ٹیچر ہے۔ وہ لڑکی کمرۂ امتحان میں سوال نامہ لیے بیٹھی تھی اور بہت متفکر نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے میز پر جواب لکھنے کے لیے سفید کاغذوں کی کاپی رکھی ہوئی تھی۔ امتحان میں نگرانی پر متعین ٹیچر بڑی چاق چوبند تھی۔ اُس نے تمام طالبات پر نگرانی کی کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ ''پتا کھڑکا اور بندہ دھڑکا'' ذراسی بھی آہٹ ہوتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ آناً فاناً آواز کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ اچانک اُس کی نظر ایک طالبہ پر پڑی جو پرچۂ سوالات لیے بیٹھی ہے۔ اس نے جوابی پیپر پر ایک حرف بھی نہیں لکھا، جبکہ پرچۂ سوالات تقسیم ہوئے آدھا وقت گزر چکا تھا اور دوسری ساری طالبات جلدی جلدی سوالات حل کر رہی تھیں۔

نگران ٹیچر اُس لڑکی کے پاس گئی۔ اس نے اس لڑکی ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ لڑکی کے چہرے کے آثار بتلا رہے تھے کہ وہ انتہائی فکرمند اور پریشان ہے۔ اب جبکہ امتحان کا آدھا وقت بیت چکا تھا، اچانک اس لڑکی نے قلم سنبھالا اور ''چل میرے قلم بسم اللہ!'' کہہ کر لکھنا شروع کر دیا اب اُس کا قلم سفید جوابی پیپر پر تیزی

سے فراٹے بھر رہا تھا۔

نگران ٹیچر نے اُس لڑکی کے قلم کو اچانک برق رفتاری سے چلتے دیکھا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی طالبہ ہے جو ابھی چند منٹ پہلے تک ایک حرف بھی نہیں لکھ سکی تھی اور اب اچانک اس کا قلم کھٹا کھٹ سوالات حل کر رہا ہے۔ ہو نہ ہو اِس لڑکی نے نقل لگانے (Cheating) کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ وہ اب ٹکٹکی باندھ کر اس لڑکی کی ہر نقل و حرکت کو عقابی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ کمرۂ امتحان میں موجود دیگر تمام طالبات کی طرف سے اس کی توجہ بالکل ہٹ گئی وہ صرف اُسی لڑکی کو تکتی رہی۔ اسے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لڑکی امتحان کے آدھے وقت تک تو خالی بیٹھی رہی۔ ایک لفظ بھی نہ لکھ سکی، اب اچانک اس کا قلم کاغذ پر ناچ رہا ہے۔ آخر یہ کیا بھید ہے؟ کڑی نگرانی کے باوجود وہ طالبہ کی ایسی کوئی حرکت نہیں پکڑ سکی جو قابل اعتراض ہو اور نقل لگانے کے زمرے میں آتی ہو۔ امتحان کا وقت ختم ہونے پر وہ لڑکی سوالات حل کرنے کے بعد جوابی کاپی کاؤنٹر پر جمع کرا رہی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹی! شروع سے آخر تک میں نے تمھاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھی۔ تم نے امتحان کے آدھے وقت تک ایک حرف بھی نہیں لکھا مگر آدھا وقت گزرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ تمھارا قلم تیز رفتاری سے چل رہا ہے، پھر تم نے بہت جلدی سارے سوالات حل کر دیے؟ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟'' نگران ٹیچر نے پوچھا۔

لڑکی نے جواب دیا: بات یہ ہے کہ مجھے آج امتحان دینا تھا، اس وجہ سے میں

رات بھر سو نہیں سکی۔

''اِس کا مطلب ہے کہ تم امتحان کی تیاری کے لیے رات بھر جاگتی رہیں؟'' ٹیچر نے طالبہ کی بات میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں محترمہ! یہ بات نہیں ہے کہ میں نے پوری رات امتحان کی تیاری میں گزاری ہے، بلکہ آج کے امتحان کے حوالے سے تو میں نے سرے سے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا''۔لڑکی نے کہا۔

''تو پھر تمھاری شب بیداری کا مقصد کیا تھا؟'' ٹیچر نے پوچھا۔

''میری والدہ بیمار تھی'' لڑکی نے جواب دیا۔

لڑکی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بیان کیا:

''میری والدہ سخت بیمار تھی۔ میرے سامنے آج کا امتحان تھا اور سامنے بیمار والدہ! میں نے عزم کیا تھا کہ میں رات بھر امتحان کی تیاری کروں گی، کیونکہ آج کا امتحان واقعی میرے لیے سخت تھا۔ لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے میں رات بھر ان کی تیمارداری میں لگی رہی۔ اور مسلسل جاگتی رہی۔ امتحان کی تیاری کے لیے مجھے چند لمحات بھی نصیب نہیں ہو سکے۔''

''پھر تم نے آج کا پرچہ کیسے حل کیا؟'' ٹیچر نے پوچھا۔

''جب پرچہ تقسیم ہوا تو میں نے شروع سے آخر تک سارا پرچہ پڑھا اور بار بار پڑھا۔ مجھے ایک سوال کا بھی صحیح جواب معلوم نہ تھا۔ مجھے دل ہی دل میں بہت کوفت ہو رہی تھی۔ میں نے یقین کر لیا کہ میں اِس پرچے میں ضرور فیل ہو جاؤں گی۔ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ رہی تھی اور اعمالِ صالحہ کا حوالہ دے کر دعائیں کر رہی تھی۔

میرے اعمالِ صالحہ میں سب سے زیادہ محبوب اور اخلاص پر مبنی عمل میرے نزدیک رات کا وہ عمل ہے جو میں نے اپنی ماں کی تیمارداری کے طور پر کیا۔ میں نے اپنے اِس عمل کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ یہ دعا رنگ لائی۔ جب امتحان کا آدھا وقت گزر چکا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے ایک جوابی کتاب رکھی ہے جس کے اوراق خود بخود کھلتے جا رہے ہیں۔ اس طرح مجھے امتحانی سوالات کے مطلوبہ جوابات ملنے لگے۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے کھٹا کھٹ سوالات حل کرنے شروع کر دیئے۔ اور مقررہ وقت میں تمام سوالات کا جواب لکھ ڈالا۔''

ٹیچر اپنی شاگردہ کا جواب سن کر حیران رہ گئی۔ اس نے طالبہ کی اِس کامیابی کو ماں کی خدمت کا پھل قرار دیا۔ [1]

---

[1] یہ واقعہ انٹرنیٹ سے ماخوذ ہے۔ واقعہ عربی زبان میں ہے۔ ہم نے انٹرنیٹ کے حوالے سے اس کی ترجمانی کی ہے۔

ماں باپ کو حج کرانے کا انعام

اس واقعے کا راوی ایک عربی نوجوان ہے۔ اُس نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے، جسے ہم کتاب ''سعادة الدارين في بر الوالدين'' سے یہاں قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لیے نقل کر رہے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ میں ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ ملازمت کے دوران میں نے کسی وجہ سے کمپنی کے منیجر کو استعفیٰ پیش کر دیا۔ استعفیٰ قبول ہو گیا۔ کمپنی کی جانب سے مجھے 32000 دینار بطور واجبات ملے۔ میں نے اپنا حق وصول کیا اور گھر آ گیا۔ میرے پاس اُس رقم کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ حق یہ ہے کہ اتنے زیادہ دینار میرے لیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب سن 1424 ہجری کا حج بالکل قریب تھا۔ بیت اللہ شریف کی زیارت کے خواہشمند حضرات حج کے لیے ضروری انتظامات کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے۔ جب میں گھر پہنچا تو اپنے والدین کو کمپنی کی طرف سے ملے ہوئے واجبات، یعنی 32000 دینار کے بارے میں بتلایا۔ والدہ اور والد دونوں نے فرمایا:

''ہماری خواہش ہے کہ تم یہ رقم ہمیں دے دو تا کہ ہم فریضۂ حج ادا کر سکیں۔''
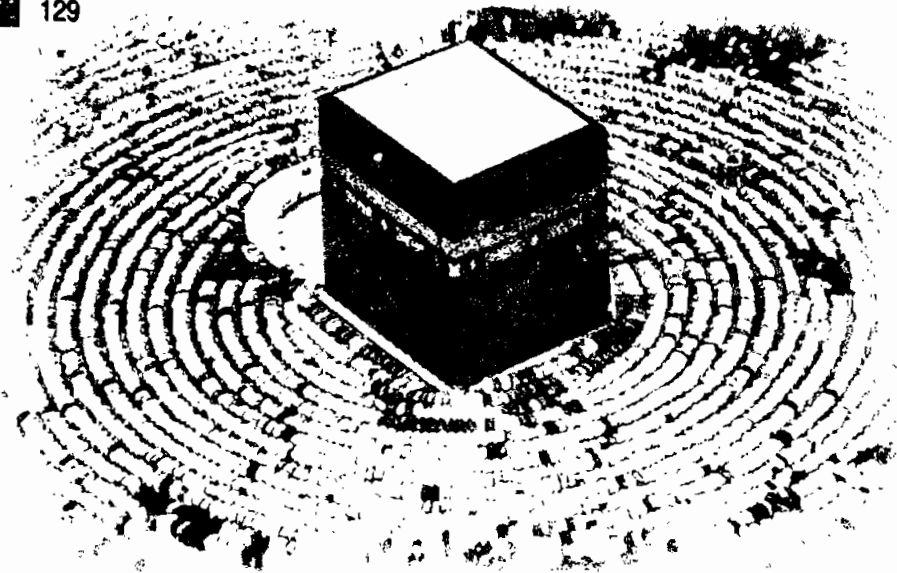
میں نے ان کے حکم پر فوراً لبیک کہا اور مطلوبہ رقم ان کے حوالے کر دی۔ ہر چند مجھے مال کی ضرورت تھی مگر والدین کی خواہش کا احترام میرے لیے سب سے اہم بات تھی۔ پھر میں خود حج کا انتظام کرنے والی ایک کمپنی کے پاس گیا۔ حج سے متعلقہ فارم پُر کیا اور تمام کارروائیاں مکمل کر کے اپنے والدین کو حج کے مبارک سفر پر روانہ کر دیا۔ الحمد للہ! انھوں نے حج کا فریضہ بحسن وخوبی ادا کر لیا اور دو ہفتہ بعد مکہ مکرمہ سے وطن واپس آ گئے۔ والدین کی حج سے واپسی کے بعد ایک دن کا ذکر ہے کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ فون ریسیو کیا۔ یہ میری سابقہ کمپنی کے منیجر کا فون تھا۔ اس نے بتلایا کہ کمپنی میں چونکہ تم نے طویل عرصے تک ملازمت کی ہے، اس لیے بدلِ خدمت کے طور پر کمپنی کے اصول کے مطابق تمھارا حق خدمت دیناروں کی شکل میں پڑا ہوا ہے، تم آفس سے رابطہ کر کے اپنا حق وصول کر لو۔
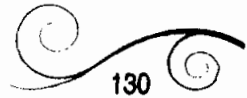
میں نے سوچا کہ یہ کوئی معمولی سی رقم ہوگی۔ کیونکہ میں پہلے ہی اپنا بدلِ خدمت وصول کر چکا تھا۔ میں آفس پہنچا۔ منیجر سے رابطہ کیا۔ اس نے ایک لفافے میں چیک دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آفس سے گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔ گھر پہنچ کر میں نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں اتنی ہی قیمت کا چیک تھا جتنی رقم میں نے والدین کے حج پر خرچ کی تھی۔ سبحان اللہ! والدین کو حج بھی کرا دیا۔ اور مجھے اتنی ہی رقم واپس بھی مل گئی۔ گویا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میرے والدین مجھ سے بہت خوش تھے۔

آدابِ فرزندی سے گُندھا ہوا بیٹا

عمر بن ذر رحمہ اللہ سے کسی شخص نے پوچھا:

«كَيْفَ بِرُّ ابْنِكَ بِكَ؟»

''آپ کے صاحبزادے کا آپ کے ساتھ سلوک کیسا ہے؟''

عمر بن ذر رحمہ اللہ نے جواب دیا:

''دن کو نکلتا ہوں تو وہ (میرے احترام میں) میرے پیچھے پیچھے رہتا ہے، رات کو (میری حفاظت کے لیے) میرے آگے آگے چلتا ہے جب میں گھر کے اندر ہوتا ہوں تو وہ کبھی چھت پر نہیں چڑھتا (کیونکہ وہ اسے میری شان میں گستاخی سمجھتا ہے۔)''

یہ تھا ہمارے بزرگ اسلاف کا اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، سچ تو یہ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور اُن کی خوشی کے لیے کام کرنا، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کا باعث ہے۔[1]

---

[1] دیکھیے کتاب: سعادة الدارین في بر الوالدین، ص: 78,77.

سیب اور گیند کا مقابلہ

وہ انتہائی نیک اور صالح بیٹا تھا۔ باپ کے ساتھ حسنِ سلوک میں اپنی مثال آپ تھا۔ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ اللہ کی رضا وخوشنودی کا حصول اُس کا مشن تھا۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا سبق اس نے خوب پڑھ رکھا تھا، اس لیے وہ اپنی تمام تر مصروفیات پر والدین کی خدمت کو ترجیح دیتا تھا۔ والدین کے ساتھ اس کے حسنِ سلوک کی لوگ مثال دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ والد کے ساتھ اپنی نیکی اور حسن سلوک کی بنا پر وہ خود پسندی کا شکار ہو گیا۔ وہ اپنے احسان پر بڑا نازاں تھا۔ والد کے ساتھ حسنِ سلوک سے اسے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہو چکی تھی، چنانچہ اس نے ایک روز والد سے عرض کیا:

''ابو جان! میں چاہتا ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ بچپن میں جو احسان یا میری بھلائی کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے، اس کا بدلہ نیکی و بھلائی سے دوں۔ اللہ کی قسم! آپ مجھے مشکل سے مشکل کام کا بھی حکم فرمائیں گے تو میں اسے آسانی سے انجام دوں گا۔ آپ کا فرمان چاہے کتنا ہی کٹھن ہو میں اسے آسان ہی نہیں پر لطف بھی بنا لوں گا۔''

والد باشعور اور تجربہ کار انسان تھا۔ اس نے بیٹے کی باتوں کو دھیان سے سنا مگر کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے اس کے جذبات کے آبگینے کو ٹھیس لگے۔ یا اس کے احساسات کی ناقدری ہو۔ اس نے بیٹے سے کہا:

''مجھے زندگی میں کسی چیز کی خواہش نہیں رہی، البتہ چند سیب ضرور کھانا چاہتا ہوں۔''
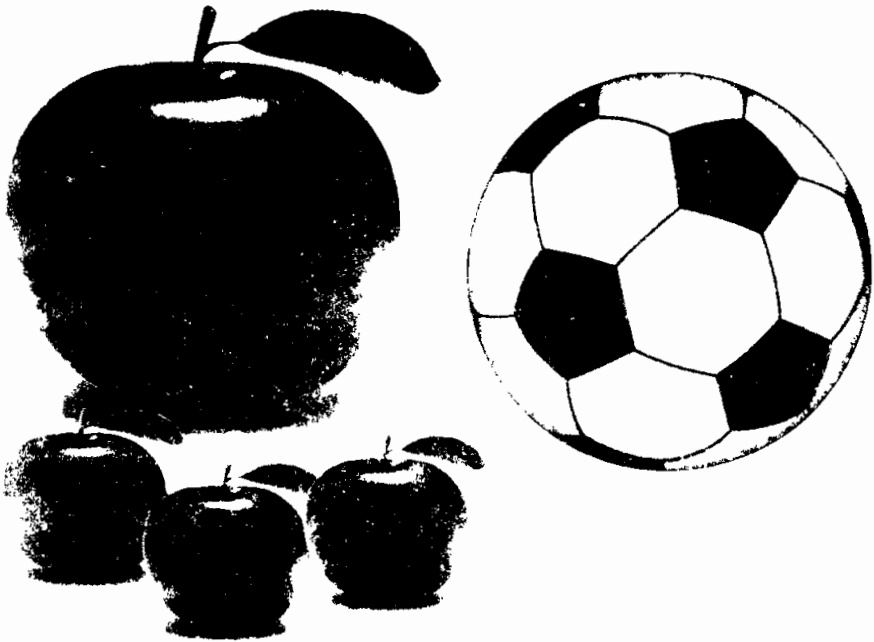
بیٹے کے لیے اس خواہش کی تکمیل بہت آسان تھی۔ اس نے آناً فاناً بہت سارے سیب باپ کی خدمت میں پیش کر دیے اور عرض کیا: آپ جتنے سیب چاہیں کھائیں اور جتنے رکھنا چاہیں رکھیں، جب آپ سیب کھا کر فارغ ہو جائیں گے تو میں اور سیب لا دوں گا کیونکہ میں ہر وہ کام انجام دینے کی ہمت رکھتا ہوں جس کا آپ مطالبہ

فرمائیں گے۔

والد بیٹے کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا:

''اس برتن میں جتنے سیب ہیں، وہ میرے لیے کافی ہیں۔ مجھے مزید سیبوں کی ضرورت نہیں۔ مگر میں سیب یہاں نہیں کھانا چاہتا میں سامنے پہاڑ کی چوٹی پر جانا چاہتا ہوں۔ وہیں یہ سیب کھاؤں گا، لہٰذا میرے بیٹے! اگر تم واقعی میرے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہتے ہو تو مجھے اُس چوٹی پر لے چلو۔''

بیٹے نے باپ کی باتیں سنیں اور اُسے راضی کرنے کی غرض سے حکم کی تعمیل میں جلدی کی۔ اُس نے سیبوں کی ٹوکری ہاتھ میں تھامی، باپ کو کندھے پر بٹھایا اور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ وہاں باپ کو ایک مناسب جگہ بٹھا کر سامنے سیب رکھ دیے اور عرض کیا: والد محترم! اب آپ سیب کھائیے، مجھے آپ کے حکم کی تعمیل کر کے بہت خوشی ہو رہی ہے۔

اب والد ٹوکری سے ایک ایک سیب نکالتا گیا اور چوٹی سے نیچے لڑھکاتا گیا۔ جب ٹوکری خالی ہوگئی تو باپ نے بیٹے سے کہا: نیچے جاؤ۔ اور گرے ہوئے سیب اوپر لے آؤ۔ بیٹے نے حکم کی تعمیل کی۔ نیچے سے سارے سیب اٹھا کر پہاڑ کی چوٹی پر لے آیا اور باپ کے سامنے رکھ دیے۔ والد نے تین دفعہ یہی عمل کیا۔ تینوں دفعہ بیٹے نے باپ کے حکم کے مطابق پہاڑ سے نیچے اتر کر سیب چنے، چوٹی پر پہنچائے اور باپ کے سامنے رکھ دیے۔

چوتھی مرتبہ باپ نے پھر یہی عمل کیا، اب بیٹے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ باپ کی اِس حرکت پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا، مگر زبان پر حرفِ شکایت نہیں

لایا تھا۔ باپ نے بیٹے کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں دیکھ لی تھیں، چنانچہ اُس نے شفقت سے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"جانِ پدر! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جب تم بچپن میں اِسی پہاڑ کی چوٹی سے اپنی گیند بار بار نیچے پھینک دیتے تھے اور میں بار بار تیزی سے نیچے بھاگتا تھا اور گیند واپس لاکر تمھارے ننھے ننھے ہاتھوں میں تھمادیتا تھا۔ میں تمھاری اِس حرکت سے کبھی ملول نہ ہوا۔ نہ مجھے کوئی تھکن محسوس ہوئی، یہ سب کچھ میں تمھیں خوش رکھنے کے لیے کرتا تھا۔"

قارئین کرام! اس واقعے کے مطالعے سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ہم اپنے ماں باپ کے ساتھ چاہے کتنا ہی حسنِ سلوک کریں اور انھیں راضی کرنے کے لیے کتنی ہی قربانیاں دیں، ہم اُن کے احسانات کا بدلہ ہرگز نہیں چکا سکتے۔ آیئے! ہم اپنے والدین کے ساتھ نیکی، بھلائی اور حسنِ سلوک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، اُن کے لیے دعا واستغفار کریں اور ان کے دنیا سے جانے کے بعد ان کے لیے صدقہ جاریہ بنیں۔[1]

[1] دیکھیے کتاب: سعادة الدارين في بر الوالدين، ص: 79,78.

یحیٰی اور عیسیٰ علیہما السلام اپنے ماں باپ کے بے حد فرماں بردار تھے

سیدنا یحیٰی علیہ السلام اپنے والدین کے نہایت فرماں بردار تھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ [1]

''وہ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرنے والا تھا۔ وہ سرکش اور گناہ گار نہ تھا۔''

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے نہایت فرماں بردار تھے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾

''اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا ہے اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں کیا۔'' [2]

---

[1] مریم 14:19۔ [2] مریم 32:19۔

والدہ محترمہ کی یاد میں

1982ء کی بات ہے، مجھے سعودی عرب آئے ہوئے کم وبیش سوا سال گزر چکا تھا۔ یہ سال میرے لیے اس لیے بھی اہم تھا کہ والدہ صاحبہ حج کے لیے تشریف لا رہی آرہی تھیں۔ مسجد الحرام کے بہت سارے دروازوں میں ایک باب ملک [illegible] کے اندرونی حصوں میں ایک مرد درویش حافظ [illegible] نشست لگایا کرتے تھے۔ ہند وپاکستان سے آنے والے بہت سارے علمائے کرام کا مرکز بھی باب [illegible] یہاں قرآن وسنت سے وابستہ علمائے کرام سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ [illegible] بصارت سے محروم تھے مگر دل کی بصیرت سے مالا مال تھے۔ حافظ جی کی پہچان [illegible] ہاتھوں کے لمس ہی سے معلوم ہو جاتا کہ اُن سے کون ہاتھ ملا رہا ہے۔ میری اُن سے پہلی ملاقات برادر عزیز ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی ﷾ کے توسط سے ہوئی تھی، پھر ان سے تعلقات کے مواقع بڑھتے چلے گئے۔ ریاض سے جب بھی عمرہ کے لیے جاتا، پہلے حافظ صاحب کو سلام عرض کرتا۔ والدہ محترمہ دو دن پہلے ہی حج بیت اللہ کے لیے محترم چچا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب اور محترمہ باجی ثریا بتول صاحبہ کے ساتھ تشریف لائی تھیں۔ میں ان دنوں وزارت الدفاع والطیران ریاض میں ملازم تھا۔ بوجوہ ان

کے استقبال کے لیے جدہ نہ جاسکا جس کا ہم دونوں کو ملال تھا۔ یہ بدھ کا دن تھا، وزارت دفاع میں ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد جب ہوائی جہاز کے ذریعہ جدہ اور پھر مکہ پہنچا تو احرام کی حالت میں تھا۔ میں جب سے سعودی عرب آیا تھا ابھی تک والدہ صاحبہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس وقت کہاں قیام فرما ہیں۔

باب بلال کے اندر حافظ فتحی تشریف فرما تھے۔ میں نے نہایت خاموشی سے ان کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ ہاتھوں کے لمس سے معاً پہچان گئے، فرمانے لگے: عبدالمالک! ریاض سے آ گئے۔ تمھاری والدہ ماجدہ حرم کے صحن میں سیڑھیوں پر تمھارا انتظار کررہی ہیں۔ میں بے تابانہ دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ والدہ صاحبہ بیت اللہ کو دیکھ رہی تھیں۔ میں ذرا قریب ہوا تو ماں مامتا کے مارے بے اختیار کھڑی ہوگئیں۔ گلے لگا لیا۔ میں ان کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔ گرد وپیش کے ماحول سے بے نیاز ہم دونوں ماں بیٹا رو رہے تھے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے، اللہ کی حمد وثنا بیان ہورہی تھی۔ وہ فرما رہی تھیں کہ اللہ تیرا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا بیٹا دیا ہے جس نے مجھے حج کے شرف سے مشرف کرادیا ہے۔ میں نے ان سے دعاؤں کی درخواست کی۔ انھوں نے فوراً اپنے ہاتھ اٹھا لیے۔ دیر تک میرے لیے دعائیں مانگتی رہیں اور میں آمین کہتا رہا۔ یہ میرا اُن کے ساتھ پہلا حج تھا۔ اس کے بعد الحمد للہ متعدد بار ان کے ساتھ حج کرنے کی سعادت ملی۔ عمرے تو اتنے ہوئے کہ ان کی تعداد کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

ہر بچے کی طرح میں بھی اپنے والدین کا بڑا چہیتا تھا۔ بچپن سے جوانی تک والدین کی بے پناہ محبت دیکھی۔ ہم تین بھائی تھے۔ ایک مجھ سے بڑے، محمد ایوب سپرا صاحب اور ایک مجھ سے چھوٹے محمد طارق شاہد۔ یوں میں اپنے محترم والدین کا منجھلا

بیٹا تھا۔ ایک بھائی جو مجھ سے چھوٹا اور محمد طارق صاحب سے بڑا تھا بچپن ہی میں وفات پا گیا تھا۔ عموماً والدین کی نگاہ میں سب سے بڑا بیٹا چہیتا ہوتا ہے، یا سب سے چھوٹا بیٹا مگر مجھے یہ صحیح طرح معلوم نہیں کہ ہم میں سے والدین کے نزدیک زیادہ چہیتا کون تھا؟

میرے خیال میں ہر ایک کا دعویٰ یہی ہوگا کہ وہ والدین کا لاڈلا تھا۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں بلاشک و شبہ اپنے والدین کا بڑا لاڈلا تھا۔ میری تعلیم و تربیت اور میری بہترین پرورش میں میرے والدین نے بڑا احسن کردار ادا کیا۔ میں بلاشبہ اپنے والدین کی نہایت عزت کرنے والا اور اُن سے محبت کرنے والا تھا اور آج میں الحمدللہ جس مقام پر کھڑا ہوں وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، میرے والدین کی اعلیٰ تربیت اور ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آج میرے والدین کو مجھ سے جدا ہوئے ایک مدت بیت گئی ہے۔ مگر اُن کی تربیت، اُن کی یادیں اور ان کی باتیں آج بھی لوحِ حافظہ پر چمکتی ہیں اور میرے خیالوں میں اُجالا کر دیتی ہیں۔

اللہ کے فضل سے مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہمارا گھرانہ مذہبی تھا۔ میں نے بچپن میں قرآن کریم اپنی والدہ صاحبہ ہی سے پڑھا۔ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر قرآن کریم ان کو آتا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کتابیں، حافظ بارک اللہ لکھوی کی احوال الآخرت اور زینت اسلام پڑھ لیتی تھیں۔ یہ کتابیں تو اس وقت عموماً عورتوں کو ازبر تھیں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ دوپہر کے وقت چرخہ کاتتیں اور یہ کتابیں ایک دوسرے کو سنایا کرتی تھیں۔ خود مجھے بھی بچپن میں ان کے کچھ اشعار یاد ہو گئے تھے۔ چوتھی جماعت پڑھنے تک میں نے سادہ قرآن کریم پڑھ لیا تھا، پھر والد محترم نے

نہایت محبت سے قرآن کریم کا ترجمہ پڑھانا شروع کیا۔ میں ساتویں جماعت میں تھا، جب ترجمہ ختم ہوگیا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد والد صاحب مجھے اور بھائی جان محمد ایوب صاحب کو سبق پڑھاتے۔ محبت اور پیار اپنی جگہ مگر سبق کے معاملہ میں کوئی معافی نہ تھی۔ گھر کا اصول تھا کہ اگر سبق پڑھ لیا ہے اور ابا جان کو یاد کر کے سنا دیا ہے تو ناشتہ ملتا تھا۔ والد صاحب خطاطی کا کام کرتے تھے۔ خطاطوں کو اس زمانے میں کاتب کہا جاتا تھا۔ والدہ صاحبہ باورچی خانے سے سر نکال کر والد محترم سے پوچھتیں عبدالمالک نے سبق پڑھ لیا ہے؟ جواب اثبات میں ملتا تو ناشتہ مل جاتا ورنہ حکم ہوتا کہ سبق سنادو تو ناشتہ مل جائے گا ورنہ بھوکے سکول جانا پڑے گا۔ ہر چند ایسے مواقع بہت کم آئے مگر یہ خوف ضرور طاری رہتا تھا کہ سبق سنائے بغیر ناشتہ نہیں ملے گا۔

نماز کے معاملہ میں بھی والدین نے کبھی معاف نہ کیا۔ جیسے ہی والد صاحب گھر آتے تو والدہ سے پوچھتے کہ بچوں نے نماز ادا کی ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو پھر فوراً وضو کرنے اور نماز ادا کرنے کا حکم ہوتا۔ ہم سب کے والدین پر اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں ان کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں معاشرے میں بہترین مقام عطا ہوا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اپنے والد محترم کی کمزوری تھا وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے مگر تربیت کے معاملہ میں کوئی معافی نہ تھی۔

میری والدہ کا تعلق راجپوت گھرانے سے تھا۔ دین کے معاملے میں سخت تھیں اور عام معاملات میں نہایت نرم دل تھیں۔ بچپن کی بے شمار باتیں اور واقعات میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں بچپن میں قدرے شرارتی تھا۔ ایک دن میں ترنگ میں تھا۔ میں نے ڈون کی لی۔ اچانک کہہ بیٹھا کہ میں بڑا

''اُچا'' آدمی ہوں۔ والدہ صاحبہ نے سن لیا۔ فرمانے لگیں: یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے سُنی اَن سُنی کردی۔ اب کے قدرے سختی سے فرمایا: میں پوچھ رہی ہوں کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے اپنے الفاظ دہرا دیے۔ فرمانے لگیں کہ جانتے ہو ''اُچے'' کے منہ میں کیا ہوتا ہے۔ (واضح رہے کہ پنجاب میں آگ کے انگاروں کو پکڑنے والے چمٹے کو اُچا کہا جاتا ہے)۔ میں نے پھر توجہ نہ دی۔ اب ان کی آواز بلند ہوگئی: میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ ''اُچے'' کے منہ میں کیا ہوتا ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا: 'آگ'۔ ارشاد فرمایا کہ اب خود سمجھ لو جو ''اُچا'' ہوتا ہے اس کے منہ میں آگ ہوتی ہے۔ اب تمھاری مرضی ہے کہ تم ''اُچا بنو۔''

قارئین کرام! حرم مکی کے صحن میں بیٹھ کر والدہ صاحبہ نے بے حد دعائیں دیں۔ میری بدقسمتی کہ والد محترم کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میری شادی کے دو سال بعد والدہ محترمہ مستقل طور پر سعودی عرب آگئیں۔ پھر ان کا آنا جانا لگا رہا۔ ان کا سعودی عرب میں کبھی دل نہ لگا۔ کئی مرتبہ ویزا کینسل ہوا۔ مگر میری یہ خوش قسمتی رہی کہ وہ مجھ سے راضی تھیں۔

قارئین کرام! مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں آپ کو اپنی کامیابی کے اسرار بتاؤں۔ یقین جانیے میری کامیابیوں کے پیچھے والدین کی دعائیں ہیں۔ میں نے 1976 میں حافظ آباد میں دوآبہ رائس ملز میں سٹور کیپر کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ رات 12 بجے ڈیوٹی ختم ہوتی۔ یہاں سے گھر تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ سردی کی راتوں میں جب سائیکل پر گھر پہنچتا تو رات کے ساڑھے بارہ تو بج ہی جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ والدہ صاحبہ رات کو میرے انتظار میں جاگتی رہتی

ہیں کہ کب عبدالمالک آئے تو میں دروازہ کھولوں۔ رات گئے تک جاگنا ان کی صحت کے لیے مضر تھا۔ میں نے اپنا بستر لیا اور مل کے اندر ہی ایک خیمہ میں سونے کا انتظام کرلیا۔ فجر کی نماز کے بعد گھر جاتا تھا۔ ابا جان اور امی جان بڑی بے تابی سے انتظار کررہے ہوتے تھے۔ ان کو سارے دن کی رپورٹ دیتا اور پھر واپس چلا جاتا۔

میں اُس زمانے میں جمعیت شبان اہل حدیث حافظ آباد کا ناظم تھا۔ اس کے ساتھ دوآبہ رائس ملز ورکرز یونین کا جنرل سیکرٹری بھی تھا۔ بڑی بھرپور زندگی تھی۔ ایک دن والدہ صاحبہ فرمانے لگیں کہ مجھے حج کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اگر تم سعودی عرب چلے جاؤ تو مجھے حج کروا سکو گے۔ مختصری جد و جہد کے بعد میں سعودی عرب آ گیا۔ جیسا کہ دستور ہے ہر نئی جگہ پر شروع شروع میں کچھ آزمائشیں ضرور پیش آتی ہیں۔ پھر اللہ کے فضل سے آدمی اپنی راہ تلاش کر لیتا ہے۔ میرے بھی ابتدائی چند ماہ اِدھر اُدھر خجل خواری میں گزرے، اس دوران میں ہر دوسرے دن والدین کو خط لکھتا تھا جس کے جواب میں والد صاحب بھی بڑی تفصیل سے جواب مرحمت فرماتے تھے۔ وقت کا پہیہ بڑی تیزی سے گردش کرتا رہا۔ تا آنکہ والد محترم رحلت فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد میری شادی ہوئی تو دو سال کے بعد والدہ صاحبہ سعودی عرب آ گئیں۔

اس زمانے میں والدہ کا اقامہ ملنا بڑا مشکل تھا۔ میں وزارۃ الدفاع والطیران کے شعبہ آرمی ایوی ایشن میں ملازم تھا۔ ادارے کے سربراہ سمو الأمیر کرنل فیصل بن محمد بن سعود الکبیر آل سعود تھے۔ وہ مجھے شخصی طور پر بہت پسند کرتے تھے۔ متعدد بار انعام سے نوازا۔ بار ہا ایسا ہوا کہ میرے آفس میں آ کر بیٹھ جاتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ دراصل انھیں خطاطی پسند تھی اور یہ میرا پیشہ تھا۔ ایک دن ان سے والدہ صاحبہ کے ویزے

کی بات کی۔ انھوں نے فوراً ہاں کردی کہ میں خود کوشش کروں گا۔ چند ہفتے گزرے وزارۃ الداخلیہ میں پریزنٹیشن (Presentation) تھی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ درخواست لکھو۔ اب عربی میں کون درخواست لکھے، پھر خود ہی انھوں نے اس کا ڈرافٹ تیار کر کے میرے حوالے کیا اور فرمایا کہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھو۔

قارئین کرام! میں خوش نویس ہوں، میں نے اپنی زندگی کی جو سب سے خوبصورت خطاطی کی، وہ یہی ویزا کی درخواست تھی۔ واقعی موتی پرو دیے۔ سارے دفتر میں ایک دھوم مچی ہوئی تھی کہ عبدالمالک کی والدہ آرہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ صرف میری ہی والدہ نہیں بلکہ پورے دفتر پر ان کی مامتا کا سایہ پڑ رہا ہے۔ ہر شخص ان کی دعاؤں اور خیر مقدم کا متمنی تھا۔ پھر وہ دن آیا جب امیر فیصل کی ملاقات سمو الأمیر نایف بن عبدالعزیز آل سعود سے ہوئی۔ انھوں نے درخواست دیکھی تو کہنے لگے کہ میں نے آج تک اتنی خوبصورت خطاطی نہیں دیکھی۔ اسی وقت درخواست منظور فرمائی۔ اگلے دن ہمارے دفتر میں شور تھا کہ عبدالمالک کی والدہ محترمہ کا ویزا مل گیا ہے۔

عزیزی عکاشہ اس وقت ایک ہفتہ کا تھا جب والدہ صاحبہ ریاض کے ائر پورٹ پر اتریں۔ میں اہلیہ سمیت استقبال کے لیے پہنچ چکا تھا۔ یادش بخیر عکاشہ کی تاریخ میلاد 1407 ہجری ہے۔ والدہ محترمہ نے کہا کہ اپنی اہلیہ کو کیوں لائے ہو چھوٹا سا بچہ اس کی گود میں ہے۔ انھیں اپنی بہو کو معمولی سی زحمت دینا بھی گوارا نہ ہوا۔

والدہ صاحبہ کے آنے کے بعد گویا گھر میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ ان کا پاکستان آنا جانا لگا رہا۔ انھوں نے متعدد مدارس قائم کیے۔ مساجد میں حصہ ڈالا۔ چھوٹے بھائی محمد طارق نے خاصی جدوجہد کے بعد گھر میں فون لگوالیا۔ اس زمانے میں کال اتنی آسانی سے

نہیں ملتی تھی۔ عموماً آدھ گھنٹہ، بعض اوقات پون گھنٹہ تک کال ملاتے رہتے تب جا کر کال ملتی۔ نماز فجر کے بعد قدرے آسانی سے لائن مل جاتی۔ فون پر ان کی ہدایات ملتیں کہ ایسا کر دو۔ فلاں کو اتنا دے دو۔ اسے گندم خرید دو۔ اس کے ہاں چاول ختم ہیں۔ فلاں کی شادی ہے اس کے ساتھ تعاون کر دو۔ اس نے قرآن کریم حفظ کیا ہے اس کو انعام میں گھڑی لے کر دو۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کر رکھا تھا کہ حتی الامکان والدہ صاحبہ کو ''نہ'' نہیں کہنا۔ ہاں اگر کوئی بات میری حیثیت سے بڑھ کر ہوتی تو میں ان سے عرض کرتا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔

میری والدہ کو مساجد اور مدارس بنانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن فون پر فرمانے لگیں کہ مینجر صاحب مجھے ''اتنے'' قرآن چاہئیں (صحیح تعداد یاد نہیں ہے) میں بے اختیار رو پڑا عرض کیا کہ امی جان آپ کیا کہہ رہی ہیں۔

دارالسلام نے کیسے ترقی کی؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں مگر ان میں والدہ صاحبہ کی دعاؤں کا خاص اثر ہے۔ جب فون پر احکام دیتیں تو مجھے بڑا مزا آتا۔ میں مسکراتا رہتا، دعاؤں کے لیے کہتا رہتا۔ فون پر جب وہ بات شروع کرتیں تو میں پیار سے کہتا کہ اب شاہی آرڈر جاری ہونے لگا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے خاصے زیادہ مطالبات تھے جو الحمد للہ میں نے پورے کر دیے۔ فون کیا تو اس روز انھوں نے بے شمار دعائیں دے ڈالیں۔ میں نے فون بند کیا تو اہلیہ سے کہا: انیسہ! آج ہمارے ہاں خیر و برکت کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ کہنے لگی کیسے؟ میں نے کہا کہ والدہ صاحبہ پہلے بھی ہم سے بڑی خوش تھیں مگر آج جتنی اور جس انداز میں دعائیں ملی ہیں پہلے کبھی نہیں ملیں۔

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں دفتر پہنچا تو وزارۃ مذہبی امور سے فون آ گیا۔ ہم نے

ایک مدت پہلے قرآن کریم کے تراجم کی طباعت کی کوٹیشن دے رکھی تھی۔ کم وبیش چوبیس لاکھ ریال کا پراجیکٹ تھا۔ ہوسا اور بوسنیا زبان میں قرآن کریم کے تراجم شائع ہونے تھے۔ یہ منصوبہ وزارتِ مذہبی امور کے زیر اہتمام تھا۔ مالی تعاون پرنس ولید بن طلال آل سعود کا تھا۔ میں واقعی بھول چکا تھا کہ ہم نے ایک مدت پہلے کوٹیشن دی تھی۔ بہر حال وزارۃ سے برادرم محمد الزیر نے مبارک باد دی اور مجھے فوری طور پر دفتر پہنچنے کا کہا۔ اس طرح ایک عظیم پراجیکٹ پر دارالسلام نے کام شروع کر دیا اور ہم پر خیر و برکت کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

انھوں نے میری اہلیہ کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ دعا دی: ''شالا تم سات بیٹوں کا منہ دیکھو'' ہمارے یہاں پنجاب میں عموماً بزرگ خواتین اپنی بہو، بیٹیوں کو اسی قسم کی دعائیں دیتی ہیں۔ والدہ صاحبہ کی دل سے نکلی ہوئی دعا پوری ہوئی اور الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے سات بیٹوں سے نوازا۔ ان میں ایک بیٹا عبید اللہ بچپن ہی میں فوت ہوگیا۔ میرے علم کی حد تک میرے پورے خاندان میں کسی کے بھی چھ بیٹے نہیں، یہ میری خوش قسمتی رہی کہ والدین مجھ سے بے حد راضی رہے۔ میں بھی ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ آج الحمد للہ میں جس مقام پر ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد والدین کی دعاؤں کی بدولت ہوں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میری اولاد بھی میری بے حد عزت کرتی ہے ۔ میں الحمد للہ ہر روز والدین کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ والدین کی بہترین تربیت کا نتیجہ آج میں اپنی زندگی میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

ماں کو ستانے کا بھیانک انجام

وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی عمر بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی آنکھوں کا تارا، اللہ کے بعد اس کی امیدوں کا مرکز صرف وہی بیٹا تھا۔ اس کی پرورش کے لیے نجانے اُس نے کون کون سے مشکل ترین کام اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ وہ محنت مشقت کر کے روزی کماتی تھی۔ وہ بیٹے کی خاطر لڑکیوں کے ایک تعلیمی ادارے میں بطورِ چپڑاسی کام کرنے لگی۔

اَب اس کا بیٹا ہائی اسکول میں پہنچ چکا تھا۔ امتحان سر پر تھا۔ ماں، بیٹے سے کہیں زیادہ اس کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہی تھی اور پھر ماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، جب اُس نے سنا کہ بیٹا کالج میں داخل ہو چکا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیٹا تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا رہا۔ کالج میں تعلیم

مکمل کرنے کے بعد اُس نے یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ڈگری کے کاغذات لاکر ماں کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ماں کی مسرت کا کیا کہنا۔ وہ تو برسوں سے محنت مزدوری کر کے بیٹے کو پڑھا لکھا رہی تھی۔ آج وہ بیٹا یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ واقعی ماں کے لیے یہ عظیم خوشخبری تھی۔ ایک دن اس نے خوشی سے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا:

بیٹا! میں نے تمھارے تعلیمی زمانے ہی میں تمھاری ماموں زاد سے شادی کا وعدہ کرلیا تھا۔ اِس بات سے تم بھی بخوبی واقف ہو۔ وہ لڑکی بھی کئی برسوں سے تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ تمھاری اعلیٰ تعلیم اور کامیابی کے لیے برابر دعائیں مانگتی تھی۔ اَب ایک طویل انتظار کے بعد وقت آ گیا ہے کہ میں تمھاری شادی تمھاری ماموں زاد سے کر دوں

''اررر...... ے! یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماں؟'' بیٹے نے ماں کو گھورتے ہوئے کہا۔

اُس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ بڑے سخت لہجے میں کہہ رہا تھا:

''میں ایسی لڑکی سے شادی ہرگز نہیں کر سکتا جو اَن پڑھ، جاہل اور گنوار ہو۔ میں ماموں زاد سے قطعاً شادی نہیں کر سکتا۔

اِس بات کی خبر جب اُس لڑکی کو ملی جو برسوں سے شادی کے انتظار میں بیٹھی تھی تو شدتِ غم سے اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اپنے ہونے والے شوہر کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم سے اس کے چہرے پر خوشی کے جو چار چاند لگے تھے وہ یک لخت بُجھ گئے۔ شادی کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ پھر اس کی زندگی آنسوؤں کی برسات ہو کر رہ گئی۔

ماں نے بڑے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے بیٹے کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ

اُس کی باتیں اسے کس قدر ناگوار گزری ہیں۔ بیٹے کی شادی کا موضوع بس یہیں دب گیا۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ بیٹا شہر کی ایک کمپنی میں اچھی ملازمت کے حصول میں کامیاب ہوگیا۔ اُس نے ماں سے کہا کہ ہم گاؤں کا گھر بیچ کر شہر چلتے ہیں کیونکہ میری نوکری شہر ہی میں لگی ہے۔

ماں کے پاس 'ہاں' کے علاوہ اور کیا جواب ہوسکتا تھا۔

بیٹا اپنی ماں کے ساتھ شہر پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس نے ایک خوبصورت سا گھر خریدا۔ دستاویز لکھی جا رہی تھی۔ ماں بھی پاس بیٹھی تھی۔ دستاویز لکھنے والے مختار نے پوچھا: گھر کس کے نام سے رجسٹری ہونا ہے؟ ''میرے نام سے اور کس کے نام سے۔'' بیٹے نے جھٹ جواب دیا۔ اُس نے ماں کی طرف دیکھنے اور اُس کی رائے معلوم کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔

شہر کے جس گھر میں وہ رہائش پذیر تھا، قریب ہی ایک پڑوسی کے گھر میں ایک حسین وجمیل لڑکی رہتی تھی۔ گھر سے باہر جاتے آتے بسا اوقات اس سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔

ایک روز دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے اُس نے ماں کے سامنے اپنی شادی کی بات رکھی اور کہنے لگا: امی جان! میں نے معلوم کیا ہے کہ سامنے جو پڑوسی کا گھر ہے، اُس میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ اس کے والدین خاندانی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ لڑکی پڑھی لکھی اور سلیقہ دار ہے۔ نئی تہذیب اور پرانی ثقافت کا سنگم ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اُس سے شادی کرلوں؟

ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ وہ آخری دَم تک اپنی اولاد کی خیر خواہی چاہتی ہے۔ اس

نے بیٹے کی خواہش کی تائید کی اور اِس رشتے کو اُس کے لیے ایک مبارک اور خوبصورت رشتہ قرار دیا۔

بیٹا: امی جان! پھر آپ رشتے کے لیے پڑوسی کے ہاں جائیں نا۔

ماں: ہاں بیٹا! میں تمھارے لیے پڑوسی کے گھر لڑکی کا رشتہ مانگنے جا رہی ہوں۔ امید ہے کہ یہ رشتہ انھیں ضرور پسند آئے گا۔

رشتے کی بات پکی ہو چکی تھی۔ لڑکی والوں کو لڑکا پسند آ گیا کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بہت اچھی ملازمت کر رہا تھا۔ جبکہ لڑکے کو لڑکی پہلے ہی سے پسند تھی، چنانچہ فوراً شادی ہوگئی۔ ماں اپنے بیٹے کی شادی کا برسوں سے انتظار کر رہی تھی۔ اگرچہ بیٹے نے اُس کا طے کیا ہوا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی متمنی تھی کہ اپنے آنگن میں بچوں کے چہکنے کی صدائیں سُنے اور وہ دن بھی آ گیا جب بیٹا ایک بچے کا باپ بن گیا۔

ماں کا معمول تھا کہ وہ دن بھر اپنے ننھے پوتے کو سینے سے لگائے رکھتی، اسے پیار کرتی، جھولا جھلاتی اور سوتے وقت اُسے اُس کے ماں باپ کے حوالے کر دیتی۔ دادا دادی کا پیار بھی کتنا نرالا ہوتا ہے؟ شاید اسی لیے تو بچے دادا دادی کی زندگی میں انھیں ہی اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلا۔ مگر اس گھر میں پیار محبت کی روشنی زیادہ دیر تک نہیں رہی۔

بہو تھی تو خوبصورت مگر سیرت کے اعتبار سے اچھی نہیں تھی۔

ایک دن اُس نے شوہر کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیا:

”تمھاری ماں کی وجہ سے میری زندگی جہنم بن گئی ہے۔“

یہ بڑا سخت جملہ تھا۔ بیٹا دَم بخود رہ گیا۔ وہ چپ نہ رہ سکا۔ فوراً پوچھا:

''اس جملے سے تمھارا مقصد؟''

بیوی نے بلا جھجک کہہ دیا:

''یا میں اس گھر میں رہوں گی یا تمھاری ماں!''

وہ بولا: ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ تو میری ماں ہے۔''

ہاں میں جانتی ہوں کہ وہ بڑھیا تمھاری ماں ہے اور میری ساس! مگر کیا تمھارے نزدیک وہ مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے؟ کیا میں تمھاری شریکِ حیات نہیں ہوں؟ بتاؤ! تمھارے حق میں ہم میں سے زیادہ فائدہ والی کون ہے؟

شوہر نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا:

''تمھاری ناراضی مجھے قطعی پسند نہیں، تھوڑا صبر سے کام لو، یہاں تک کہ مجھے کوئی راستہ سجھائی دے۔''

ماں کا معمول بن گیا تھا کہ وہ اپنے پوتے کی بہت خدمت کرتی، اسے نہلاتی دھلاتی، کھلاتی پلاتی اور اُسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ صرف بچے ہی کی نہیں بلکہ بہو کی بھی خدمت کرنے میں پیش پیش رہتی، البتہ پوتے کے ساتھ اس کی محبت اور پیار کا عالم یہ تھا کہ ماں بھی اِس معاملے میں دادی سے پیچھے رہ گئی۔

شوہر کو اس نے ماں کے خلاف اتنا بھڑکایا اور ورغلایا کہ وہ بھی ماں سے نالاں ہوگیا۔ اُس نے ماں سے حقیقتِ حال معلوم کرنے کی بھی زحمت نہیں کی، اُس نے ماں سے اتنا سخت رویہ اپنایا کہ وہ بے حد آزردہ رہنے لگی، چنانچہ وہ ایک دن اپنے قریبی رشتے دار کے ہاں چلی گئی۔

دن گزرتے رہے۔ ماں کی اندرونی کیفیت یہ تھی کہ اسے پوتے کی یاد ستاتی تھی۔ ایک دن اسے گمان ہوا کہ مجھے گھر سے آئے ہوئے کئی ہفتے ہو چکے ہیں، ممکن ہے اب بیٹا اور بہو بھی مجھے دیکھنے کی خواہش کر رہے ہوں، چنانچہ وہ رشتے دار کے گھر سے اجازت لے کر اپنے گھر روانہ ہوگئی۔ یہ سخت گرمی کا دن تھا۔ ماں پیدل چل کر اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی۔ دستک دی۔ اندر سے کسی کی آواز نہ آئی۔ اُس نے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا۔

اچانک دروازہ کھلا۔ سامنے بہو کھڑی تھی۔ وہ چیخ کر بولی:

''اچھا! تو یہ تم ہو جو بار بار دستک دے کر ہمارے آرام اور سکون کو برباد کر رہی ہو۔ کیوں آئی ہو؟...... کیا چاہتی ہو؟ ہم اچھے بھلے زندگی گزار رہے تھے، تم پھر ہماری زندگی میں رخنہ اندازی کے لیے آ گئی ہو۔''

''بیٹی! تمھاری زبان سے میں یہ کیا سن رہی ہوں؟ میں تو تمھیں دیکھنے کے لیے آئی ہوں۔''

بہو کہنے لگی: ''مگر ہم تمھیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔''

اتنے میں بیٹا گھر سے نکلا اور کوفت محسوس کرتے ہوئے ماں کو گھر میں لے گیا۔ بیوی کی باتیں اس نے بھی سنی تھیں۔

''ماں! کس لیے چلی آئی ہو؟''

بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی ماں کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

''امی جان! آپ شاید کچھ کہہ رہی ہیں؟''

''نہیں نہیں، میں کچھ نہیں کہہ رہی بیٹا۔ میں کیوں تمھیں کچھ کہنے لگی، البتہ سوچ رہی تھی......۔''

''کیا سوچ رہی تھیں؟'' بیٹے نے جلدی سے پوچھا

''میں سوچ رہی تھی کہ اَب مجھے کہاں جانا چاہیے۔'' ماں نے کہا

بیٹا فوراً بیوی کے پاس گیا اور چند منٹ بعد ماں سے آ کر کہنے لگا:

''امی جان! ایسا کرتے ہیں کہ ہمارے ایک جاننے والے ہیں، ہم سب اُن سے ملاقات کے لیے چلتے ہیں۔ بہت دن ہو گئے اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

''جب تم لوگ چلنا چاہتے ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔'' ماں نے جواب دیا۔

اب وہ گاڑی میں بیٹھ کر جا رہے تھے۔ گاڑی سڑک پہ دوڑتی ہوئی اُس جانب رواں دواں تھی جہاں بوڑھے لوگوں کا گھر ہے۔ گاڑی اولڈ ہاؤس کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ بیٹے نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور اولڈ ہاؤس میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ ماں کو احساس تک نہ ہوا کہ وہ کہاں آ گئی۔ اسے اُس وقت معلوم ہوا جب بوڑھے لوگوں کے گھر میں اُس کا نام رجسٹر میں درج ہو گیا۔

ماں کے دل پر کیا گزری؟ اِس سے قطع نظر ہم اِس واقعے کے نتیجے کی طرف چلتے ہیں۔ بیٹا ماں کو اولڈ ہاؤس میں چھوڑ کر بیوی بچے کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ بچہ دادی کی یاد میں رونے لگا۔ 'میری دادی کہاں ہے؟ میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں، تم مجھے میری دادی کے پاس پہنچا دو۔ دادی، دادی، دادی!!' مگر معصوم بچے کی فریاد سے بھی بیٹے اور بہو کا دل نہیں پسیجا اور بے چاری ماں اولڈ ہاؤس کی چار دیواری میں اندر ہی اندر غم کی بھٹی میں سُلگ سُلگ کر مرنے لگی۔

آج میاں بیوی بڑے خوش تھے۔ بیوی نے شوہر کو اپنی ایک سہیلی سے ملاقات کے لیے تیار کیا۔ دونوں اپنے ننھے بچے کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر سہیلی کے گھر چل دیے۔ بیٹا اسٹیرنگ پہ ہاتھ رکھے آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گاڑی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کے افسردہ چہرے کے عکس رہ رہ کر ابھر اور ڈوب رہے تھے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں ساتھ بیٹھی ہوئی بیوی کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ ''رکو! رکو! بریک لگاؤ!'' ابھی اس کے منہ سے یہ الفاظ پوری طرح ادا بھی نہ ہو پائے تھے کہ اس کی گاڑی آناً فاناً آگے جاتے ہوئے ٹرک کے نیچے آکر دب گئی۔

بیوی نے جائے حادثہ ہی پر دم توڑ دیا۔ شوہر کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے وہ اپاہج ہو گیا، البتہ ننھا بچہ بالکل صحیح سالم رہا۔ بیٹا بسترِ مرض پر زیرِ علاج تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا:

''ماں.. کہاں ہے میری ماں ... میری ماں کو بوڑھوں کے گھر ''اولڈ ہاؤس'' سے نکال لاؤ۔''

ماں کو اِس حادثے کی اطلاع دی گئی۔ اُسے اتنا شدید قلق ہوا کہ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے بے قرار ہو کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور کہنے لگی:

''بیٹے! تجھے اللہ تعالیٰ شفا بخشے....'' [1]

---

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب: حوادث واقعیة (جلد اول)، تالیف: محمد عبد العزیز الحمیدی۔

والدین کو راضی رکھنے کے چند اور اصول

(2)

والدین کو راضی کرنے کے چند اور اصول

والدین کو اگر آپ راضی اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو اُن کے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کیجیے۔ صِلہ رحمی اسی کا نام ہے کہ والدہ محترمہ یا والد گرامی کے رشتہ داروں اور عزیز واقارب کے ساتھ ملاقات کریں، ان کی عزت کریں، اُن کو محبت آمیز خوبصورت القاب سے مخاطب کریں۔ جیسے چچا جان، خالو خان، ماموں جان وغیرہ۔

ہمارے ہاں تو یہ بات بڑی عام ہے کہ والد کے جتنے رشتہ دار ہیں اُن سب کو چچا یا انکل کہتے ہیں اور جتنی خواتین رشتہ دار ہیں ان کو پھوپھی یا آنٹی کہتے ہیں۔ اسی طرح والدہ کے رشتہ دار مرد کو ماموں اور خواتین کو خالہ کہا جاتا ہے۔ اب تو حالات بدلتے جارہے ہیں ورنہ ہمارے بچپن میں اپنے علاقے کی اگر کوئی لڑکی کسی دوسرے شہر یا بستی میں دلہن بن کر جاتی تھی تو اسے سب اپنی بہن اور بیٹی سمجھتے تھے۔ اُس کے حقوق کا پاس کرتے تھے۔ بہرحال صلہ رحمی اِسی کا نام ہے کہ والدین کے رشتہ داروں سے محبت، عزت وتکریم سے پیش آئیں اور ان کو حتی الامکان تحائف سے نوازتے رہیں۔

والدہ کے کمرے میں اگر الماری موجود ہے یا کوئی صندوق پڑا ہے تو وہاں بچوں

کے لیے ٹافیاں، بسکٹ کھلونے وغیرہ رکھ چھوڑیں۔ جب ان کی نواسیاں نواسے، پوتے پوتیاں یا قریبی رشتے داروں کے بچے ملنے کے لیے آئیں گے تو وہ ان کو یہ ٹافیاں اور کھلونے دیں گی۔ اس سے بچوں اور دادی اور نانی کے درمیان محبت اور پیار کا رشتہ مزید گہرا اور مضبوط ہو جائے گا۔ وہ ان کی مزید عزت کرنے لگیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے بچپن میں بڑی بوڑھی عورتوں نے لڈو، گڑ اور چنے وغیرہ چھپا کر رکھے ہوتے تھے۔ اُن سے ملنے کے لیے جاتے تو وہ ہمیں پیش کرتیں۔ یہ لذتیں اب ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ مگر ان رویوں اور رواجوں کو دوبارہ بحال کرنا چنداں مشکل نہیں۔ اب تو پہلے کے مقابلے میں وسائل بہت زیادہ موجود ہیں۔

آپ کے والدین کسی دوسرے شہر میں سفر کے لیے روانہ ہورہے ہیں تو کوشش کریں کہ آپ کو ان کی رفاقت حاصل ہو تاکہ آپ ان کی خدمت کرسکیں۔ بصورت دیگر اس بات کا اہتمام کریں کہ فون کے ذریعہ ہر روز ان کی خیریت دریافت کریں۔ یہ عمل ان کے لیے باعث اعزاز بھی ہوگا۔ وہ جن کے ہاں مقیم ہیں انھیں وہ بڑے فخر سے بتائیں گے کہ ہمارا بیٹا ہمارا کتنا خیال رکھتا ہے ہم سے کتنی محبت کرتا ہے کہ دن میں کئی بار فون کرکے ہماری خیریت دریافت کرتا ہے۔

ممکن ہے کہ کسی وقت آپ کو خدانخواستہ کوئی صدمہ پہنچ جائے، کوئی حادثہ ہو جائے یا کوئی غم کی خبر ہو تو اس صورت میں والدین کو یہ خبر بڑے محتاط انداز میں صبر وتحمل کے ساتھ دیں۔ اُن سے کہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان شاء اللہ اس کام میں بھی خیر ہوگی۔ آپ مطمئن رہیں۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی اس مشکل کو آسان کردیں گے۔ بس آپ دعا کریں۔ کوشش کریں کہ ان کے سامنے صدمہ کی خبر بھی عام انداز میں بیان

کردی جائے۔

فرض کیجیے آپ کی اپنی اہلیہ سے اَن بَن ہوگئی ہے۔عموماً گھروں میں ایسا ہوجاتا ہے کہ میاں بیوی میں اختلاف ہوجاتا ہے۔اس صورت میں اپنے والدین کوحتی الامکان اس ناچاقی کے بارے میں نہ بتائیں۔آپ اُن کے دل کا ٹکڑا ہیں اگرآپ ذرا سا بھی پریشان ہیں تو وہ آپ سے کہیں زیادہ پریشان ہوں گے، اس لیے آپ پوری کوشش کریں کہ آپ کی ازدواجی زندگی کے اختلافات اور رنجشوں کا علم والدین کو نہ ہونے پائے۔اختلافات اور مسائل کو میاں بیوی اپنے طور پر خود حل کریں۔

اپنی والدہ کے سامنے اپنی بیوی کی غیرضروری تعریف نہ کریں۔ والدہ کو غیرضروری باتیں بتانے کی بالکل ضرورت نہیں کہ میں نے اپنی بیوی کو کیا خرید کر دیا ہے یا اس نے مجھے کیا دیا ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ شادی سے پہلے آپ اپنی والدہ کے بے حد قریب تھے۔آپ کے ہر معاملہ اور مسئلہ میں والدہ شریک ہوتی تھی۔اب اچانک ایک خاتون بیوی کی حیثیت سے آپ کی زندگی میں داخل ہوئی ہے وہ آپ اور آپ کے والدین کے درمیان حائل ہوگئی ہے۔فطری بات ہے کہ پہلے جو وقت آپ اپنی والدہ کو دیتے تھے اب اس میں کمی آگئی ہے۔کوشش کریں کہ والدہ اور اہلیہ دونوں کے حقوق ادا ہوں۔ ان کے درمیان محبت، پیار، الفت اور احترام کا رشتہ قائم کریں۔ دونوں کو مناسب وقت دیں' والدہ کو یہ احساس نہ ہونے دیں کہ بیٹے کی شادی کے بعد ان کا حق گھٹ گیا ہے یا اس میں کوئی شریک ہوگیا ہے۔بہن بھائیوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو مزید بہتر بنائیں۔ اگر کبھی آپ اوز آپ کے بہن بھائیوں کے مابین کوئی اختلاف رُونما ہوتو اسے اپنی والدہ کے سامنے ظاہر نہ کریں۔

اگر والدین کی دینی تعلیم زیادہ نہیں ہے تو آپ پر ذمہ داری کا بوجھ بڑھ جائے گا، لہٰذا ان کے ساتھ بڑی حکمت، نہایت سوجھ بوجھ اور سمجھداری سے پیش آئیں۔ ان کی خدمت خوش اسلوبی سے جاری رکھیں۔ ان کو یہ احساس نہ ہونے دیں کہ ان کو تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ آپ کو ان کی علمی کمی بڑی احتیاط اور احترام سے پوری کرنی چاہیے۔ کبھی ان کی خدمت میں صحیح دینی معلومات کی کوئی عمدہ کتاب پیش کریں اور کبھی کسی عالمِ حق کی تقریروں کی کیسٹیں سنوادیں۔ کہیں دینی درس وتدریس کی مجلس ہو تو انھیں سہولت سے وہاں لے جائیں۔ تاکہ وہ دینی تعلیم حاصل کر کے اپنی علمی کمی دور کرلیں۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ایک موقعہ حج وعمرہ کا بھی ہے۔ آپ اس عظیم رکن کی ادائیگی کے لیے اُن کے ساتھ جائیں۔ دورانِ سفر آپ ان کے غلام بن جائیں۔ حج کی ادائیگی بڑا مشکل کام ہے خصوصاً عورتوں کے لیے تو یہ جہاد ہے۔ آپ ان کے حقیقی محافظ بن جائیں۔ قدم قدم پر ان کی رہنمائی کریں۔ اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ آپ ان کے حقیقی فرماں بردار بیٹے ہیں۔ اس عظیم موقع کو اپنے لیے غنیمت جانیں اور اپنی نیکیوں میں اضافہ کریں۔

اگر کوئی صدمہ والی خبر آجائے تو اسے والدین کو اچانک نہ سنائیں۔ بلکہ موقع محل کا لحاظ رکھ کر مناسب وقت پر محتاط الفاظ میں سنائیں۔ کوشش کریں کہ کوئی بُری خبر ہو تو اس سے آگاہ کرنے کے لیے خود ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان کو نہایت ادب سے سلام کریں۔ پھر ان کے پاس بیٹھ جائیں۔ گفتگو کا آغاز کریں تو صبر کی اہمیت اور اسلام میں صبر کرنے والوں کے زبردست اجر وثواب کے حوالے سے گفتگو کریں۔ جب آپ محسوس کریں کہ وہ ذہنی طور پر بُری خبر سننے کے لیے تیار ہوگئے ہیں تو پھر ان

کو اس خبر یا واقعہ سے آگاہ کریں۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ کبھی بوڑھا ہونا یا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ مرد ہو یا عورت وہ اپنے بارے میں اچھے کلمات، اچھے القاب سننا ہی پسند کرتا ہے۔ والدین کے لیے آپ ہمیشہ اس قسم کے کلمات ادا کریں، ماشاء اللہ ابھی تو آپ جوان ہیں۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں، آپ شکل وصورت کی زیبائی سے اپنی عمر سے کہیں کم عمر نظر آتے ہیں۔ آج تو آپ بالکل تندرست ہیں آپ کی آواز سُن کر بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔ اس قسم کے حوصلہ افزا جملے بڑے بوڑھوں اور بیماروں کو بھی تندرست وتوانا کر دیتے ہیں۔

یادش بخیر 1986ء میں، مجھے پہلی مرتبہ شام کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ وہاں ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ دو سعودی احباب بھی ہمراہ تھے۔ ہم اس گاؤں کے چوہدری صاحب کے مہمان تھے۔ پنجاب میں جس طرح چوپال بنے ہوتے تھے بالکل اسی طرح کا بڑا سا کمرہ تھا جس میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں پڑی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ چوہدری صاحب کے ہاں سعودی عرب سے مہمان آئے ہیں تو وہ ہم سے ملنے کے لیے جوق درجوق آنے لگے۔ ان میں ستر، اسی سالہ بوڑھے بھی تھے۔ جیسے ہی وہ داخل ہوتے کوئی نہ کوئی ان سے کہہ دیتا، ماشاء اللہ شباب داخل ہوا ہے۔ بس شباب کا کلمہ سننے کی دیر ہوتی تھی کہ بوڑھوں کے سرخی مائل چہرے مزید سرخ ہوجاتے۔ واضح رہے کہ شامی بڑے خوبصورت اور سرخ وسفید چہروں کے مالک ہوتے ہیں۔

یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بچوں کی طرح والدین بھی اپنی تعریف سننا

پسند کرتے ہیں۔ اگر انھوں نے کوئی اچھا لباس پہن رکھا ہے تو آپ ان سے کہیں کہ یہ کپڑا آپ پر بہت سجتا ہے، پھر دیکھیں کہ ان کو کتنی خوشی ہوتی ہے۔ والدین کی پسند کا کوئی شعر، کوئی مصرع ان کے سامنے بولیں۔ اگر آپ کی آواز اچھی ہے اور آپ خوش آوازی سے اشعار پڑھ لیتے ہیں تو ان کے سامنے اچھے اشعار پڑھیں۔ والدین کو اپنی اولاد کی آواز بھی بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے اپنا بچپن یاد ہے۔ جب میں والدین کے سامنے اشعار پڑھتا تھا تو انھیں بے حد مسرت نصیب ہوتی تھی۔ ذرا بڑے ہوئے تو کوشش ہوتی تھی کہ حسنِ مزاح کی کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیں جس سے وہ مسکرا اٹھیں۔ الغرض والدین کو قطعاً یہ احساس نہ ہونے دیں کہ وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ بلکہ اُن کو یہی احساس دلائیں کہ وہ بالکل تندرست اور توانا ہیں۔

والدین کے سامنے دوسرے لوگوں کے بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے زیادہ گفتگو نہ کریں کہ فلاں کا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، یا اُس کی تربیت بڑی عمدہ ہوئی ہے۔ ہماری تعلیم یا تربیت اس طرح نہیں ہوسکی۔ اس گفتگو سے ان کے دل میں یہ بات آسکتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلوا سکے یا ہمارے بچے ہماری تربیت سے مطمئن نہیں ہیں۔ والدین کے پاس بیٹھیں تو ان سے مسکراتے چہرے سے گفتگو کریں۔ کبھی کبھار مذاق کی نوبت بھی آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ انھیں کبھی کوئی خوبصورت واقعہ کبھی کوئی سچا لطیفہ یا کوئی اچھا سا شعر سنادیں۔ اس طرح گھر کے ماحول کو عمدہ بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ملکی یا عالمی حالات کے حوالے سے ان سے بات چیت کریں، کوئی اہم خبر ہو تو ان کو ضرور بتائیں۔ اس پر خود بھی تبصرہ کریں اور ان کے تاثرات بھی معلوم کریں۔ بعض لوگوں کے والدین بہت پڑھے لکھے ہوتے ہیں،

ان کے علمی اور عملی تجربات سے فائدہ اُٹھانے کا یہ بہترین موقع ہوتا ہے۔ اُن سے خوب استفادہ کریں۔ ان سے درخواست کریں کہ وہ اپنے تجربات کے حوالے سے، اپنے وسیع مطالعہ کی روشنی میں بتائیں کہ ہمیں موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ والدین کو اس بات سے بے حد خوشی ہوئی ہے یوں وہ آپ کے مزید قریب ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رہنی چاہیے کہ ہر والد کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اس سے آگے بڑھے۔ وہ آپ سے کوئی چیز نہیں چھپائیں گے۔

اپنی گفتگو میں بار بار اس بات کا تذکرہ کریں کہ ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے والدین کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہیں۔ اس سے والدین کے دل کو سرور ملے گا۔ وہ یہ محسوس کریں گے کہ ہم نے اپنی اولاد کی جو تربیت کی ہے اس کے خوشگوار نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

راقم الحروف کے ذاتی تجربہ کی بات ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے حلال رزق کے حوالے سے بات چیت کی اور ان سے کہا کہ سود کا پیسہ کبھی استعمال نہیں کرنا۔ نمازوں کی ادائیگی کا التزام سے اہتمام کرنا، کسی کو دھوکہ نہ دینا۔ میری یہ نصیحت سن کر میرے لاڈلوں نے جواب دیا: ابو! آپ نے ہماری جو تربیت کی ہے ان شاء اللہ اس کی روشنی میں ہم آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائیں گے، پھر کئی موقعوں پر انھوں نے اس بات کو دہرایا۔ مجھے ان کے ان الفاظ سے جو خوشی ہوئی اس کی ٹھنڈک میں آج بھی اپنے سینے میں محسوس کرتا ہوں۔

آج جب میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ اولاد اچھی تربیت کے نتیجے میں اعمالِ صالحہ کی بہار والدین کی زندگی ہی میں پیش کرتی ہے تو اس سے ان کو بے حد خوشی نصیب ہوتی ہے۔ یہ بات ہمیں تسلیم کرنا ہوگی کہ ہم جو کچھ بھی

ہیں والدین کی بہتر تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہیں۔ تمام والدین اپنے وسائل کے مطابق اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ امیر ہوں یا غریب اپنے وسائل اور حالات کے مطابق تمام والدین اپنی اولاد کے لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ ان کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ ہماری اولاد آگے نکل جائے، ہمارے بچے اچھی تعلیم حاصل کریں، ان کا مستقبل سنور جائے اور وہ عظیم انسان بن جائیں۔ اب جبکہ آپ جوان ہیں اور وہ بوڑھے ہوچکے ہیں، ایسے وقت میں ان کی تربیت، ان کی محنت اور ان کی قربانیوں کا اعتراف کرنا والدین کے لیے بے شمار خوشیوں کا باعث ہوتا ہے، اس لیے والدین کے سامنے ان کی تمام قربانیوں کا اعتراف کریں۔ اس بارے میں ہرگز کسی بخل سے کام نہ لیں۔

جیسی نیت ویسی مراد

یہ قصہ سرزمینِ مصر میں بچوں، بوڑھوں اور جوانوں سبھی کی زبان پر عام ہے۔ آپ کو جس بستی میں بھی جانے کا اتفاق ہوگا وہاں کے لوگ اِس واقعے کو ضرور جانتے ہوں گے جسے میں بیان کرنے والا ہوں۔ یہ قصہ ملک مصر ہی کا ہے۔ کسی زمانے میں وہاں ایک خاندان کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اور بعد کے لوگوں کے لیے درسِ عبرت بن گیا۔ قصہ واقعی بہت موثر اور عبرت والا ہے۔ آپ بھی غور سے پڑھیں اور اپنا جائزہ لیں کہ کہیں آپ بھی ایسی اولاد تو نہیں ہیں جنھیں اپنے والدین سے نہیں بلکہ اُن کی دولت سے محبت ہوتی ہے۔ واقعہ ملاحظہ فرمائیں:

مصر میں ایک آدمی کے تین بیٹے تھے۔ اس کے پاس مال ودولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اسے احساس ہونے لگا کہ اس کا کوئی بیٹا اس کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر رہا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنے مال کو اپنے بچوں میں تقسیم کر دے تاکہ یہ اُس سے کمائیں کھائیں اور اِس احسان کے بدلے میں اُس کی خدمت کریں۔ اُس نے اپنی بیوی سے مشورہ لیا تو اُس نے بھی بوڑھے شوہر کے خیال کی

تائید کی، چنانچہ ایک دن اُس نے ایک مختصر سی میٹنگ رکھی اور اپنے تینوں بیٹوں کو بلوایا۔

جب تینوں بیٹے اس کے پاس حاضر ہو گئے تو اُس نے کہا:

"میرے بیٹو! تم سب جانتے ہو کہ میں نے اپنی جوانی کمانے میں خرچ کر دی۔ میں نے اپنے پیسے سے تم تینوں کی اچھے گھرانوں میں شادی بھی کر دی ہے۔ اب میں بوڑھا ہو چلا ہوں۔ میری طاقت جواب دے چکی ہے، میں تجارت کے لیے مارکیٹ میں نہیں نکل سکتا۔ میں نے سوچا کہ آخر یہ سب مال جو میرے پاس رکھا ہوا ہے، کیوں نہ تمھارے درمیان تقسیم کر دوں تاکہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ اور کماؤ کھاؤ۔ چنانچہ میں نے اپنا سارا مال تم تینوں بھائیوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میری اور تمھاری والدہ کی زندگی کا بڑا حصہ گزر چکا۔ اب تھوڑی سی زندگی باقی ہے۔ تم لوگ تھوڑی بہت ہم پر توجہ دو گے تو ہماری زندگی آرام سے گزر جائے گی۔ بس اب جاؤ۔ میں نے اپنے پورے مال کو تم تینوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا ہے۔ آج کے بعد میرا سارا مال تم تینوں کا ہے۔ کماؤ، کھاؤ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ بس اتنی گزارش ہے کہ اب ہم دونوں میاں بیوی تمھاری خدمت کے محتاج ہیں، تم لوگ ہمیں فراموش مت کرنا۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کریں گے۔"

تینوں بیٹوں نے باپ کو یقین دلایا کہ وہ ماں باپ کی خدمت کریں گے۔

پھر تینوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے کر تجارت اور دیگر کام کاج میں مشغول ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ اپنی مشغولیت میں ایسے ڈوبے کہ والدین کی خدمت کرنا بھول گئے۔ ہر بیٹا یہی سمجھتا تھا کہ چلو میں اپنے والدین کی خدمت نہیں کر سکتا یا میرے پاس

اتنا وقت نہیں ہے تو دو بھائی اور ہیں۔ وہ دونوں بوڑھے والدین کی خدمت کرتے ہی ہوں گے۔ یوں بوڑھے والدین تنہا ہو کر رہ گئے۔

شاذ ونادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ اُن میں سے کوئی بیٹا اپنے والدین کے پاس مہینے دو مہینے میں ایک دو بار ملاقات کے لیے آ جاتا۔

ایک دن بوڑھے باپ کا ایک دوست ملاقات کے لیے آیا۔ یہ اُس کا پرانا جگری دوست تھا۔ خرید وفروخت کے معاملات میں جب بھی کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا، یہ بوڑھا اپنے اِسی دوست سے مشورہ لیتا۔ باتوں باتوں میں اُس نے اپنے جگری دوست کو بیٹوں کے ناروا سلوک سے آگاہ کیا۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ اَب وہ اپنی جائیداد میں سے کسی چیز کا مالک نہیں ہے، بلکہ ساری جائیداد بچوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور وہی اُس کے مالک ہیں۔

بوڑھے کا جگری دوست بڑا ذہین وفطین تھا۔ اسی لیے بوڑھے نے مشورہ لینے کے لیے اِس کا انتخاب کیا تھا۔ بوڑھے کے دوست نے کہا کہ میں تمھیں تمھاری نافرمان اولاد کی بے حسی اور عدم توجہی سے چھٹکارا دلانے کے لیے کافی ہوں۔ لیکن میں چاہوں گا کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں، تم اپنے بیٹوں کو ان کی ہوا بھی نہ لگنے دینا۔

بوڑھے باپ نے دوست سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو اِس بارے میں کوئی بات نہیں بتائے گا۔ یہ باتیں صیغۂ راز ہی میں رہیں گی۔ اُس نے اپنے دوست سے کہا: میں تمھیں اختیار دیتا ہوں کہ ہمارا مسئلہ حل کرنے کے لیے تم جو مناسب طریقہ اختیار کرنا چاہو، کر سکتے ہو۔

اس بات چیت کے بعد بوڑھے باپ کا جگری دوست یکے بعد دیگرے اس کے

تینوں بیٹوں کے پاس گیا اور اُن تینوں سے یہ باتیں کہیں:

''تم تو اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں تمھارے والد کا بہت پرانا ساتھی ہوں۔ تمھارا والد آخر وقت تک مجھ سے مشورہ لیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ لین دین ہو یا خرید وفروخت، یا روز مرہ کا کوئی بھی اُلجھا ہوا معاملہ میں ہی اُس کا مشیرِ خاص ہوا کرتا تھا۔ تمھارے باپ نے بہت عرصہ پہلے میرے پاس اپنے مال کا ایک بھاری حصہ بطورِ امانت رکھوایا ہوا ہے۔ اس مال کا اگر تخمینہ لگایا جائے تو یہ اُس کی جمع پونجی کے ایک تہائی سے کم نہیں ہوگا۔ خود میرے پاس اِتنا زیادہ مال ہے کہ میں اس کی حفاظت سے عاجز ہوں۔ اِس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمھارے باپ کو اُس کی رکھی ہوئی امانت واپس کر دوں۔ آخر کب تک میں یہ درد اپنے سر لیے رہوں گا؟ اور ہاں! میں یہ امانت تنِ تنہا واپس کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہوں گا کہ کل صبح ہی صبح تم اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ اپنے والد کے پاس آ جاؤ، تاکہ میں تم سب بھائیوں کی موجودگی میں تمھارے والد کو اُس کی امانت واپس کر دوں۔ یہاں ایک خاص بات تم سے یہ کہنا چاہوں گا کہ چونکہ اب تمھارے والد بوڑھے ہو گئے ہیں اور انھیں اِس مال و جائیداد میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس لیے وہ شاید یہ امانت، تم بھائیوں میں سے کسی ایک کے نام کرنے والے ہیں۔ تم میں سے جو اُن کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے گا وہی اس مال کا حق دار ہوگا۔ اس لیے میں نے تمھیں یہ راز بتلا دیا کہ تم اپنے والد کی خدمت میں لگ جاؤ۔ میں نے تمھارے والد سے تمھارے لیے تعریفی کلمات سنے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تمھارے والد یہ سارا مال تمھیں ہی دے جائیں گے اور تم مالا مال ہو جاؤ گے۔ اور ہاں! میں نے جو باتیں تم سے بیان کی ہیں اس کے بارے میں اپنے

دوسرے دونوں بھائیوں کو بالکل بھنک نہ پڑنے دینا مبادا وہی اِس مال کے حق دار بن بیٹھیں۔''

بوڑھے باپ کے اِس جگری دوست نے یہ باتیں اس کے تینوں بیٹوں میں سے ہر ایک کے پاس الگ الگ جا کر کیں اور تینوں کو خوب سبز باغ دکھلائے۔

صبح ہوئی۔ تینوں بیٹے وقت سے پہلے ہی اپنے والد کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ اپنے والد کو خوش کرنے کی غرض سے سب سے پہلے اُس کے پاس پہنچے۔ باپ کا جگری دوست بھی وقت پر پہنچ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا کہ وہی بیٹے جو کئی کئی مہینے تک اپنے بوڑھے باپ کی مزاج پرسی کے لیے نہیں آتے تھے، آج مال کے لالچ میں وقت سے پہلے ہی باپ کے دروازے پر پہنچ گئے ہیں۔ اُس کے ساتھ دو جوان آدمی بھی تھے جنھوں نے ایک بڑا صندوق اٹھا رکھا تھا۔ صندوق ایک بڑا اور مضبوط تالا لگا کر بند کیا ہوا تھا۔

بوڑھے کے جگری ساتھی نے صندوق کو تینوں بیٹوں کے سامنے اُن کے باپ کو واپس کرتے ہوئے کہا: چونکہ آپ نے یہ دولت میرے پاس بطورِ امانت رکھوائی تھی اَب میں آپ کی رکھی ہوئی امانت کی مزید حفاظت کرنے سے قاصر ہوں، اِس لیے آپ اپنے بیٹوں کے سامنے اپنی یہ امانت واپس لے لیں۔

بوڑھے نے اپنے جگری ساتھی کو تنہائی میں لے جا کر پوچھا: بھئی! اِس صندوق کے اندر تم نے کیا چھپا رکھا ہے؟ اس نے بتلایا کہ یہ محض میری تدبیر ہے جسے میں نے اپنایا ہے اور ہاں، تم اپنے بیٹوں کے سامنے اِس بارے میں کچھ مت کہنا۔ پھر وہ دونوں واپس آئے۔ اب بوڑھے کا ساتھی اس کے بیٹوں سے اس طرح مخاطب ہوا:

”آج میں تمھارے والد کی رکھی ہوئی امانت تمھارے سامنے واپس کر رہا ہوں۔ اَب اِس امانت کا بوجھ میرے سر سے ختم ہو گیا۔ تم لوگ اِس بات پر گواہ رہو۔ آج کے بعد مجھ پر اس سلسلے میں کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوگی۔“

یہ کہہ کر اُس نے بیٹوں کے سامنے بوڑھے باپ کو صندوق کی چابی دے دی۔

بوڑھے نے اپنے جگری ساتھی سے کہا: دوست! واقعی تم نے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ امانت کو اُس کے حقدار تک پہنچا دیا۔ اللہ تمھارا بھلا کرے۔

دوست بولا: آپ نے پوری زندگی میں خیر و بھلائی ہی کا کام کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ مال بھی اپنی جائیداد کی طرح اپنے اِن بچوں ہی میں تقسیم کر دیں گے۔ آپ اِن میں سے جسے چاہیں وصیت کر دیں یا سب کو عنایت کر دیں یا بعد میں جسے چاہیں، اسے اِس کا مختارِ کل بنا ڈالیں۔

یہ کہہ کر اُس نے سلام کیا اور مجلس سے رخصت ہو گیا۔ اُس کے بعد بوڑھے کے تینوں بیٹوں کا یہ حال تھا کہ وہ سب کے سب وفا کے پیکر بنے باپ کے سامنے کھڑے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کی تمنا تھی کہ وہی اُس صندوق کا حقدار بنے۔ باپ نے بیٹوں سے کہا کہ میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ صندوق تم میں سے کسے دوں، البتہ کچھ دنوں بعد اِسی صندوق کے اندر میں ایک وصیت اپنے اُس بیٹے کے نام لکھ کر رکھ دوں گا جسے دینا چاہوں گا۔ میرے انتقال کے بعد تم لوگ اسے کھولنا اور اندر سے جس کے نام وصیت نامہ نکلے گا، یہ مال اسی کا ہوگا۔

بیٹے اپنے باپ کی بات سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اُن کا بوڑھا باپ یہ مال بھی اُن کے مابین اسی طرح تقسیم کر دے گا جس طرح پہلے تقسیم کیا

تھا۔ مگر اِس دفعہ ایسا نہیں ہوا۔ اب اُن تینوں میں سے ہر بیٹا اِس کوشش میں لگ گیا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے باپ کے اِس مال کا مستحق وہی ٹھہرے۔

بس اَب کیا تھا، تینوں بیٹے اپنے باپ کی خدمت کے لیے یوں مصروف ہو گئے جیسے بھوکا آدمی کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ کوئی باپ کی خدمت کے لیے صبح آنکھ کھلتے ہی پہنچ جاتا۔ کوئی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ باپ کے پاس پہنچ کر اُس کے پاؤں دباتا۔ کوئی رات کے وقت بھی اپنے والد کی خیریت دریافت کرنے آجاتا۔ بوڑھا باپ اپنے بیٹوں کے دل کی حقیقت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بستی کے لوگ اُس بوڑھے پر رشک کرتے تھے کہ اُس کے بیٹے کتنے وفادار اور اطاعت گزار ہیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ مال کے لالچ میں ہو رہا ہے۔ ورنہ یہی باپ دو دو مہینے تک اپنے بیٹوں کی شکل دیکھنے کو ترس جاتا تھا۔

صندوق سامنے رکھا ہوا تھا۔ چابی باپ نے نامعلوم جگہ پر چھپا رکھی تھی۔ بیٹے آتے رہے اور باپ کی خدمت کرتے رہے۔ یہ سلسلہ کوئی دو سال تک چلتا رہا۔ بسا اوقات بیٹے اپنے دل میں سوچتے:

”ہمارا بوڑھا باپ کب تک زندہ رہے گا؟“

اِدھر باپ بچوں کی خدمت سے بڑی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ دو سال گزرنے کے بعد آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جس کا بیٹوں کو شدت سے انتظار تھا۔ باپ کا انتقال ہو گیا۔ کفن دفن کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد بیٹوں کی یہی تمنا تھی کہ جلد سے جلد صندوق کو کھولا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ مال کس کے نصیب میں آیا ہے۔ بیٹوں نے سوچا کہ اگر بستی کے لوگوں کو بلا کر اِس صندوق کے بارے میں کوئی بات چیت کی

جائے گی تو جگ ہنسائی ہوگی، چنانچہ انھوں نے اپنے والد کے پرانے جگری دوست ہی کو بلوایا اور اُس کے سامنے صندوق کھولنے کی تجویز رکھی۔ انھوں نے صندوق کی چابی اپنے والد کے جگری دوست کے حوالے کر دی اور کہا کہ اب آپ ہی قفل کھولیے۔

تینوں کے سانس اٹکے ہوئے تھے۔ ہر بیٹے کو یقین تھا کہ وصیت نامہ اسی کے نام نکلے گا کیونکہ اسی نے اپنے والد کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ اب صندوق کھل چکا تھا۔ تینوں بیٹے پھٹی پھٹی آنکھوں سے صندوق کو دیکھ رہے تھے۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں زور زور سے مل رہے تھے۔ انھیں اپنے آپ پر شک گزر رہا تھا کہ کہیں اُن کی آنکھیں دھوکا تو نہیں دے رہیں۔ مگر جو حقیقت سامنے تھی اُس میں اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ اُس صندوق میں درہم و دینار اور سونے چاندی کے بجائے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے بھرے پڑے ہیں۔ انھیں سخت حیرت ہو رہی تھی۔ صندوق میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ باپ کے جگری دوست نے اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا ہوا تھا:

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ صندوق اور اِس کے اندر جو کچھ ہے اُن نافرمان اور لالچی بیٹوں کے لیے ہے جنھوں نے والد کے حقوق ادا کرنے کے لیے اپنا فرض نہیں نبھایا، بلکہ مال کے لالچ میں اپنے والد کی خدمت کی۔“

تینوں بھائیوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ ان کے چہروں پر ذلت اور رسوائی کی دھول اُڑ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور خود اپنے وجود سے ندامت محسوس کر رہے تھے۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ یہ اُن کے والد کا کام نہیں، بلکہ اُن کے جگری دوست کی چال تھی۔ باپ کے جگری دوست نے کہنا شروع کیا:

''ہاں، اِس کا نام تدبیر ہے۔ یہ میرا ہی کام تھا...... میں نے ہی یہ چال چلی تھی۔ تمھارے بوڑھے والد نے مجھ سے تمھارے بارے میں شکوہ کیا تھا کہ تم لوگوں نے اُس کی جائیداد سے حصہ وصول کرنے کے بعد اسے بھلا دیا، اور اس کے حقوق یکسر فراموش کر بیٹھے، چنانچہ میں نے یہ تدبیر اختیار کی تاکہ میرے دوست کی خدمت ہو سکے اور تم مال کے لالچ ہی میں سہی، اپنے والد کی خدمت کرو۔''

اپنے والد کے دوست کی باتیں سن کر تینوں بھائیوں کو بے حد پشیمانی ہوئی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ انھوں نے اپنے والد کی خدمت میں بڑی کوتاہی کی ہے۔ اس کے بعد انھیں زندگی بھر یہ احساس کھاتا رہا کہ انھوں نے اپنے والد کی خدمت کا فرض کیوں فراموش کر دیا تھا۔ [1]

[1] اس واقعے کی تفصیل ''انسائیکلو پیڈیا آف اسٹوریز'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ دیکھیں انٹرنیٹ کی ویب سائٹ http/www.gesah.net۔

سب کچھ لُٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا؟

''کوئی بات نہیں ہمارے بیٹے نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے۔ کچھ اور وقت گزرے گا تو سدھر جائے گا۔ شادی ہو جائے گی تو خود بخود اچھے اخلاق کا مالک اور ماں باپ کا مطیع وفرماں بردار بن جائے گا۔''

یہ وہ جملہ ہے جو میں اپنے بوڑھے والدین سے اکثر سنا کرتا تھا۔ جب بھی میری طرف سے انھیں کوئی اذیت پہنچتی اور وہ مجھ پر ناراض ہوتے، تو اُن کی زبان پر صرف یہی جملہ ہوتا تھا کہ وقت گزرے گا تو یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

میں اب جوان ہو چکا تھا۔ سوجھ بوجھ والا جوان! مگر میں نے اپنے والدین کے کہنے پر کبھی عمل نہیں کیا۔ اُن کے نصیحت آمیز کلمات مجھے گراں گزرتے تھے۔ میں ان

کی باتوں پر کبھی کان نہیں دھرتا تھا۔ دل میں جو آتا کر گزرتا تھا۔لیکن میرے والدین نے میری نافرمانی پر مجھے کبھی روکا نہ ٹوکا۔ انھیں میرے بارے میں یہی حسنِ ظن تھا کہ جب میری شادی ہو جائے گی تو میں سدھر جاؤں گا اور اُن کی اطاعت کروں گا۔

ایک دن آیا کہ میری شادی ہوگئی اور میرے حالات بھی بدل گئے۔ میں پہلے کی نسبت اب بہت بدل چکا تھا مگر اطاعت وفرماں برداری کے حوالے سے نہیں بلکہ بالکل اس کے برعکس! میں ہر طرح سے اپنے والدین کے لیے نافرمان اور نالائق بن چکا تھا۔

والدین سے میری نفرت اور اُن کے ساتھ ناروا سلوک کرنے میں میری شریکِ حیات کا بڑا عمل دخل تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے حقوقِ والدین کا درس دیتی، مجھے والدین کی خدمت کرنے کی نصیحت کرتی، اُلٹا وہ مجھے ماں باپ سے نفرت دلایا کرتی تھی۔ وہ میرے والدین کو حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔ میری بیوی خوبصورت تو تھی مگر خوب سیرت نہیں تھی۔ غرور اور تکبر اُس کی رگ رگ میں رچا بسا تھا۔ وہ بسا اوقات ہماری عربی زبان کا بھی مذاق اڑایا کرتی تھی۔ دراصل اُس نے انگریزی ماحول میں تربیت پائی تھی۔ وہ انگلش میں بات کرنے اور لوگوں کے سامنے انگلش بگھارنے میں لذت محسوس کرتی تھی۔ انگریزی اسٹائل اسے جنون کی حد تک پسند تھا۔

میں اپنے ماں باپ کے بارے میں اُس کے حقارت آمیز جملے بارہا سنتا تھا اور نظر انداز کر دیتا تھا۔ اب جبکہ وہ میری زندگی سے دور جا چکی ہے، مجھے احساس ہوتا ہے کہ اُس نے میرے والدین کو کس کس انداز میں تکلیف دی تھی اور اُن کے جذبات کو کیسے کیسے نازیبا الفاظ سے ٹھیس پہنچائی تھی۔ جب کبھی اُس کی سہیلیاں اُس سے ملنے کے لیے گھر آتیں تو وہ اُن کے پاس بیٹھ کر اشاروں کنایوں میں میرے والدین کا

مذاق اڑاتی اور اُن کی طرف حقارت آمیز نگاہوں سے اشارے کرتی تھی۔ لیکن میرے والدین کا عالی ظرف اور بڑا پن دیکھیں کہ وہ بہو کے اشارے سمجھنے کے باوجود بھی اُس کا جواب نہیں دیتے تھے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے خود ہی اپنی بیوی کو سر پہ چڑھا رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے میری بیوی کے دل کو کسی قسم کا کوئی دکھ پہنچے۔

ایک رات ہم دونوں میاں بیوی اپنے ننھے بچے کے ساتھ ٹہلنے نکلے۔ اُس روز میری والدہ کی طبیعت ناساز تھی۔ جب ہم میاں بیوی گھر سے نکلنے لگے تو میرے والد نے والدہ کے بارے میں کوئی بات بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ انھیں معلوم تھا کہ میں اُن کی باتیں سننے کو تیار نہیں ہوں گا۔

رات گئے ہم میاں بیوی واپس گھر پہنچے۔ میں نے دیکھا کہ والد صاحب گھر میں تنہا ہیں۔ اُن کے ساتھ امی جان نہیں ہیں۔ میرے والد کا چہرہ اُداس تھا۔ دور ہی سے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بہت غمگین ہیں۔ میں نے بادلِ نخواستہ اُن سے پوچھا: کیا بات ہے کہ آج آپ گھر میں اکیلے ہیں؟

والد صاحب کہنے لگے:

"بات یہ ہے کہ جب تم میاں بیوی گھر سے باہر جارہے تھے، اُس وقت تمھاری ماں کی طبیعت خراب تھی۔ اس کے پیٹ میں درد ہورہا تھا۔ درد کی شدت سے وہ بہت بے چین تھی۔ اس کی پریشانی اور درد جب حد سے زیادہ بڑھ گیا تو میں نے پڑوسی کے دروازے پر دستک دی، تاکہ کسی طرح تمھاری ماں کو ہسپتال پہنچایا جاسکے۔ پڑوسی کے تعاون سے میں نے اسے ہسپتال میں

داخل کرا دیا ہے۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ مریضہ کی حالت ابھی خطرے میں ہے، اس لیے اسے خاص نگہداشت کے کمرے میں رکھا گیا ہے۔''

میں اپنے والد کی یہ باتیں سن ہی رہا تھا کہ میری بیوی نے پیچھے سے میرا دامن پکڑ کر کھینچا اور میں اپنے والد کی بقیہ باتیں سنے بغیر اس کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بیوی نے فوراً دروازہ بند کر دیا جبکہ میرے والد گھر کے باہر برآمدے میں کھڑے تھے۔ میری بیوی کہنے لگی: چلو ابھی آرام کرتے ہیں، صبح ہوگی تو ہسپتال چلے جائیں گے۔

صبح ہوئی تو ماں کے انتقال کی اطلاع ملی۔ مجھے اس قدر صدمہ ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔

اب میرا احساس جاگ چکا تھا۔ میں نے بہت غور وفکر کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میں نے اپنے والدین کی خدمت میں کوتاہی کی ہے اور آج بھی کوتاہی کر رہا ہوں؟ کیا وجہ ہے کہ میری ماں ناراضی کے عالم ہی میں مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔ اب میں کیوں کر اپنی والدہ کی خدمت کر سکتا ہوں جبکہ وہ اِس دنیا میں موجود ہی نہیں؟ والد یا والدہ سے میری دوری کا سبب کیا ہے؟ غور وفکر کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ دراصل والدین کی خدمت میں میری کوتاہی اور نافرمانی کا سبب صرف میری بیوی ہے۔ میں نے سوچا ایسی بیوی کا کیا فائدہ جو مجھے میرے والدین سے دور کر دے اور مجھے اللہ کی لعنت کا مستحق بنا دے؟ چنانچہ میں نے فوراً طلاق نامہ تیار کرایا اور بیوی کو طلاق دے دی۔

الحمد للہ آج میں اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ اپنے والد کے سائے میں رہ رہا ہوں۔ میں اپنے والد کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے

ماضی میں اپنے والدین کی خدمت میں جو کوتاہی کی تھی، اس کی تلافی کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میری والدہ پر رحمتوں کی بارش برسا اور مجھ سے اپنی والدہ کے سلسلے میں جو کوتاہی ہو چکی ہے اسے معاف فرما۔

میں اپنے کرتوت پر بے حد شرمندہ ہوں۔ اور بے حد پریشان ہوں۔لیکن کیا میری ندامت میری ماں کو اِس دنیا میں واپس لاسکتی ہے تاکہ میں اپنی غلطی کی معافی مانگ کر اپنی اصلاح کرسکوں، یا اس کی خدمت کرکے اپنی کوتاہی کا ازالہ کرسکوں؟[1]

[1] اس واقعے کی تفصیل ''انسائیکلوپیڈیا آف اسٹوریز'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ دیکھیں انٹرنیٹ کی ویب سائٹ http/www.gesah.net۔

تمغۂ خدمت

اِس واقعے کے راوی شیخ ناصر العمر ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ''بيوت مطمئنة'' میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس لڑکی کی ماں بوڑھی ہو چکی تھی۔ اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کے لیے کئی ایک رشتے آئے۔ وہ ایک سنجیدہ اور مؤدب لڑکی تھی۔ اسلامی تہذیب وثقافت سے اسے بہت لگاؤ تھا۔ وہ انتہائی دیندار تھی۔ ہر بات کو دین کی میزان میں تولتی۔ اس کے پاس جب کئی طرف سے شادی کے رشتے آئے تو اس نے پیغام دینے والوں کے سامنے یہ شرط رکھی کہ میں اسی آدمی سے شادی کروں گی جو مجھے میری والدہ کے پاس رہنے دے گا، تاکہ میں اپنی والدہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرسکوں۔

ایک پیغام اسے موصول ہوا۔ پیغام بھیجنے والے کو لڑکی کی شرط معلوم تھی کہ جب تک

ماں زندہ ہے، وہ اسی کے پاس رہے گی تاکہ اس کی خدمت کر سکے۔ لڑکے کو یہ شرط منظور تھی، پھر جھٹ پٹ دونوں کی شادی ہوگئی۔

شرط کے مطابق لڑکی کی رخصتی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ حسب سابق اپنی والدہ کے پاس ہی رہی۔ رات اور دن میں وہ کئی دفعہ اپنی عمر رسیدہ ماں کی حسب ضرورت خدمت کرتی تھی اور اس کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتی تھی۔ جو بھی دیکھتا وہ اُس بوڑھی عورت پر رشک کرتا کہ اُسے کتنی وفادار اور فرماں بردار بیٹی نصیب ہوئی ہے۔

یہ سلسلہ ایک عرصے تک چلتا رہا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جو ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ لڑکی کی والدہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

ماں کی وفات کے بعد وہ لڑکی بہت روئی۔ وہ غم سے نڈھال ہو چکی تھی۔ کسی نے اس سے اس قدر رونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا:

"آہ! اب میں اپنی ماں کہاں سے لاؤں گی؟ کسے ماں کہہ کر پکاروں گی؟ کس کی خدمت کروں گی؟ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ آج میرے لیے جنت کا ایک دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اب میں خدمت کے لیے ماں کہاں سے لاؤں گی؟"

لڑکی ماں کے وجود کو اپنے لیے بہت عظیم نعمت تصور کرتی تھی۔ وہ ماں کی خدمت کرنے میں اپنی آخرت کی کامیابی سمجھتی تھی۔ اسے یہ غلط فہمی نہیں تھی کہ بوڑھی ماں اُس کی خدمت کی محتاج ہے، بلکہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ بوڑھی ماں کی محتاج ہے۔ اُس کی خدمت ہی سے اسے وہ مقام مل سکتا ہے جس کا حصول ماں کی خدمت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے وہ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد بے حد غمزدہ تھی۔

بلاشبہ وہ لڑکی اپنی ماں کی اطاعت گزار تھی۔ اس کی ماں وفات کے وقت اُس سے راضی تھی۔ ماں باپ کا اولاد سے مرتے وقت تک راضی رہنا اولاد کے حق میں دنیاو آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے، چنانچہ زمانے نے دیکھا کہ وہ لڑکی ایک اچھے خاندان کو چار چاند لگانے کا سبب بنی۔ اس کے دو بچے ہوئے۔ دونوں نیک اور صالح تھے۔ دُور دُور تک اُن کے تقویٰ کا چرچا تھا۔ وہ دونوں اللہ کے نیک اور صالح بندوں میں سے تھے۔ یہ اُس لڑکی پر بھی اللہ تعالیٰ کا احسان اور اس کی خدمت کا صلہ تھا کیوں کہ اُس نے اپنی بوڑھی والدہ کی بہت خدمت کی تھی۔ [1]

[1] یہ قصہ شیخ ناصر العمر کی کتاب ''بیوت مطمئنۃ'' سے ماخوذ ہے۔
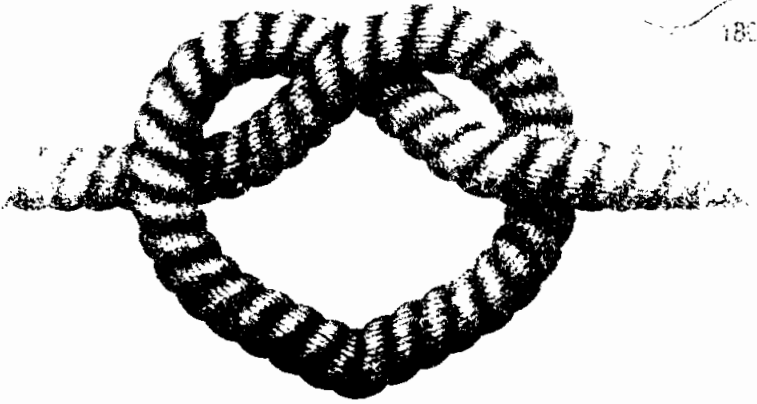
اللہ نہ کرے۔ اُسے شیر نہ مار ڈالے

ایک نوجوان کی نہایت خوبصورت لڑکی سے شادی ہوئی۔ گھر بسانے کے بعد لڑکی کو اندازہ ہو گیا کہ اُس کا شوہر اُس پر لٹو ہے۔ اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے اور اُس کے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے وہ اپنے شوہر کی ماں کے ساتھ ہمیشہ بے رخی اختیار کرتی تھی۔ اُس کی ساس ایک بوڑھی خاتون تھی۔ وہ اِس دنیا میں بس چند دنوں کی مہمان تھی۔ جو بھی دیکھتا اُسے اس کے بڑھاپے پر ترس آ جاتا۔ وہ اِس عمر میں اپنے بیٹے اور بہو کی خدمت کی محتاج تھی۔ مگر ساس کی خدمت کیا ہوتی ہے؟ اس کی بہو نے تو اس بارے میں کچھ سیکھا ہی نہیں تھا۔

دوسری جانب نوجوان بیٹے کا حال بھی قابلِ تعریف نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی ماں کی خدمت پوری طرح نہیں کرتا تھا۔ مگر بیٹے کی طرف سے کبھی ماں کو شکایت نہیں ہوئی تھی، البتہ بہو کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر اسے تکلیف ضرور ہوتی مگر وہ حرفِ شکایت زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ بہو نے جب دیکھا کہ کئی سال ایک ساتھ گزارنے

کے باوجود بیٹا ماں سے نفرت نہیں کرتا اور اُس کے لاڈ چوچلے اٹھانے پر بھی ماں کو بُرا بھلا نہیں کہتا تو ایک روز وہ ناراض ہو کر بیٹھ گئی۔ شوہر جب کام کاج سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا تو بیوی کو افسردہ دیکھ کر پوچھا: کیوں کیا بات ہے آج روزانہ کی طرح خوش نہیں ہو؟ بیوی نے جواب دیا: یہ تمھاری بوڑھی ماں جو گھر میں رہتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کیا کوئی اس گھر میں ہنسی خوشی رہ سکتا ہے؟ اور ہاں، بہت ہو گیا ہمارا تمھارا ایک ساتھ جس قدر گزارا ہو سکتا تھا وہ ہو گیا۔ اب میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ میرے ساتھ تمھاری ماں بھی اس گھر میں رہے۔ جب تک تم گھر سے اس بڑھیا کو نہ نکال دو، میں اور تم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

"جب بیوی نے شوہر سے بار بار یہی کہا کہ میں تمھاری ماں کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہ سکتی تو اس نے اپنی ماں کو رات کے اندھیرے میں کندھے پر اٹھایا اور خونخوار جانوروں والے جنگل میں لے جا کر پھینک دیا، پھر چند منٹ کے بعد وہ اجنبی بن کر ماں کے پاس آیا تو وہ زار وقطار رو رہی تھی۔

اُس نے اپنی آواز بدل کر بڑھیا سے پوچھا:

"بڑھیا! کیوں رو رہی ہو؟"

بڑھیا کہنے لگی:

میرا بیٹا ابھی مجھے یہاں پھینک کر چلا گیا ہے، مجھے خوف ہے کہ کہیں اُس کو کوئی شیر چیر پھاڑ کر نہ کھا جائے!"

اس نے کہا: "تم اپنے اُس بیٹے کے لیے رو رہی ہو، جس نے تم سے یہ سلوک کیا ہے کہ تمھیں اس خطرناک جنگل میں لا پھینکا؟ تم اس کے لیے بد دعا کیوں نہیں

کرتیں!''

وہ کہنے لگی:

''میری محبت اس کے لیے بد دعا کرنے سے انکار کرتی ہے!''

بڑھیا کا کہا ہوا یہ جملہ اسی روز سے ضرب المثل بن گیا اور عربوں میں یہ مثل مشہور ہوگئی۔ [1]

قارئین کرام! ذرا ماں کی محبت کا اندازہ کریں کہ اس کے شقی القلب بیٹے نے اپنی بیوی کی باتوں میں آ کر ماں کو ایک خطرناک وادی میں پھینک دیا تھا مگر ماں کی محبت کو سلام کہ اُسے جنگل میں بھی اپنی نہیں بلکہ بیٹے کی سلامتی کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں بیٹے کو واپس جاتے جاتے کوئی شیر نہ پھاڑ کھائے۔

[1] اس قصے کی اصل آپ ابو الفضل احمد بن محمد بن احمد بن ابراہیم المیدانی کی کتاب مجمع الأمثال: 234/1 پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایڈیشن 1987ء، دار الجیل، بیروت، لبنان۔
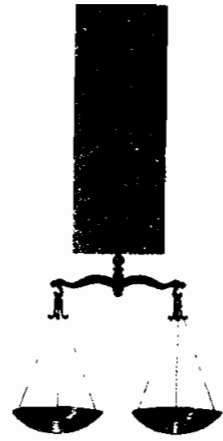
قانون بھی حیران ہوگیا

سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض سے ایک روزنامہ نکلتا ہے۔ شہر ریاض ہی کی نسبت سے اس کا نام روزنامہ ''ریاض'' رکھا گیا ہے۔ اخبار کے مطابق دو بھائیوں کے درمیان جھگڑے کا مقدمہ اس قدر سنگین صورت اختیار کر گیا کہ اس کا فیصلہ پنچایت میں نہیں ہوسکا، بلکہ مقدمہ ہائی کورٹ تک پہنچ گیا۔ دراصل یہ مقدمہ بالکل نرالی نوعیت کا تھا، اس لیے بہت سے عربی اخبارات نے اسے نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ ہم روزنامہ ''الریاض'' کے حوالے سے اس واقعے کا خلاصہ قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

اُس کا نام حیزان تھا۔ سعودی عرب کے معروف شہر ''بریدہ'' سے 90 کلومیٹر کے فاصلے پر ''اَسیاح'' نامی ایک بستی ہے۔ حیزان نامی بوڑھا اسی بستی کا رہنے والا تھا۔ جب مقدمہ ہائی کورٹ پہنچا تو وہ بوڑھا شخص لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی عدالت میں اس قدر رویا کہ اُس کے آنسوؤں سے اس کی ڈاڑھی بھیگ گئی، آخر کیوں؟

اُس بوڑھے نے بھری عدالت میں لوگوں کے سامنے آنسو کیوں بہائے؟ کیا اِس لیے کہ اس کے بیٹوں نے اس کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا؟ کیا اِس لیے کہ زمین کے

کسی مقدمے میں اس کی ہار ہونے والی تھی؟ یا اس لیے کہ اس کی بیوی نے اِس عمر میں اس پر خلع کا مقدمہ دائر کر دیا تھا؟

جی نہیں، اِن میں سے کوئی بھی وجہ نہیں تھی۔ دراصل وہ بھائی کے مقابلے میں اپنی ماں کا مقدمہ ہارنے کی وجہ سے تڑپ رہا تھا۔ اُس ماں کا مقدمہ، جس کے پاس پیتل کی ایک انگوٹھی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

یہ بڑھیا اپنے بڑے بیٹے حیزان کے ساتھ رہتی تھی۔ حیزان اپنی ماں کے ساتھ انتہائی حسنِ سلوک سے پیش آتا۔ حتی المقدور اس کی خدمت کرتا تھا۔ بوڑھی ماں بھی اس کے ساتھ خوش تھی۔ جب حیزان کی عمر زیادہ ہوگئی، ایک دن اس کا چھوٹا بھائی اس کے گھر آیا۔ وہ دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ اس نے بڑے بھائی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آج کے بعد ماں اس کے ساتھ رہے گی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ شہر سے ماں کو لے جانے کے لیے ہی آیا ہے۔

یہ بات حیزان کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ کہنے لگا: بھائی! اگرچہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور تم میرا بڑھاپا دیکھ کر یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اپنی والدہ کی اچھی طرح خدمت نہیں کر سکوں گا، لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں آج بھی اپنی والدہ کی خدمت اسی طرح کرنے کے قابل ہوں جیسا کہ اِس سے پہلے کرتا تھا۔ تمھیں میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ میری ماں میری آنکھوں سے اوجھل رہے۔ میں جیتے جی ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں زندگی بھر بے قرار رہوں گا، اس لیے مجھ پر احسان کرو اور ماں کو اپنے ساتھ شہر لے جانے کی کوشش نہ کرو۔

چھوٹے بھائی نے جواباً عرض کیا: بھائی جان! آپ طویل عرصے سے ماں کی خدمت کر رہے ہیں اور بلاشبہ آپ نے والدہ کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جتنا ہو سکا آپ نے والدہ کی خدمت کی۔ اب آپ بوڑھے ہو چکے ہیں، ایسی صورت میں آپ خود اپنے بچوں کی خدمت کے محتاج ہیں، اس لیے آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ والدہ کو میرے ساتھ شہر جانے دیں۔ میں ابھی جوان ہوں، میرے بچے بھی دادی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ میری بیوی بھی ساس کی خدمت کرنا چاہتی ہے، اس لیے آپ ہمیں ماں کی خدمت کا موقع فراہم کریں۔

دونوں بھائیوں میں بحث ہوتی رہی۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ماں کو خود سے جدا کرنے پر راضی نہ تھا۔ دونوں ہی ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ ہر چند حیزان بوڑھا ہو چکا تھا، مگر اسے ماں سے جدائی گوارا نہ تھی۔ دونوں بھائیوں کے درمیان بحث بڑھتی دیکھ کر پڑوس کے لوگوں نے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن لوگوں کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی ماں سے جدا رہنے پر تیار نہ تھا۔ دونوں اپنی اپنی دلیل سے ایک دوسرے کا مسکت جواب دے رہے تھے۔

جب یہ معاملہ حل نہ ہو سکا اور لوگوں کی مصالحانہ جدوجہد بھی اس مقدمے کو حل کرنے سے قاصر رہی تو آخر کار یہ مقدمہ ہائی کورٹ پہنچ گیا۔ مقدمہ دونوں بھائیوں کی طرف سے دائر ہوا۔

جج کے پاس یہ مقدمہ پہنچا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے اس کیس کو ہر اعتبار سے جانچا، دیکھا، تولا اور پرکھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے؟ پھر اس نے

دونوں بھائیوں کو اپنے چیمبر میں بلایا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان میں سے کوئی ایک بھائی اپنی ماں کو دوسرے بھائی کے پاس رکھنے پر راضی ہو جائے۔ مگر جج کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی ماں کے فراق پر راضی نہ تھا۔ جج کو جب کسی طرح بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو اس نے بوڑھی ماں کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ جج کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں ماں کی رائے سے بھی آگاہ ہو جائے کہ آخر خود ماں کی کیا مرضی ہے؟ وہ اپنے بڑے بیٹے حیزان کے ساتھ رہنا چاہتی ہے یا چھوٹے بیٹے کے ساتھ جانا چاہتی ہے؟

جج کے حکم کے مطابق دونوں بھائیوں نے اپنی والدہ کو ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر عدالت میں پیش کیا۔ بڑھیا کا وزن کوئی بیس (20) کلوگرام تھا، کیونکہ وہ بہت بوڑھی ہوچکی تھی۔ اس کے جسم میں گوشت پوست کی بجائے ہڈیاں ہی ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔

عدالت، حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ چونکہ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا مقدمہ تھا، اِس لیے لوگ اس کا فیصلہ سننے کے لیے بے تاب تھے۔ عدالت میں دونوں بھائیوں نے مل کر ماں کو پیش کیا۔ جج کی ساری توجہ بوڑھی ماں کی طرف تھی۔ اس نے خاتون سے مخاطب ہوکر پوچھا:

”محترمہ! دونوں بیٹے تمھاری خدمت کے لیے تمھیں اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں کی خواہش ہے کہ تمھاری خدمت کریں۔ ان میں سے کوئی بھی تم سے جدا ہونے کو تیار نہیں۔ میں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی ایک اپنی بات سے رجوع کر لے مگر یہ دونوں اپنی بات اور دلیل پر مصر ہیں۔ مجھے اِس مقدمے کا فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی ہے۔ اب یہ

فیصلہ میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔ تم جو کہوگی میں اسی کی بنیاد پر فیصلہ کردوں گا۔ میرا سوال یہ ہے کہ تم خود بتادو کہ اِن دونوں بیٹوں میں سے کس کے پاس رہنا چاہتی ہو؟''

سچ تو یہ ہے کہ اِس مقدمے کا فیصلہ جج کے لیے جتنا دشوار تھا، اُس سے کہیں زیادہ ماں کے لیے دُوبھر تھا۔ دونوں بیٹے اس کی آنکھوں کے تارے تھے۔ وہ ان دونوں ہی سے بے لوث محبت کرتی تھی اور اُن دونوں ہی نے ماں کی خدمت میں بڑے خلوص کا ثبوت دیا تھا۔ ماں کو چپ لگ گئی۔ جج خاتون کے جواب کا شدت سے منتظر تھا۔ خاتون نے چند لمحے بعد زبان کھولی اور کہنے لگی:

''جج صاحب! میں کیا فیصلہ سناؤں؟ آپ نے اپنے فیصلے کا انحصار میرے جواب پر رکھا ہے۔ بھلا میں کیا عندیہ ظاہر کروں؟ میں تو اِن دونوں کی ماں ہوں۔ یہ دونوں ہی میرے بچے ہیں۔ میری ایک آنکھ میرے بڑے بیٹے حیزان کی طرف دیکھ رہی ہے اور دوسری آنکھ اس کے چھوٹے بھائی کی طرف۔ میں دوراہے پر حیران کھڑی ہوں۔ میرے لیے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ میں کس راہ پر قدم بڑھاؤں؟

جج کے لیے اب یہ مقدمہ اور بھی پیچیدہ ہوگیا۔ اب اس کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو مناسب سمجھے وہ فیصلہ سُنا دے، چنانچہ جج نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ سنایا:

'' حیزان نے ایک عرصے تک اپنی بوڑھی والدہ کی خدمت کی ہے اور اب وہ خود بھی بوڑھا ہو چلا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح چابکدستی سے اپنی ماں کی

خدمت نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں اس کا چھوٹا بھائی ابھی جوان ہے۔ اس کے پاس ماں کی خدمت کرنے کی صلاحیت بھی ہے، اس لیے عدالت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ بوڑھی ماں اَب اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہے۔ کیونکہ وہ اپنی والدہ کی بخیر وخوبی خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''

یہ فیصلہ سننا تھا کہ حیزان کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ وہ بھری عدالت میں سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ وہ اپنے اوپر افسوس کر رہا تھا کہ آہ! آج میں بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے اپنی ماں کی خدمت کرنے سے محروم کر دیا گیا ہوں عدالت نے میرے خلاف فیصلہ صادر کیا ہے۔ کاش! میں بوڑھا نہ ہوتا، تاکہ اپنی والدہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے اپنی خوشی مناتا۔

اِس واقعے کا راوی بیان کرتا ہے:

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس ماں نے اپنے اِن دونوں بیٹوں کی پرورش و پرداخت کس انداز میں کی تھی کہ اُن کا یہ مقدمہ ہائی کورٹ تک پہنچ گیا۔ اُن میں سے ہر ایک اپنی ماں کی خدمت کے لیے تڑپ رہا تھا۔ دونوں کی خواہش یہی تھی کہ ماں اسی کے پاس رہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کی خدمت کر سکے۔ بالآخر دونوں بھائیوں کے حقِ خدمت کا فیصلہ عدالت کو کرنا پڑا۔

یہ واقعہ آج کے آتش گیر لالچی دور میں جذبۂ خدمت وفدویت کی بہترین مثال ہے۔

اُس کا چرچا آسمانوں میں ہے

یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ یہ واقعہ سعودی عرب میں پیش آیا۔ یہ واقعہ خود میرے قریبی رشتے دار کا ہے۔ میں ہی نہیں بلکہ جس نے بھی یہ واقعہ دیکھا یا سنا، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس واقعے سے اس نوجوان کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے جس نے اپنی جوانی کو باپ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور اپنی ملازمت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔ یقیناً وہ اپنے باپ کا مطیع وفرماں بردار بیٹا تھا۔

واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے خاندان کا ایک شخص ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس کا خون جم گیا۔ اس میں چلنے پھرنے اور کام کاج کرنے کی طاقت نہیں رہی۔ یوں وہ آدمی پابندِ بستر ہو کر رہ گیا۔ اپنے ملک میں اس کے علاج کے لیے کوئی خاطر خواہ سہولت موجود نہیں تھی، چنانچہ اس کے بیٹوں نے صلاح مشورے کے بعد اپنے والد کو علاج معالجہ کی غرض سے بیرونِ ملک لے جانے کا ارادہ کر لیا۔

ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی تھی کہ ان کے والد کا علاج ملک ہی میں ہو جائے۔ مگر

انھوں نے آخر میں جو رپورٹ دی اس سے پتہ چلا کہ مریض کا علاج ملک بھر میں کسی جگہ نہیں ہوسکتا، البتہ بیرونِ ملک علاج ہونے کا امکان ہے۔ مگر علاج میں کامیابی ہونے کے باوجود مریض نارمل حالت میں نہیں آ سکتا، بلکہ وہ پابندِ بستر ہوکر ہی رہے گا۔ اس کے لیے چلنا پھرنا اور حرکت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ علاج کے بعد بھی بات چیت کرنے سے قاصر رہے گا۔

بیٹوں نے جب ڈاکٹروں کی رپورٹ دیکھی تو انھیں بڑی تشویش ہوئی۔ وہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے بارے میں باہم مشورہ کیا۔ ان کے سامنے یہ ایک اہم سوال تھا کہ باپ کی خدمت کے لیے اتنے دنوں تک باہر کیسے رہا جا سکتا ہے۔ ابھی ان کے درمیان یہی موضوع زیر بحث تھا کہ ایک بیٹے نے کہا:

> ''میں اپنے والد کے ساتھ ہسپتال میں رہوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک ان کی زندگی باقی رہے گی میں اس وقت تک ان کی خدمت کرتا رہوں گا، اس لیے آپ بھائیوں سے گزارش ہے کہ آپ لوگ اِس بارے میں بالکل بےفکر رہیں کہ والد محترم کے ساتھ کون رہے گا۔ اب آگے کی کارروائی کے بارے میں گفتگو کریں۔''

یہ لڑکا اُس مریض کا چوتھا بیٹا تھا۔ اس کی عمر کوئی پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ یہ برسرِ روزگار تھا، البتہ اس کی شادی ابھی تک نہیں ہو پائی تھی۔

بھائیوں نے جب اپنے نوجوان بھائی کی بات سنی تو ان کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھرے۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے کہ کیا واقعی ہمارا بھائی اتنی طویل مدت تک والد محترم کی خدمت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے؟، یا یہ محض ایک جذباتی

بول ہے جیسا کہ ایسے موقع پر عام طور پر بول دیا جاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھائی والد محترم کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر جذباتی حالت میں ایسا کہہ رہا ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ واقعی وہ اپنی بات میں سچا اور پکا ہے تو پھر اس کی نوکری کا کیا بنے گا؟ اچھی بھلی سروس کرتا ہے۔ اسی سروس کے عوض وہ اپنے خواب شرمندۂ تعبیر کر سکتا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بہت سارے دوست احباب ہیں۔ وہ سفر بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ نوجوان ہے، جس کے مستقبل کے لیے نہ جانے کتنے تصورات ہیں جنھیں وہ عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ یہ علاج چند دنوں یا چند ماہ میں مکمل ہونے والا بھی نہیں۔ ایسی صورت میں اِس کا فیصلہ بڑا حیرت انگیز ہے!...... غرض بھائیوں کو اس نوجوان کا فیصلہ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن نوجوان نے انھیں قائل کر لیا کہ سچ مچ وہ اپنے والد کی خدمت کے لیے ہسپتال میں رہنے کو تیار ہے۔ سارے بھائی اس کے جواب سے مطمئن ہو گئے۔

اس کے بعد اب انھوں نے اگلے مرحلے کی تکمیل کی اور والد کو علاج کی غرض سے بیرونِ ملک بھیج دیا۔ والد کے ساتھ وہ نوجوان بھی تھا۔ وہی رفیقِ سفر بھی تھا اور وہی ہسپتال کا رفیق بھی۔ والد کو ہسپتال میں داخل کرانے کے بعد وہ انھی کی خدمت میں رہنے لگا۔ وہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق اپنے والد کو دوا دیتا، کھانا کھلاتا، پانی پلاتا اور صفائی کا اہتمام کرتا۔ چوبیس گھنٹے وہ والد ہی کی خدمت میں رہتا۔ جب اس کا والد دوا پی کر سو جاتا تو وہ آخر میں اپنے بیڈ پر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا۔ صبح والد کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی وہ نیند سے بیدار ہو جاتا۔ اور پھر روزانہ کے معمولات شروع ہو جاتے۔

یہ کوئی ایک آدھ ہفتہ کی بات نہ تھی، یا دو چار ماہ کا معاملہ نہ تھا۔ نہ سال دو سال کی بات تھی۔ بلکہ پورے تیرہ سال تک وہ نوجوان ہسپتال میں اپنے والد کی خدمت میں [illegible] وہ اپنے والد کے ساتھ انتہائی محبت اور احترام سے پیش آتا۔ اس نے کبھی والد کو یہ گمان تک نہ ہونے دیا کہ وہ اس کی خدمت سے عاجز آ گیا ہے۔ بلکہ اس کی اخلاص بھری خدمت دیکھ کر والد سر اٹھا کر کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتا تھا مگر اس کی زبان بیٹے کا شکریہ ادا کرنے سے عاجز تھی، اس لیے وہ بیٹے کو انتہائی محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور مُنہ سے کچھ نہ بولتا تھا۔

تیرہ سال کے بعد والد کا انتقال ہو گیا۔ بیٹے نے اپنے والد کی تیرہ برس تک جس طرح خدمت کی، اس کا چرچا پورے ہسپتال میں تھا۔ ہسپتال میں جو بھی آتا وہ اس نوجوان کے ولولۂ خدمت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس طرح نوجوان کی عمر کوئی چالیس سال سے بھی زیادہ ہو گئی اور وہ مسلسل والد ہی کی خدمت میں مصروف رہا۔ اس نے شادی بھی نہیں کی۔ شادی کے لیے اسے فرصت ہی نہیں مل سکی۔ جب یہ نوجوان ہسپتال میں اپنے والد کے ساتھ داخل ہوا تھا اُس وقت اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ لیکن جب وہ ہسپتال سے نکلا تو اس کی عمر چالیس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔

اس نوجوان کی دنیا ہسپتال تک ہی محدود تھی۔ ہسپتال کا ایک ایک فرد اسے جانتا تھا لیکن ہسپتال کے باہر والی دنیا اُس سے بے خبر تھی۔ حتیٰ کہ اب باپ کی وفات کے بعد والی زندگی بھی ایسی تھی کہ اسے دنیا والے یاد نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ شادی شدہ نہیں تھا۔ نہ اس سے آگے کوئی نسل چل سکی۔ یار دوستوں سے اس کے تعلقات نہیں

رہے۔ والد کی خدمت کے لیے مسلسل ہسپتال میں رہنے کے سبب باہر کی دنیا میں اس کا جو امیج تھا وہ برقرار نہیں رہا۔ اس کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے، وہ بھی منقطع ہو کر رہ گئے۔

یہ درست ہے کہ دوست احباب سے اس کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ہسپتال کے باہر اس کے جاننے پہچاننے والوں کی تعداد کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آگے اس کی نسل بھی نہیں چل سکی جس کی وجہ سے بعد میں اس کا تذکرہ ہی موقوف ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ والد سے اس کی ہمدردی اور محبت کو آسمان پر قیامت تک یاد کیا جاتا رہے گا اور والد کی خدمت کے صلے میں اس کا نام ابد تک چمکتا رہے گا۔ کیونکہ اپنے والد کی خدمت کے لیے اس نے اپنی ہر تمنا قربان کر دی تھی۔ یہ ساری قربانی اس نے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے دی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ماں باپ کا ایسا ہی خادم، مطیع اور فرماں بردار بنائے۔ [1]

---

[1] مجلہ الأسرۃ کے عدد (180) میں یہ واقعہ شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد جرائد نے اسے شائع کیا ہے، البتہ میں نے قارئین کرام کے لیے یہ تفصیلات انٹرنیٹ پر موجود ''انسائیکلو پیڈیا آف اسٹوریز'' سے بیان کی ہیں۔ اس کے لیے آپ انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.gesah.net کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔
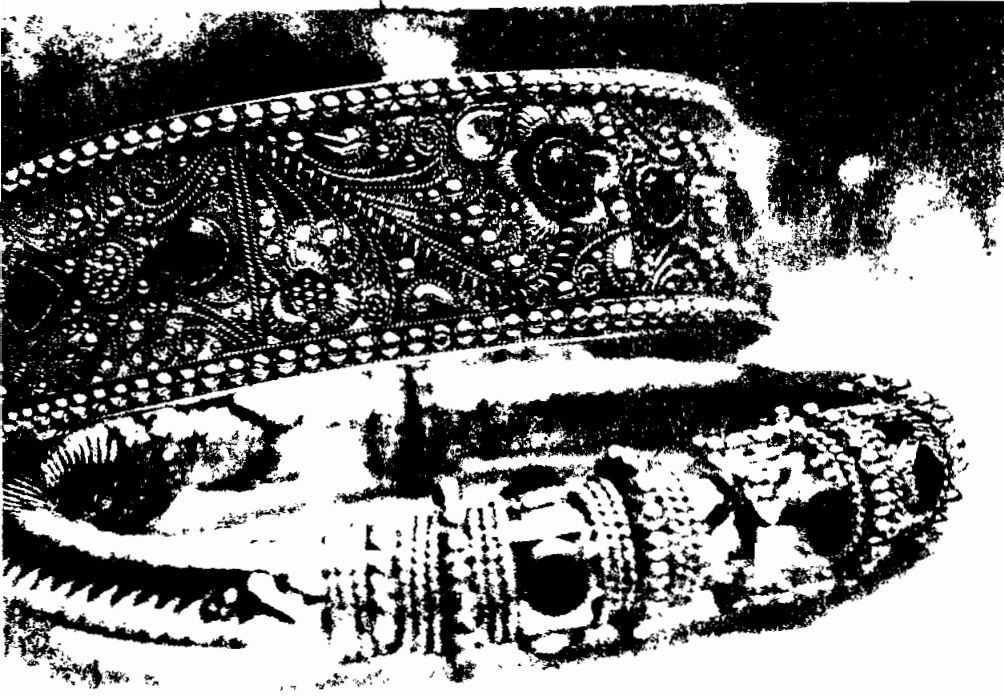
بھاگوان دُلہن

باپ کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ وہ انتہائی پریشان ہے۔ اس کے خیالات پراگندہ ہیں۔ وہ مایوسی کے عالم میں اپنی مجلس میں بیٹھا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ قرض کی ادائیگی کیسے کرے گا۔ قرض بھی کوئی معمولی نہیں۔ قرض خواہ نے اسے وارننگ دے دی تھی کہ اگر فلاں دن تک تم نے میرا قرض ادا نہیں کیا تو تمھیں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ فی الواقع عدالت نے بھی اُسے انتباہ کیا کہ اگر فلاں تاریخ تک قرضدار نے قرض خواہ کے واجبات کی ادائیگی نہیں کی تو اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔

باپ کے سامنے ادائے قرض کا کوئی حل موجود نہیں۔ وہ سراسیمہ ہے۔ اچانک

ایک حل سمجھ میں آتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ شاید بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے جیل کی سلاخیں بھی ہیں، اس لیے اسے زبان کھولے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔ وہ سامنے بیٹھی ہوئی اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی سے مخاطب ہے:

''بیٹی! تجھے معلوم ہے کہ مجھ پر ایک بھاری قرض ہے۔ میں فی الوقت ادائے قرض کی طاقت نہیں رکھتا۔ قرض خواہ نے مجھ پر عدم ادائے قرض کا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ عدالت کی طرف سے ایک مقررہ وقت پر مجھے قرض چکانا ہے، ورنہ مجھے جیل جانا پڑے گا۔ اب میرے پاس وقت بھی نہیں۔ تیرا کیا خیال ہے اگر میں تیری شادی ایک ایسے آدمی سے کر دوں جو مالدار بھی ہے اور اعلیٰ اخلاق کا مالک بھی۔ لیکن وہ بڑی عمر کا ہے۔ وہ تجھ سے شادی کے بعد میرا پورا قرض چکا دے گا اور مجھے جیل کی ہوا نہیں کھانی پڑے گی۔ اتفاق سے اُس آدمی نے میرے پاس تجھ سے شادی کا پیغام بھی دے رکھا ہے۔ میں چاہوں گا کہ تو استخارہ کر اور اس مالدار آدمی سے شادی کر لے، تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ میں اس سلسلے میں تیری رائے جاننا چاہتا ہوں۔''

اٹھارہ سالہ لڑکی نے باپ کی باتیں سنیں تو اس نے بوڑھے مالدار کے پیغام کو ٹھکرا دیا اور کہنے لگی: ابو جان! میں یہ رشتہ قبول نہیں کر سکتی۔ میں بڑی عمر کے آدمی سے ہرگز شادی نہیں کروں گی چاہے وہ کتنا ہی مالدار ہو۔ بھلا میری سہیلیاں مجھے کیا کہیں گی؟

باپ نے بیٹی کا دوٹوک فیصلہ سنا تو اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ کیونکہ اس کے

سامنے ادائے قرض کا یہی ایک راستہ تھا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اُس مالدار سے کر دے اور وہ مالدار اس کا قرض ادا کر دے۔ لیکن اس کی اس امید پر بھی پانی پھر گیا اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ غمگین ہوگیا۔ وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا اور جیل جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے شرم محسوس ہو رہی تھی کہ جب محلّہ والے اور اس کے دوست احباب سنیں گے کہ قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے اسے جیل میں ڈالا گیا ہے تو کیا کہیں گے۔ وہ اسی سوچ میں تھا۔ مارے غم کے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کمرے میں کسی کے داخل ہونے کی آہٹ ہوئی۔ لیکن وہ آنے والے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اچانک اس کے کانوں سے بیٹی کی آواز ٹکرائی:

''ابو جان! میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کی پسند کا رشتہ میں قبول کرتی ہوں۔ آپ جب چاہیں اور جس سے چاہیں میری شادی کر دیں۔ میں آپ کی خوشی کے لیے اپنی ساری خوشیاں قربان کر سکتی ہوں، اس لیے میری گزارش ہے کہ آپ غمزدہ نہ ہوں۔ میں راضی ہوں۔''

باپ نے یہ آواز سنی تو چونک پڑا۔ بیٹی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہنے لگا:

''چلو بیٹی، میں تو سمجھا تھا کہ تو راضی نہیں ہوگی۔ لیکن اللہ تیرا بھلا کرے کہ تو نے میری لاج رکھ لی۔ اللہ تجھے اس کا بہترین بدلہ عنایت فرمائے۔''

لیکن جب اس کی نگاہ اٹھی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے اس کی اٹھارہ سالہ بیٹی نہیں بلکہ اس کی دوسری بیٹی کھڑی تھی جس کی عمر پہلی بیٹی سے دو سال کم، یعنی سولہ سال کی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا اور اس کی اس قربانی پر اُسے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

اس کے بعد شادی کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ عقد نکاح لکھا گیا اور نکاح کے حوالے سے جو کاغذات درکار تھے، تیار کر دیے گئے۔ نکاح کی کارروائی کے فوراً بعد رخصتی نہیں ہوسکی۔ کیونکہ دولہا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ اسے کاروبار کے سلسلے میں جرمنی جانا تھا۔ اس نے لڑکی کے والد سے کہا کہ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں دو ماہ کے لیے جرمنی جا رہا ہوں۔ وہاں مجھے ایک کانفرنس میں شرکت بھی کرنی ہے۔ جب میں واپس آؤں گا تو دھوم دھام سے رخصتی ہوگی۔ میرا جرمنی جانا از حد ضروری ہے۔

چنانچہ سولہ سالہ لڑکی کا عمر رسیدہ تاجر شوہر جرمنی کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ وہاں اس نے مختلف پروگراموں میں شرکت کی۔ وطن لوٹنے کا وقت قریب تھا۔ وہ وطن آنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ایک روز وہ ٹیکسی میں کہیں جا رہا تھا کہ اچانک اس کی ٹیکسی حادثے کا شکار ہوگئی اور وہ جائے واردات ہی پر دم توڑ گیا۔ گھر والوں کے تقاضے کے مطابق اس کی لاش وطن پہنچائی گئی اور کفن دفن کا اہتمام ہوا۔ کفن دفن کے بعد جب اس کی جائیداد ورثاء میں تقسیم ہوئی تو اس سولہ سالہ دلہن کو دس ملین ریال ملے جو پاکستانی کرنسی میں تقریباً بائیس کروڑ روپے بنتے ہیں۔

سوگ کی مدت مکمل کرنے کے بعد اس سولہ سالہ دوشیزہ کی شادی ایک نوجوان سے ہوگئی۔ ادھر اس کے قرضدار باپ کا قرض بھی ادا ہوگیا اور وہ جیل جانے سے بچ گیا۔

قارئین کرام! دراصل اُس دوشیزہ نے اپنے والد پر احسان کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر فضل وکرم فرمایا۔ ہرچند اس کی شادی ایسے عمر رسیدہ تاجر سے ہوئی جو رخصتی سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوگیا مگر دلہن کو اس کے ورثے میں سے اتنی بھاری رقم ملی جو

اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی موقعے کے لیے، یہ آیت اتاری ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ﴾

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہوگا۔'' [1]

[1] الطلاق 65:2-3.

[2] یہ قصہ شیخ عصام العوید کی کیسٹ میں بھی سنا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک کیسٹ ''الشمس والقمر'' کے نام سے مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ آپ اس میں یہ قصہ تفصیل کے ساتھ سن سکتے ہیں، یہ واقعہ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ آپ انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.gesah.net پر اس واقعے کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

ماں کی فرمائش

رسول اکرم ﷺ کے ارشادات میں جا بجا والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا تذکرہ ملتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے اولین شاگرد صحابۂ کرام تھے۔ وہ آپ ﷺ کی تعلیمات کا عملی نمونہ تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ماں کی اطاعت وفرماں برداری میں وہ مثال قائم کی جو ہر انسان کے لیے رہتی دنیا تک کے لیے اسوہ بنی رہے گی۔ ماں کی خدمت کے حوالے سے تاریخ میں اسلاف کرام کے بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں۔ ان ہی واقعات میں سے ایک درخشاں واقعہ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا بھی ہے جو ماں کے ساتھ وفاداری اور محبت کی اعلیٰ مثال ہے۔

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے بارے میں صحابہ کرام میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے چہیتے ہیں، چنانچہ وہ باتیں جن کے بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ سے کچھ عرض کرنے سے ڈرتے تھے، وہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے ذریعے پوچھا کرتے تھے۔ بلکہ رسول اکرم ﷺ نے ان کے بارے میں یہ بھی ارشاد فرما دیا تھا:

«إِنَّ أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ لَأَحَبُّ النَّاسِ إِلَيَّ، أَوْ مِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ، وَأَنَا أَرْجُو أَنْ يَكُونَ مِنْ صَالِحِيكُمْ، فَاسْتَوْصُوا بِهِ خَيْرًا»

''اسامہ بن زید میرے محبوب ترین لوگوں میں سے ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ تمھارے نیک لوگوں میں سے ہوگا، اس لیے تم اس کے ساتھ خیر و بھلائی کا معاملہ کرو۔'' [1]

صحابہ کرام بھی اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے بے حد محبت کرتے تھے۔ امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جب لوگوں کے لیے وظائف مقرر کیے تو سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے لیے سالانہ پانچ ہزار درہم مقرر فرمائے اور اپنے بیٹے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لیے دو ہزار درہم۔ اس موقع پر سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد محترم سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا:

«فَضَّلْتَ عَلَيَّ أُسَامَةَ، وَقَدْ شَهِدْتُ مَالَمْ يَشْهَدْ»

''آپ نے اسامہ کو مجھ پر فوقیت دی ہے، حالانکہ میں ان معرکوں میں حاضر ہوا ہوں جن میں وہ حاضر نہیں ہو سکے۔''

امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیٹے کے جواب میں ارشاد فرمایا:

«إِنَّ أُسَامَةَ كَانَ أَحَبَّ إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ مِنْكَ، وَأَبُوهُ كَانَ أَحَبَّ إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ مِنْ أَبِيكَ»

''اسامہ تمھاری بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب تھے اور اسامہ کے

---

[1] مسند أحمد: 89/2، والمستدرك للحاكم: 596/3، و المعجم الكبير للطبراني: 159/1.

والد (زید رضی اللہ عنہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تمھارے باپ سے زیادہ محبوب تھے۔'' [1]

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی والدہ اُم اَیمن رضی اللہ عنہا تھیں۔ جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گود کِھلایا تھا۔ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اپنی والدہ سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ ان کی ہر خواہش پوری کرتے اور حتی الامکان ان کی خدمت میں مصروف رہتے۔ مدینہ منورہ میں ان کا ایک باغ تھا۔ اس باغ میں کھجور کے بہت سارے درخت تھے۔ بلکہ مؤرخین کی ایک روایت کے مطابق ان کے کھجور کے باغ میں تقریباً ایک ہزار درخت تھے۔ ایک روز ان کی ماں نے اپنے بیٹے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے ''جُمار'' کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ عربی زبان میں ''جمار'' اس مغز کو کہتے ہیں جو کھجور کے درخت کے درمیانی حصے میں ہوتا ہے۔ وہ مغز اسی صورت میں نکالا جا سکتا ہے جبکہ اسے جڑ سے کاٹ دیا جائے، چنانچہ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے ماں کی فرمائش کی تکمیل کے لیے ایک پھلدار کھجور کا پیڑ کاٹ ڈالا اور اس میں سے مغز نکال کر ماں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب لوگوں نے پھلدار درخت کو اس طرح کاٹتے دیکھا تو وہ کہنے لگے کہ کھجور کا یہ درخت بڑا پھلدار ہے اس کا مغز نکالنے کے لیے اس طرح بے دردی سے اسے کاٹنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ نے یہ عمدہ پھلدار درخت جڑ سے کاٹ دیا؟

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے ساتھیوں کی بات سن کر فرمایا:

«لَيْسَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا تَطْلُبُهُ أُمِّي أَقْدِرُ عَلَيْهِ إِلَّا فَعَلْتُهُ»

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: أسد الغابة: 194/1 دار الکتب العلمیة بیروت کا ایڈیشن۔

''اِس دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز جس کی فرمائش میری والدہ کریں اور میں اسے پوری کرنے کی طاقت رکھتا ہوں تو میں ان کی فرمائش پوری کر کے رہوں گا۔'' [1]

قارئین کرام! یہ ہے صحابہ کرام کی اپنی ماؤں کے ساتھ محبت کی ایک مثال۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جن سے ہمارے اسلاف کی اپنے والدین خاص طور پر والدہ کے ساتھ محبت کا پتہ چلتا ہے۔ اس واقعہ کو پڑھ کر اندازہ کریں اور اپنے دل سے پوچھیں کہ کیا آپ بھی اپنی والدہ کی فرمائش اسی طرح پوری کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں جس طرح سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے اپنی والدہ کی فرمائش کی خاطر ایک قیمتی پھلدار درخت بے دریغ کاٹ ڈالا تھا۔ کاش! ہمارے سینوں میں بھی صحابہ کرام جیسا جذبہ بیدار ہو جائے، تاکہ ہم بھی ماں کی خدمت کر کے آنے والی نسل کے لیے زندہ و تابندہ مثال بن سکیں۔ [2]

---

[1] المعجم الكبير للطبراني: 159/1، حديث: 370 . [2] سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا یہ واقعہ تاریخ کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔ آپ جب انٹرنیٹ پر سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اور ماں کے ساتھ ان کی محبت اور اطاعت کے حوالے سے سرچ کریں گے تو آپ کو یہ واقعہ بھی مل جائے گا۔

ماں کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار

تاریخ کی کتابوں میں والدین کی اطاعت وفرماں برداری کے حوالے سے بڑا سرمایہ موجود ہے۔ ہمارے اسلاف میں سے بہت سی ہستیاں ایسی گزری ہیں کہ باہر کی دنیا میں ان کا وقار اور ان کا رعب ودبدبہ مثالی مقام رکھتا تھا۔ مگر گھر کے اندر وہ اپنی ماں کے ساتھ اس قدر ادب واحترام سے پیش آتے تھے جیسے وہ طفلِ مکتب ہوں۔ دنیا میں دور دور تک ان کے علم اور فضل کا شہرہ ہوتا مگر وہ اپنے والدین کی خدمت میں انتہائی خاکسار، متواضع اور باادب بیٹے کی طرح رہتے تھے۔

ماں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے والی بزرگ ہستیوں میں سے ایک نام علی بن حسین رحمہ اللہ کا بھی آتا ہے، ان کا لقب زین العابدین تھا۔ یہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پوتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑنواسے تھے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کی دادی تھیں۔ ان کی پیدائش سن 27 ہجری میں ہوئی۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور شعبان کی سات تاریخ تھی۔ ان کی ولادت کے موقعے پر ان کے دادا جان سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور ان کے کان میں اذان دی جیسا کہ ان کے

والد اور اپنے صاحبزادے سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے کان میں اذان دی تھی۔

مؤرخین کے ایک قول کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل علی بن حسین رحمہ اللہ ہی سے چلی۔ کیونکہ حادثۂ کربلا میں خاندانِ نبوت میں یہی ایک زندہ بچ گئے تھے۔ یہ خیمے کے اندر بیماری کی حالت میں بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ بعد میں انھیں بھی قیدیوں کے ساتھ کوفہ میں ابن زیاد کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔

جب زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ کی عمر سترہ سال کی ہوئی تو ان کی شادی ان کے چچا سیدنا حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کی صاحبزادی فاطمہ بنت حسن سے ہو گئی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ زین العابدین رحمہ اللہ کے تعلقات لوگوں کے ساتھ بہت اچھے تھے، اس لیے سبھی لوگ ان سے شدید محبت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ اپنی والدہ کی بے حد عزت کرتے تھے۔ والدہ کے ساتھ ان کی محبت والفت، ہمدردی اور اطاعت و فرماں برداری کی مثال دی جاتی تھی۔

ماں کے لیے زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ کی بے حد تکریم دیکھ کر ایک دفعہ لوگوں نے ان سے دریافت کیا:

«إِنَّكَ مِنْ أَبَرِّ النَّاسِ بِأُمِّكَ، وَلَا نَرَاكَ تَأْكُلُ مَعَهَا؟»

''آپ اپنی والدہ کے ساتھ سب سے زیادہ بھلائی کرنے والے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا:

«أَخَافُ أَنْ تَسْبِقَ يَدِي إِلٰى مَا سَبَقَتْ إِلَيْهِ عَيْنُهَا، فَأَكُونَ قَدْ

عَقَقْتُهَا»

''مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں میرا ہاتھ (کھانے کی پلیٹ سے) وہ چیز پہلے نہ اٹھا لے، جسے میری ماں نے میرے اٹھانے سے پہلے دیکھ لیا ہو اور وہ اسے کھانا چاہتی ہوں، اس لیے میں اپنی والدہ کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا کہ اگر میں نے وہ چیز پہلے اٹھالی جسے میری ماں کھانا چاہتی تھیں تو اس طرح میں اس کا نافرمان ٹھہروں گا۔'' [1]

سبحان اللہ! ذرا غور کریں ماں کے ساتھ زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ کے حسنِ سلوک پر۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف اپنی ماؤں سے کیسی والہانہ محبت کرتے تھے اور ماں باپ کے ساتھ ان کا طرزِ عمل کس قدر مہذب اور مہربانی والا ہوتا تھا۔

[1] شذرات الذهب في أخبار من ذهب: 105/1.

درحقیقت اچھے اور پاکیزہ گھرانے کی اولاد بھی اپنے بزرگوں کی ہم خیال اور ہم مذاق ہوا کرتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ خاندان کا انسانی زندگی پر زبردست اثر ہوتا ہے۔ سیدنا زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ بھی خاندانِ نبوت کے وہ چشم و چراغ تھے جن سے اہل بیت کا سلسلہ آگے چلا۔ ان کے حکیمانہ اقوال میں سے یہ قول معروف ہے۔

«مَنْ قَنَعَ بِمَا قُسِمَ لَهُ أَغْنَى النَّاسِ»

''جس نے اپنی تقدیر میں لکھے ہوئے پر قناعت کرلی، وہی لوگوں میں سب سے زیادہ بے نیاز ہے۔''

سیدنا زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا اور بقیع نامی معروف قبرستان میں دفن کیے گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون. [1]

---

[1] یہ واقعہ تاریخ اور سیرت کی مختلف کتابوں سے یکجا کر کے لکھا گیا ہے۔ تاریخ کی مشہور اور مراجع کی کتابوں میں سیدنا زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ کے سوانح حیات مذکور ہیں۔

چھوٹے سے بچے کی بڑی بڑی باتیں

دوپہر کا وقت تھا۔ ماں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر اُن کے اسباق دیکھ رہی تھی۔ اسکول میں بچے جو کتابیں پڑھ کر واپس گھر آئے تھے اسی حوالے سے وہ بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے بچوں میں ایک ننھامُنّا سا بچہ بھی تھا۔ اس کا ابھی اسکول میں داخلہ نہیں ہوا تھا۔ کاپیاں چیک کرنے کے بعد ماں بچوں کے پاس سے اٹھی اور اپنے عمر رسیدہ سسر کو دوپہر کا کھانا دینے چلی گئی۔

بوڑھا سسر، یعنی اس خاتون کے شوہر کا والد گھر کے سامنے بنے لان میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ ہر چند یہ لان گھر سے متصل ہی تھا مگر سسر کا کمرہ گھر سے کوئی پچیس تیس میٹر کے فاصلے پر تھا۔ بہو سُسر کو اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ شوہر نے بیوی کی ضِد پر اپنے والد کو گھر سے ملحقہ لان کے سرونٹ کوارٹر میں منتقل کر دیا۔ خاتون نے حسبِ معمول سسر کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کیا اور اس کے کمرے میں پہنچایا۔ سسر نے کھانا کھا لیا تو وہ برتن لے کر واپس گھر میں داخل ہوئی۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُس کا وہ ننھا بچہ جس نے ابھی تک اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا، ہاتھ میں قلم لیے ٹیڑھی سیدھی ڈرائنگ کر رہا تھا۔

اسے سخت حیرت ہوئی کہ اتنا چھوٹا سا بچہ اس قدر دھیان سے کیسے ڈرائنگ کر رہا ہے۔

وہ بچے کے پاس بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی: بیٹا! یہ تم کیا کر رہے ہو؟

میں اپنے لیے گھر بنا رہا ہوں۔ جب میں بڑا ہو جاؤں گا اور میری شادی ہو جائے گی تو میں، میری بیوی اور بچے اس گھر میں رہیں گے۔ بچے نے جواب دیا۔

ماں بچے کی یہ بات سن کر ہکا بکا ہوگئی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا بچہ اتنی بڑی بات کرسکتا ہے۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس کا بچہ اب زبان کھولنے اور باتیں کرنے لگا ہے، پھر ماں نے دیکھا کہ بچے نے اپنے مستقبل کے لیے جو گھر ڈرائنگ کیا ہے اس میں ایک مربع شکل کی لکیر بھی کھنچی ہوئی ہے۔ اس نے بچے سے پوچھا: بیٹا! یہ تو گھر ہے جو تم نے ڈرائنگ کیا ہے مگر یہ مربع شکل کی لکیریں کیا ہیں؟

بچے نے بغیر سوچے ہوئے جھٹ سے جواب دیا: یہ میری امی جان کا گھر ہے۔ یہ میں نے آپ کے لیے بنایا ہے۔ آپ جب بوڑھی ہو جائیں گی تو میں اپنے اِس گھر میں رہوں گا اور آپ اس مربع شکل والے گھر میں رہیں گی۔

ماں: تم مجھے اپنے گھر سے الگ رکھو گے جہاں میں اکیلی رہوں گی، جہاں کوئی میرا غمخوار نہ ہوگا اور میں اکیلے گھٹ گھٹ کر زندگی گزاروں گی؟

بچے نے جواب دیا: نہیں ماں! میں آپ کو اکیلا نہیں رہنے دوں گا بلکہ جیسے دادا جان کا وہ کمرہ ہے نا، اسی طرح آپ کے لیے بھی بناؤں گا اور آپ کے پاس کبھی کبھی پھیرا لگاتا رہوں گا۔ میری بیوی آپ کے پاس کھانا لے جایا کرے گی۔

ہر چند بچے کی یہ باتیں غیر شعوری طور پر اس کی زبان سے نکلی تھیں۔ لیکن ماں کو اس کی باتیں سن کر بڑا جھٹکا لگا۔ عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اس کے لیے اپنے

چھوٹے سے بچے کی باتوں میں ایک بہت بڑا پیغام تھا، ایک درسِ عبرت تھا۔ اس نے بچے کی بات پر غور کیا، پھر سسر کے ساتھ اپنے رویے کا جائزہ لیا اور اپنے دل میں کہنے لگی:

"اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ننھے منے بچے کی زبان سے ایسی بات سنوا دی جو ہمارے لیے درسِ عبرت ہے۔ ہمیں سدھرنے کا موقع مل گیا۔ نہ جانے ہمارے دل میں یہ بات آتی یا نہ آتی کہ ہماری اولاد بھی ہم سے وہی برتاؤ کرے گی جو ہم اپنے والدین کے ساتھ کریں گے۔"

اس نے سسر کو فوراً سرونٹ کوارٹر سے اپنے گھر میں منتقل کیا اور ایک عمدہ کمرہ اس کے لیے خاص کر دیا۔ پھر سُسر کے لیے ہر طرح کی سہولت کا خیال رکھا۔ سُسر کمرے میں آیا تو اس کا چہرہ مارے خوشی کے تمتما اٹھا۔ وہ اپنے پوتوں اور پوتیوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر نہال ہوگیا۔

شوہر شام کو آفس سے گھر آیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس کے والد کا بیڈ روم اس کے گھر سے متصل کمرے میں سجایا گیا ہے اور صفائی ستھرائی کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں کوئی خواب دیکھ رہی ہیں پھر اس نے بیوی سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ والد صاحب کا بیڈ روم گھر کے اندر؟ میں کچھ سمجھا نہیں میڈم، آخر یہ نقل مکانی کس طرح ہوگئی؟ بیوی نے شوہر سے کہنا شروع کیا:

بات یہ ہے کہ میں آپ کے والد کے لیے دوپہر کا کھانا لے کر گئی۔ جب انھیں کھانا دے کر واپس آئی تو دیکھا کہ ہمارا ننھا لاڈلا سفید کاغذ پر ڈرائنگ کر رہا ہے۔ اس نے شوخ لکیروں کے ذریعے ایک مکان بنایا۔ مکان سے دور ایک چھوٹا سا کمرہ بھی ڈرائنگ کیا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ کہنے لگا کہ یہ میرا مکان ہے اور وہ دور والا کمرہ

آپ کا اور ابو کا ہے۔ میں نے کہا کیا تم ہمیں اپنے گھر سے دور رکھو گے؟ کہنے لگا: جی ہاں! جس طرح میرے دادا جان ہمارے گھر سے دُور الگ کمرے میں رہتے ہیں، اسی طرح آپ بھی دور رہیں گی۔ اپنے لاڈلے کی یہ باتیں سن کر میرے سینے پر آہنی گھونسا لگا، پھر میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے فوراً یہ سارا اہتمام کیا ہے جو آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

بیوی کی باتیں سننے کے بعد شوہر مارے خوشی کے جھومنے لگا۔ اسے اپنے والد کے ساتھ بیوی کے بدلے ہوئے خوشگوار سلوک سے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے والد کو اپنے قریبی بیڈ روم میں دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔

قارئین کرام! یہ واقعہ اور اس سے ملتے جلتے اور بھی بے شمار واقعات ہیں جو ہمارے اردگرد رونما ہوتے رہتے ہیں۔ وہ خواتین اور وہ حضرات کتنے خوش قسمت ہیں جو اپنے ضعیف والدین اور بوڑھے ساس سسر کی اچھی سے اچھی خدمت کرتے ہیں مگر ایسی مثالیں بہت کم ہیں اکثر اوقات 'اولاد کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کے جذبات کو اچھی طرح نہیں سمجھ پاتی۔ حالانکہ والدین جب عمر کے آخری مرحلے میں پہنچ جاتے ہیں تو انھیں اپنی اولاد سے قربت بڑی محبوب ہوتی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھنے کے بے حد مشتاق رہتے ہیں۔ کاش! ہمارے سارے بہن بھائی اپنے والدین کے ساتھ وہی سلوک کریں جو مذکورہ خاتون نے اپنے بچے کی باتوں سے نصیحت پکڑ کر اپنایا تھا۔[1]

---

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لیے آپ انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.gesah.net کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ جہاں اس قسم کے کئی واقعات موجود ہیں۔

ماں کا قاتل

یہ اُس شخص کا قصہ ہے جس نے اپنی ہی ماں کا خون کر دیا تھا۔ یہ مصر کے معروف شہر اسکندریہ کا واقعہ ہے۔ اِس واقعے نے پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا۔ جدھر دیکھو اُدھر ہر ایک کی زبان پر یہ دل دہلا دینے والی خبر تھی کہ ایک بیٹے نے ایک یہودی لڑکی سے شادی کی خاطر اپنی مہربان ماں کو صرف اِس لیے قتل کر دیا کہ وہ یہودی لڑکی کو بہو بنانے پر راضی نہیں تھی۔

اِس واقعے کے راوی ابوعبد الرحمٰن کا بیان ہے کہ میں ایک روز جیل کی سلاخوں کے پیچھے جرائد ومجلّات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک واقعے پر پڑی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس خبر کی سرخی تھی ''ایک بھیانک جرم جس نے پورے اسکندریہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا!!۔''

خبر کی تفصیل بتاتے ہوئے اخبار نے لکھا تھا کہ اُس نوجوان کی خواہش تھی کہ وہ ایک یہودی لڑکی سے شادی کرے۔ مگر اس کی ماں اس رشتے کے بالکل خلاف تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے گھر میں کوئی غیر مسلم لڑکی قدم رکھے جس کی وجہ سے پوری نسل ہی کا دین ایمان داؤ پر لگ جائے۔ اس نے اپنے بیٹے کو لاکھ منع کیا مگر وہ اپنی

ضد پر اڑا رہا اور کہتا رہا کہ میں اُس یہودی لڑکی سے شادی کر کے ہی رہوں گا جسے میں نے پسند کر لیا ہے۔

اُدھر ماں نے فیصلہ سنا دیا کہ میرے گھر میں کوئی یہودن قدم نہیں رکھ سکتی کیونکہ ایک غیر مسلم لڑکی کا میرے گھر آنا میرے گھر کی توہین ہے۔ بیٹا ماں کی یہ باتیں سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ماں پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا مارا کہ ماں ہلاک ہو گئی۔

اُس نے غصے اور جذبات میں آ کر ماں کا خون تو کر دیا۔ مگر وہ بھی چین کی نیند نہ سو سکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسکندریہ کے قید خانے کی ہوا کھا رہا تھا۔ مقدمہ چلا۔ جج نے اسلامی قانون خون کا بدلہ خون کے تحت یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ماں کے خون کی پاداش میں اس کے بیٹے کو پھانسی دی جائے۔

اب بیٹا اپنے اس گھناؤنے فعل پر بہت نادم تھا۔ ماں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد یہ دنیا اور اس کی ساری نعمتیں اس کی نگاہ میں بہت حقیر نظر آ رہی تھیں۔ اُس کا ضمیر اُسے رات دن سرزنش کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس سے اتنا خوفناک مجرمانہ فعل کیسے سرزد ہو گیا؟ لیکن ہونی کو بھلا کون روک سکتا ہے؟ انسان بچاؤ کی خواہ کتنی بھی تدبیر کیوں نہ کر لے۔ مگر جو ہونی ہے ہو کر رہے گی۔

اتفاق سے میں بھی اسی جیل میں گرفتار ہو کر آیا تھا جس میں یہ نوجوان قید تھا۔ میں نے جب یہ خبر پڑھی کہ ماں کا قاتل مجرم بھی اسی قید خانے میں ہے جس میں، میں موجود ہوں تو مجھے اس سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہوا تاکہ اس سے حقیقتِ حال معلوم کروں۔ کیونکہ مجھے یہ بات بہت عجیب لگ رہی تھی کہ ایک بیٹا اپنی ہی ماں کو کیوں کر قتل

کرسکتا ہے؟

اتفاق سے ایک دن میری اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک دبلا پتلا، لمبے قد کا نوجوان تھا۔ بات چیت سے بڑا سنجیدہ اور معصوم نظر آ رہا تھا۔ میرا کمرہ بھی اس کے کمرے سے متصل تھا۔ وہ نماز کے لیے نکلتا تو میری طرف دیکھ کر جاتا۔ میرے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ وہ میری طرف برابر دیکھتا رہتا۔ ایک دفعہ وہ میرے پاس آیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنی کوئی گم شدہ چیز پا لی ہو۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا:

''بزرگوار! میں نے ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے، میں نے اپنی ماں کا خون کر دیا ہے، ایسی صورت میں کیا میرے لیے توبہ ہے؟ کیا میرے گناہ معاف ہو سکتے ہیں؟''

میں نے نوجوان سے کہا:

''میرے بھائی! تمھارا جرم کتنا ہی بڑا سہی مگر اللہ تعالیٰ کا عفو و درگزر اور بحرِ کرم اس سے کہیں بڑا ہے۔''

تم نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اس کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾

''اے نبی! میری جانب سے کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ

سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش اور بڑی رحمت والا ہے۔" [1]

اس آیتِ کریمہ کا سننا تھا کہ نوجوان کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا، پھر میں نے اس سے کہا: میرے بھائی! اللہ کے دربار میں کثرت سے توبہ واستغفار کرو۔ اپنی ماں کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگو۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری دعاؤں کی بدولت تمھاری ماں کی مغفرت فرما دے اور ماں کی معافی کے بعد اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمھیں بھی معاف فرما دے، اس لیے تم زیادہ سے زیادہ توبہ واستغفار کرو۔

اتنی باتوں کے بعد میرے اور اس نوجوان کے درمیان جدائی ہو گئی۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے پاؤں میں بھی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں اسی کمرے میں رہتا تھا جس میں پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔

نوجوان سے ملاقات ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان پھانسی والے کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ میں نے اسے گلے سے لگا لیا اور پوچھا: کیا تم مجھے پہچان رہے ہو؟ اس نے جواب دیا: ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں آپ کو اچھی طرح پہچان رہا ہوں۔ آپ ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیا۔ میں آپ کو یہ خوشخبری سناتا چلوں کہ آپ سے جب پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے مجھے کثرت سے توبہ واستغفار کرنے کو کہا تھا تو میں اس روز سے پابندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتا رہا ہوں اور اپنی ماں کے لیے بھی دعائیں کرتا رہا ہوں۔ اس کے بعد سے مجھ پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب میں نے توبہ واستغفار اور قرآنِ کریم کی تلاوت سے غفلت برتی ہو۔

---

[1] الزمر 39:53.

واقعی نوجوان نے جس طرح مجھے بتلایا، ویسا ہی اس کا عمل بھی تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑی کثرت سے توبہ واستغفار کرتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت پابندی سے کرتا ہے، ہر سات دن کے دوران ایک مرتبہ ضرور قرآن ختم کرتا ہے اور ہر وہ کام انجام دیتا ہے جس کے بارے میں بتلایا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے تیری ماں کی مغفرت ہوگی اور تجھے بھی اللہ کے دربار میں نجات مل جائے گی۔ رسول اکرم ﷺ کے بتلائے ہوئے ذکر واذکار کا ورد اس کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکا تھا۔

ایک دفعہ کسی نے اُسے بتلایا کہ قرآن کریم کا مکمل حافظ قیامت کے روز دس آدمیوں کی سفارش وشفاعت کرے گا اور اس کے والدین کے سر پر قیامت کے دن جگمگاتا ہوا تاج رکھا جائے گا۔ وہ فوراً میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا: بزرگوار! کیا یہ بات صحیح ہے؟

میں نے جواب دیا: ہاں، یہ بالکل درست ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد مبارک کے مطابق ایسا ہی ہوگا۔

وہ کہنے لگا: کیا میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اس اعلیٰ درجے کو پہنچ جاؤں؟

میں نے کہا: رب کعبہ کی قسم! یہ ممکن ہے۔ اللہ پر بھروسہ کرو اور اس مبارک مقصد کے حصول میں لگ جاؤ۔ میں نے اسے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب اسلام کی نعمت سے صحابہ کرام کو مالا مال کیا تو وہ اس وقت تعداد میں کم ہوتے تھے، ان کے اندر اخلاق وکردار کی بے حد کمی تھی، وہ کفر کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے مگر جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اسلام کی نعمت سے سرفراز کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس روئے زمین کی ساری اقوام سے بہتر ہوگئے۔ انھوں نے اپنے پرانے گناہوں سے اللہ کے دربار

میں توبہ کی اور اپنی مغفرت چاہی تو اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور ان کے گزشتہ گناہوں کو بالکل معاف فرما دیا، اس لیے آج بھی اگر کوئی بڑے سے بڑے گناہ کا مرتکب اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے توبہ کرے گا تو وہ اسے ضرور معاف فرما دے گا۔ اللہ کا رحم وکرم اس کے غیظ وغضب پر بھاری ہے۔

میری باتیں سن کر نوجوان کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ وہ کہنے لگا: بزرگوار! میرا گناہ بڑا ہی نہیں بلکہ بہت ہی بڑا ہے، میں نے کسی عام انسان کا خون نہیں کیا، بلکہ میں اپنی ماں کا قاتل ہوں ماں کا!!......اور پھر وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

میں نے کہا: میرے بھائی! تمھیں اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے خوش ہونا چاہیے۔ وہ بڑے سے بڑا گناہ بھی توبہ واستغفار سے معاف فرما دیتا ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ قرآن کریم میں خود اللہ تعالیٰ کا کیا فرمان ہے؟ وہ ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكَ وٰسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۚ﴾

''بے شک تیرا پروردگار بہت زیادہ مغفرت فرمانے والا ہے۔''[1]

میرے بھائی! کیا تم نے رسول اکرم ﷺ کی یہ حدیث نہیں سنی؟ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

«إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الرَّحْمَةَ يَوْمَ خَلَقَهَا مِائَةَ رَحْمَةٍ، فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعًا وَّتِسْعِينَ رَحْمَةً، وَأَرْسَلَ فِي خَلْقِهِ كُلِّهِمْ رَحْمَةً وَاحِدَةً، فَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ بِكُلِّ الَّذِي عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ لَمْ يَيْأَسْ مِنَ الْجَنَّةِ، وَلَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ بِكُلِّ الَّذِي عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعَذَابِ لَمْ

---

[1] النجم 32:53.

يَأْمَنْ مِنَ النَّارِ»

''اللہ تعالیٰ نے سو رحمتیں پیدا کیں، اُن میں سے اس نے اپنے پاس ننانوے (۹۹) رحمتیں رکھ لیں اور صرف ایک رحمت اپنی تمام مخلوقات پر اتاری۔ اگر کافر کو اللہ تعالیٰ کے پاس موجود تمام رحمتوں کا علم ہو جائے تو وہ جنت سے مایوس نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر مؤمن کو اللہ کے پاس جو عذاب ہے، اس کا علم ہو جائے تو وہ جہنم سے خود کو مطمئن نہیں پائے گا۔'' [1]

میرے بھائی! ذرا سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے پوری مخلوقات کے درمیان صرف ایک رحمت تقسیم کی ہے اور اسی رحمت کی وجہ سے جانور بھی اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں۔ اسی ایک رحمت کے سبب جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا ہے، کافروں کو بھی روزی عنایت کی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دنیا میں نظر اٹھا کر دیکھو کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے کافر بھی دنیاوی معاملات میں کس قدر آگے ہیں اور انھیں دنیا میں کیسی کیسی نعمتیں دستیاب ہیں۔ انھیں یہ نعمتیں اسی رحمت کے سبب ملتی ہیں۔ پھر ذرا سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس جو ننانوے رحمتیں رکھ چھوڑی ہیں، ان کے دائرے میں کتنے لوگ آئیں گے اور کیسے کیسے لوگوں کی مغفرت ہو جائے گی؟ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کو دیکھ کر شیطان بغلیں جھانکے گا اور دم دبا کر بھاگے گا کہ اس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کو بہت زیادہ بھٹکایا، پھسلایا اور برائیوں پر اُکسایا۔ لیکن آج قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مغفرت فرما کر شیطان کی

[1] دیکھیے صحیح البخاري، الرقاق، حدیث: 6469، صحیح مسلم، التوبة، حدیث: 2752.

کوششوں پر پانی پھیر رہا ہے۔

سبحان اللہ...... نوجوان نے میری باتیں سنیں تو اُس کا چہرہ مارے خوشی کے کھل اُٹھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ قرآن کریم ضرور حفظ کرے گا، چنانچہ قرآن کریم کا حفظ اس کی روٹین میں شامل ہو گیا۔ وہ روزانہ قرآن کریم کا کچھ حصہ حفظ کرتا۔ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سناتا۔ رفتہ رفتہ اُس کے حفظ کی رفتار بڑھتی گئی اور ایک دن واقعی وہ حافظ قرآن بن گیا!! ..... قرآن کریم کے ساتھ وہ حدیث اور عقیدے کی کتابیں بھی پڑھا کرتا تھا۔ سیرت کی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ رات کو تہجد پڑھتا اور ہر چوتھے پانچویں روز قرآن ختم کرتا۔ اس نے قتل کے کفارہ کے طور پر مسلسل دو ماہ کے روزے بھی رکھے۔ اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ وہ ایک دن روزہ رکھتا اور ایک دن افطار کرتا۔ اس کے اعمالِ صالحہ کو دیکھ کر مجھے اس کی زندگی پر رشک آتا تھا۔

بسا اوقات وہ مجھ سے کہا کرتا کہ مجھے اپنے پروردگار سے ملاقات کا بے حد شوق ہو رہا ہے۔ میرے لیے سب سے اچھا دن وہی ہوگا جس روز مجھے پھانسی پر چڑھایا جائے گا۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ اُس روز میں اپنے رب ذو الجلال سے ملوں گا جو اپنے گنہگار بندوں کو معاف فرماتا ہے۔

میں نے اُس سے کہا: تمھارے شب و روز دیکھ کر لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے نیک اور مقرب بندوں میں شامل کر لے گا۔

نوجوان نے عرض کیا: محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے کچھ ہی دنوں میں اس دنیا کے قید خانے سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ آپ مجھے ایسی نصیحت کریں جس پر عمل کر کے میں

سرخرو ہو جاؤں۔

میں نے اس سے کہا کہ کثرت سے لا إله إلا اللّٰہ کا ورد کرو۔

وہ کہنے لگا: آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے کہ میں یہ دعا پڑھا کروں:

﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (الأنبياء 87:21)

مجھے اُس کی بات سن کر خوشی ہوئی۔ میں نے کہا: میرے عزیز! تم نے ایک بہت ہی عظیم دعا اختیار کی ہے۔ بلاشبہ تم اس دعا کو بہت کثرت سے پڑھا کرو۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ اس کے ذریعے تم پر ضرور رحم فرمائے گا اور تمھاری مغفرت کرے گا۔ اور ہاں، پھانسی پر لٹکائے جانے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنا مت بھولنا اور اپنی زبان کو ذکر واذکار سے تر رکھنا۔

اس نوجوان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ اُس نے یہ سب اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیں اور اگلے دن کی تیاری کرنے لگا۔ کیونکہ آنے والے دن میں صبح سات بجے اُسے پھانسی دی جانی تھی۔

فجر کی اذان ہوئی۔ میں نیند سے بیدار ہوا۔ نوجوان نے نماز فجر ادا کی اور ذکر واذکار میں لگ گیا، پھر پھانسی کا وقت آن پہنچا۔ جب وہ پھانسی پر چڑھنے جا رہا تھا تو اُس کا گزر میرے پاس سے ہوا۔ وہ آیت کریمہ کثرت کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ کھڑکی میں سے قیدی اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کو سلام کرتے ہوئے پھانسی کے پھندے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ کلمہ شہادت بھی کثرت سے پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث کے مطابق جس کا آخری کلمہ لا إله إلا اللّٰہ ہوگا وہ جنت

میں جائے گا۔ [1]

اب وہ پھانسی کے تختے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے پھانسی پانے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

پھانسی پر چڑھنے سے چند دن پہلے اُس نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا تھا۔ اُس کی ماں خواب میں اُس سے کہہ رہی تھی: ''بیٹا! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں تجھ سے راضی ہوں۔ میں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔'' [2]

---

[1] سنن أبي داود، الجنائز، حديث: 3116. [2] یہ قصہ مختلف عربی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ مگر میں نے اسے انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.gesah.net کے حوالے سے قارئین کی نذر کیا ہے۔

اُس ناسعید بیٹے کی قسمت اُلٹ گئی

اللہ کے رسول ﷺ ایک مرتبہ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ انھیں والدین کے حقوق سے مطلع فرما رہے تھے۔ والدین کے مقام اور مرتبہ کے حوالے سے بات چیت چل رہی تھی۔ وہ ان کو والدین کی نافرمانی سے ڈرا رہے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

«رَغِمَ أَنْفُهُ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُهُ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُهُ»

''اس شخص کی ناک خاک آلود ہو، پھر اس شخص کی ناک خاک آلود ہو اور پھر اس شخص کی ناک خاک آلود ہو۔''

صحابہ کرام خوف زدہ ہو گئے کہ ایسا بدبخت کون ہے جس کے بارے میں رسالت مآب ﷺ ایسے سخت الفاظ ارشاد فرما رہے ہیں۔ ارشاد ہوا:

«مَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ أَحَدَهُمَا أَوْكِلَيْهِمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ»

''ایسا بدبخت وہ شخص ہے جس نے اپنے والدین میں سے دونوں کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر بھی وہ جنت میں داخل

نہ ہوسکا۔‘‘ [1]

قارئین کرام: یہ حدیث بڑی اہم ہے اور ہم سے گہری سوچ بچار کا تقاضا کرتی ہے۔ والدین اپنی اولاد کو جنت میں کیسے داخل کرا سکتے ہیں؟ اگر اولاد نیک ہو، والدین کی خدمت کرے اُن کو راضی رکھے تو پھر وہ اس کے لیے دعائیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوں گے اور اولاد کے لیے ان شاء اللہ جنت کے دروازے کُھل جائیں گے۔

قارئین کرام! بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان رحمہ اللہ اُردو کے بڑے قادر الکلام اور صاحبِ اسلوب شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے بے مثل انداز میں صحیح مسلم کی متذکرہ بالا حدیث کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس لطفِ سخن میں آپ کو بھی شامل کروں۔ آیئے مولانا رحمہ اللہ کی نظم پڑھیے:

اک دن نبی ﷺ نے حلقۂ اصحاب میں یہ لفظ
دہرائے تین بار کہ ’’ناک اس کی کٹ گئی‘‘

اصحاب نے کہا کہ یہ کم بخت کون ہے؟
توقیر جس کی حضرتِ باری میں گھٹ گئی

ارشاد یوں ہوا کہ وہ فرزندِ ناخلف
گھر جس کے جنت آئی اور آ کر پلٹ گئی

ماں باپ کا جسے نہ بُڑھاپے میں ہو خیال
اُس ناسعید بیٹے کی قسمت الٹ گئی

---

[1] صحیح مسلم، البر والصلة، حدیث: 2551.

اور میری ماں چل بسی

میں انتہائی بدنصیب ہوں۔ میری حالت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ میں نے زندگی بھر کبھی اپنی ماں کے حکم سے سرتابی نہیں کی۔ میری ماں جو کچھ بھی طلب کرتی، میں بلا چوں چرا اُس کے حکم کی تعمیل کر دیتا۔ میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھ جیسے وفاشعار اور ماں کے اطاعت گزار سے ایسی حرکت بھی سرزد ہوسکتی ہے جو میرے لیے زندگی بھر کے پچھتاوے کا سبب بن جائے گی۔ لیکن آہ! آج میری حسرت اور میرا افسوس کس کام کا؟ اب اِس دنیا میں نہ میری ماں رہی، نہ اس کا پیار، اللہ اللہ! ماں کتنی بڑی نعمت ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے:

ع دنیا میں آکے جس نے دیکھا نہ پیار ماں کا وہ پھول ہے خزاں کا!

اب اگر میں خدمت کرنا بھی چاہوں تو ماں کہاں سے لاؤں؟ ہاں وہ ماں، جس کے قدموں تلے جنت ہے۔ جس کے حکم پر عمل کرنا عبادت ہے۔ جس کی ہاں میں ہاں ملانا بے شمار نیکیوں کا باعث ہے۔ جس کی طرف مسکرا کر دیکھ لینا بھی عبادت ہے۔

ہاں، اب میں اِس کے سوا کیا کرسکتا ہوں کہ اپنا دردِ دل سناؤں اور آپ کو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں چند نصیحتیں کر دوں۔

میں انٹرنیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے قرآن کریم کی بعض آیات کی تفسیر تھی۔ میں اُن کا بغور مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں ایک آیت کی تفسیر پر غور کر کے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے سامنے کئی اقوال آتے تھے مگر میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے کئی پہلوؤں سے ان آیات کا مفہوم سمجھنا چاہا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اس گتھی کو سلجھانا چاہتا تھا۔ آج میں نے عزم کر لیا تھا کہ انٹرنیٹ سے اس وقت تک نہیں اٹھوں گا جب تک یہ شرح اچھی طرح میری سمجھ میں نہ آ جائے۔

مگر آج مجھے اپنے آپ پر اس قدر افسوس ہو رہا ہے کہ میں اسے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میں اپنے مسئلہ کو سلجھانے کے لیے انٹرنیٹ پر مختلف کتبِ تفسیر کے مطالعہ میں منہمک تھا، اس دوران میری ماں نے آواز دی۔ مجھے ماں کی آواز سنائی نہیں دی۔ اس نے ایک دو بار آواز دی مگر میرا دھیان اس کی آواز کی طرف نہیں گیا، اس لیے میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ لیکن اب اُس کی آواز بلند ہو چکی تھی۔ اس کی آواز میرے کانوں تک آ رہی تھی۔ لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی لیکن آج جبکہ میری ماں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی ہے، اس کی وہ آواز میرے کانوں میں مسلسل گونج رہی ہے۔ میری ماں مجھے آواز دیتے ہوئے کہہ رہی تھی:

''بیٹا! میری تمنا ہے کہ تم میرے پاس آؤ، بیٹھو، میں تم سے کچھ دل کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں آج تم سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا، اس لیے چاہتی ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے رہو، میں تمھیں کچھ یادیں اور کچھ باتیں سناتی رہوں اور رات اسی طرح

ڈھل جائے!......"

جب میں نے اُس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی جہاں میں کمپیوٹر پر بیٹھا مطالعے میں مگن تھا۔ وہ اب میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی: "بیٹا! یہ کمپیوٹر چھوڑ دو۔ آؤ میرے پاس آ بیٹھو۔ اِس بڑھاپے میں نہ جانے کیوں تم سے اتنی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ کمپیوٹر سے اٹھو قدم بڑھاؤ اور میرے ساتھ چلو!...... بہت ساری باتیں سنانی ہیں تمھیں......"

میں نے اپنی ماں سے کہا: "امی جان! میں ایک آیت کی شرح تلاش کرنے میں کئی دنوں سے لگا ہوا ہوں۔ مسئلہ اُلجھا ہوا ہے۔ اِس بارے میں علمائے تفسیر کے اقوال بھی سمجھ میں نہیں آ رہے۔ آج اگر میں یہ مسئلہ حل کرنے مِیں کامیاب ہو جاتا ہوں تو یہ علم کی بہت بڑی خدمت ہوگی اور آنے والی نسل مجھے دعائیں دے گی!!...... دیکھو نا یہ شرح!!...... میں یہ عوام کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ یہ کتنا اچھا اور کتنا مبارک کام ہے!...... یہ کتنی عظیم خدمت ہے؟...... دیکھو نا میں اس معمے کے حل میں کس طرح ڈوبا ہوا ہوں!......"

مجھے آج بھی اچھی طرح سے یاد ہے کہ میری ماں کئی منٹ میرے پاس کھڑی رہی۔ وہ مجھے کمپیوٹر چھوڑنے کے لیے کہتی رہی مگر میں نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہاں، ایک دو مرتبہ اس کی طرف پیار سے ضرور دیکھا لیکن میں بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔ میری ماں مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد میرے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تو پتا چلا کہ میری ماں میرے پاس سے چلی گئی ہے۔
میں سوچ رہا تھا کہ چلو! آج اگر میں اپنی ماں کے بلانے پر اس کے پاس نہیں

جارہا،اور وہ مجھ پر ناراض ہو رہی ہے تو کوئی بات نہیں۔ان شاء اللہ کل میں اُسے منا لوں گا۔میری ماں تو میری ساری لغزشیں معاف کر دیتی ہے، پھر یہ کونسا بڑا جرم ہے۔ کل جب میں اس سے معافی مانگوں گا تو وہ مجھے معاف کر دے گی۔میں بھی تو دینی کام میں مشغول ہوں۔کل میں اپنی ماں کے سامنے اِس الجھے ہوئے مسئلے کو حل کر کے بتلاؤں گا تو وہ کس قدر خوش ہوگی اور مجھے معاف کر دے گی۔میرے دل میں یہ باتیں تھوڑی دیر کے لیے آئیں اور دور نکل گئیں۔میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔میں اس قدر مشغول تھا کہ اس کے بعد مجھے اپنی ماں کے بارے میں کوئی بات ہی یاد نہیں آئی۔مجھے اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ کچھ دیر پہلے میری ماں مجھے بلانے آئی تھی۔

پھر میں دیر تک انٹرنیٹ پر بیٹھا رہا۔جب میں نے مطلوبہ مسئلہ حل کر لیا پھر مجھے خیال آیا کہ اب ماں کے پاس چلنا چاہیے۔میں کمپیوٹر بند کر کے اپنی ماں کے پاس حاضر ہوا۔میں نے امی امی کہہ کر تین مرتبہ آواز دی۔میری امی کی عادت تھی کہ چاہے وہ کتنی ہی گہری نیند میں ہوتیں، جونہی میں ''امی'' کہتا وہ فوراً بیدار ہو جاتیں۔آج جب میں نے حسبِ معمول امی کہہ کر پکارا تو ان کی جوابی آواز نہیں آ سکی!!......

مجھے جھٹکا سا لگا کہ امی کی خاموشی اتنی بے لچک کیوں ہوگئی؟۔میں نے فوراً اپنی ماں کا ہاتھ چھو کر دیکھا کہ کہیں بخار تو نہیں۔میرا گمان سچ ثابت ہوا۔والدہ کا پورا جسم بخار کی شدت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ان کی آنکھیں سُرخ ہو چکی تھیں اور نورانی رخساروں پر آنسو ٹپک رہے تھے۔میں یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔امی جان سے کہا کہ ہمیں ہسپتال چلنا چاہیے۔مگر انھوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔اُن کی حالت دیکھ کر معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بڑی اذیّت میں ہیں۔

میں نے فوری طور پر اپنی ماں کو ہسپتال میں داخل کرایا۔ وہاں آناً فاناً ایمرجنسی وارڈ میں علاج شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے پوری دیانت داری سے میری والدہ کا علاج کرنا شروع کیا۔ والدہ کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں جس رفتار سے علاج ہو رہا تھا اس سے کہیں زیادہ رفتار سے میری والدہ کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر ایمرجنسی وارڈ سے باہر نکلا اور مجھے اپنے پاس بلا کر بولا:

''ہماری ٹیم تمھاری ماں کا علاج کرنے میں مصروف ہے۔ ہر ڈاکٹر اپنی ذمے داری نبھا رہا ہے۔ مگر تمھاری ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اب تک کی رپورٹ کے مطابق اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ ہاں! اس کے جگر میں شدید درد ہے۔ وہ ابھی بول نہیں سکتی۔ نہ اس سے کلام کرنا مناسب ہے، اس لیے تم باہر ہی رہو۔ انتظار کرو اور دعا کرو۔ ہم حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں کہ مریضہ ٹھیک ہو جائے۔''

ڈاکٹر صاحب! کیا میں اندر اپنی ماں کے پاس جا سکتا ہوں؟ مجھے ماں ہی کے پاس رہنے دیا جائے تو اچھا رہے گا۔ میں قریب رہ کر اچھی طرح ان کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔

''نہیں نہیں، تم اندر نہیں جا سکتے۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں، ورنہ مریضہ کا مرض مزید بڑھ جانے کا اندیشہ ہے''

ڈاکٹر کی بات مجھ پر بجلی بن کر گری۔ میں اندر ہی اندر گھٹن محسوس کرنے لگا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اپنے ضمیر کو ملامت کر رہا تھا۔ میں اپنی ماں کی بات مان کر اس کے ساتھ کیوں نہیں گیا۔ مجھ پر پڑھنے لکھنے اور لوگوں کی خدمت کرنے کا ایسا کونسا بھوت سوار ہو گیا تھا کہ میں نے اپنی ماں کی بات نہیں مانی۔

میں ویٹنگ ہال میں انتظار کر رہا تھا کہ میری ماں کے حوالے سے کوئی خوشخبری ملے۔ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے میری آنکھ لگ جاتی تھی مگر جلد ہی کھل بھی جاتی۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی تو میں اس کی طرف دیکھنے لگ جاتا کہ شاید میری ماں کے بارے میں کوئی رپورٹ آ رہی ہے۔ ایک دفعہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم تیزی کے ساتھ اسی وارڈ کی طرف جا رہی ہے جس میں میری ماں تھی۔ میں بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑا لیکن مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ابھی چند لمحے گزرے تھے کہ ڈاکٹر باہر نکلنے لگے۔ اسی دوران ایک نرس میرے پاس آئی اور کہنے لگی: ''اللہ تعالیٰ تمھیں زیادہ اجر عطا کرے اور تمھاری ماں کی مغفرت فرمائے۔''

﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ کیا میری ماں کا انتقال ہو گیا؟ یہ کیسے ہو گیا؟ میں تو اس کی ڈھیر ساری خدمت کرنا چاہتا تھا، یہ کیسے ہو گیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر دور بہت دور موت کی سرد وسنسان وادی میں چلی گئی۔

میں وارڈ میں داخل ہوا۔ ماں کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا اور ماں ماں کہہ کر آنسو بہانے لگا۔ آہ!...... قدرت کا یہی معمول ہے ایسے موقع پر چاہے کوئی کتنی بھی ہمدردی جتائے، تسلیاں دے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ موت بہت بڑی حقیقت ہے۔

؎ موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں!

ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں

[1] اس واقعے کو ہم نے ''انسائیکلو پیڈیا آف اسٹوریز'' سے نقل کیا ہے۔ جو انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.gesah.net پر موجود ہے۔ آپ بھی انٹرنیٹ کی مذکورہ سائٹ پر یہ قصہ آن لائن پڑھ سکتے ہیں۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

میری شادی کو اکیس سال گزر چکے تھے۔ میں اس دوران تین بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ میں اپنے کاروبار میں اس قدر مصروف تھا کہ ساری دنیا کو بھلا کر اپنے کام میں مصروف رہتا۔ دوستوں یاروں کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع بھی شاذ ونادر ہی مل پاتا، البتہ اِس روئے زمین پر ایک ایسی بھی ہستی تھی کہ میں گاہے بگاہے بیوی بچوں کے ساتھ اس سے ملاقات کے لیے جایا کرتا تھا۔ ٹیلی فون کے ذریعے ہمیشہ اس کی خیریت دریافت کرتا رہتا۔ وہ ہستی میری پیاری والدہ کی تھی۔ ساری دنیا میں والدہ ہی وہ عظیم دولت ہے جو سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ جس نے والدہ کے ادائے حقوق میں اخلاص دکھایا اور کما حقہ اس کی خدمت کی، بلاشبہ وہ جنت کا مستحق ہے۔ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق جنت والدہ کے قدموں کے نیچے ہے، یعنی والدہ کی خدمت کر کے جنت کا مستحق بنا جا سکتا ہے۔

تجارت، لین دین، لوگوں کے حقوق، بیوی بچوں کے حقوق، غرض ان سارے اشغال و اعمال میں، میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ میرے پاس واقعی کوئی وقت نہیں بچتا تھا کہ میں کسی سے ملاقات کے لیے جاؤں یا دوستوں یاروں کی خیریت دریافت

کرسکوں۔ ہاں، میں نے یہ ضرور کیا کہ اپنے معمولات میں اپنی والدہ کی ملاقات اور ان سے فون پر بات چیت کو التزاماً شامل کر لیا۔ والدہ بھی میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتی تھیں۔ میرے بارے میں، بیوی بچوں کے بارے میں اور میرے کام کے بارے میں مجھ سے ضرور پوچھتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھ پر آفس اور دیگر ذمے داریوں کا بوجھ بڑھتا گیا۔ میرے پاس وقت کی مزید کمی ہوگئی۔ میں اپنی ذمے داریوں میں اس قدر کھو گیا کہ کئی ہفتے گزر گئے۔ میں نہ اپنی والدہ سے ملاقات کے لیے جا سکا نہ ٹیلی فون پر ان سے رابطہ کر سکا۔ اب میں کبھی کبھار ہی والدہ سے ملاقات کے لیے جاتا تھا۔ اکثر اوقات ٹیلی فون پر ہی ان کی خیریت دریافت کر لیتا۔

میں نے دیکھا کہ والدہ کے حوالے سے مجھ میں کچھ کوتاہی رینگتی چلی آ رہی ہے۔ دن بدن میری مصروفیت بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے اس کا نہایت افسوس تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے اپنی والدہ کو فون کیا کہ آج شام کا کھانا ہم کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔ میں شام کے وقت آپ کو ہوٹل لے جانے کے لیے آؤں گا۔

والدہ صاحبہ فرمانے لگیں: خیریت تو ہے؟

میری باتوں سے انہیں بڑا تعجب ہوا، کیونکہ بڑے عرصے سے بوجہ مصروفیت میں محض فون ہی پر ان کی خیریت دریافت کرتا آ رہا تھا۔

میں نے عرض کیا: جی ہاں امی جان! الحمد للہ میں خیریت سے ہوں...... لیکن میری خواہش ہے کہ میں آج شام آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں، آپ کی محبت کے سائے میں کچھ وقت بسر کروں۔ آج آپ کے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔

والدہ صاحبہ نے جواباً پوچھا کہ صرف ہم دونوں ہی ہوں گے یا کوئی اور بھی ہمارے ساتھ جائے گا؟

پھر کچھ سوچ کر فرمانے لگیں: مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے کہ ہم دونوں ملیں، اکٹھے بیٹھیں اور کھانا کھائیں۔ چلو میں شام کو تمھارا انتظار کروں گی۔

چنانچہ میں شام کو والدہ صاحبہ کی خدمت میں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دروازے پر کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی مسکراہٹوں کی شمیم و شبنم بکھیرنے لگیں پھر فرمایا: میں نے گھر میں کئی لوگوں کو بتایا کہ آج شام میں اپنے بیٹے کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے جانے والی ہوں۔ سب لوگ میری بات سن کر بہت خوش ہوئے۔

ہم دونوں ماں بیٹا ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہوٹل زیادہ معروف تو نہیں تھا مگر انتہائی خوبصورت اور پُرسکون تھا۔ میری والدہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک کرسی پر بٹھایا۔ خود دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میں میز پر پڑا ہوا وہ مینو دیکھنے لگا جس پر مختلف کھانوں کی اقسام اور قیمتیں لکھی ہوتی ہیں۔ میں جب مینو پر نظر ڈال رہا تھا وہ میری طرف بڑی شفقت و مرحمت سے دیکھ رہی تھیں، فرمانے لگیں: بیٹا! جب تو چھوٹا سا تھا تو میں بھی تجھے اسی طرح ہوٹل میں لے جایا کرتی تھی اور جیسے تو مینو دیکھ رہا ہے، میں بھی اسی طرح مینو پڑھ کر کھانے کا آرڈر دیا کرتی تھی لیکن آج میری بینائی ماند پڑ گئی ہے۔ میں اس قابل نہیں کہ اتنے چھوٹے چھوٹے حروف پڑھ سکوں۔

ہم دونوں ماں بیٹا کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تو میں کاؤنٹر کی طرف گیا۔ میری والدہ بھی میرے ساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے بل ادا کیا، پھر ہم دونوں بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ کوئی نئی بات زیرِ بحث نہیں تھی، بس پرانی یادوں کے جھونکے دم بدم چلے آ رہے

تھے۔ یہی جھونکے عنوانِ گفتگو بن گئے۔ میں بارہا والدہ کی خدمت میں بیٹھا ہوں لیکن آج جس طرح ان کے حضور بیٹھا تھا وہ اپنی نوعیت کا بالکل نیا اور بڑا مبارک تجربہ تھا۔ مجھ پر اُن کی شفقت کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اور میں محویت کے عالم میں ماضی کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں عہد طفولیت میں پہنچ گیا ہوں۔ میں ایک چھوٹا سا بچہ ہوں اور میری ماں گنگنا رہی ہے، مجھے لوریاں دے رہی ہے۔ باتیں کرتے کرتے وقت دبے پاؤں یوں گزر گیا کہ ہمیں احساس تک نہ ہو سکا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔

والدہ صاحبہ فرمانے لگیں: بیٹا! رات ڈھلتی جا رہی ہے۔ اب ہمیں گھر چلنا چاہیے، چنانچہ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور باتیں کرتے کرتے والدہ کے گھر پہنچ گئے۔ امی جان کے گھر کے سامنے جب میں نے گاڑی روکی اور وہ اترنے لگیں۔ تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی متاعِ بے بہا مجھ سے جدا ہو رہی ہے۔ گاڑی سے اتر کر امی جان جب دروازے پر پہنچیں تو مجھے دیکھ کر کہنے لگیں:

"ہاں بیٹا! میں کہنا بھول گئی۔ آج کے بعد بھی ہم لوگ ہوٹل جانے کا پروگرام بنائیں گے اور ایک ساتھ کھانا کھانے چلیں گے لیکن اس دفعہ بل تم نہیں، میں ادا کروں گی۔"

والدہ کی یہ بات سن کر میری پلکوں پر آنسوؤں کا بوجھ آ پڑا۔ میں لپک کر گاڑی سے نیچے اترا اور اپنی والدہ کا ہاتھ چوم لیا۔ اس کے بعد میں اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گیا۔ صبح ہوئی تو اپنی بیوی اور بچوں کو رات کا پورا واقعہ سنایا۔ ابھی اس واقعے پر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اچانک میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

میری والدہ کا انتقال اس طرح آناً فاناً ہوا کہ مجھے ان کی خدمت کا موقع بھی نہ مل سکا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی جس کا مجھے زندگی بھر ملال رہے گا۔

ابھی میں اپنی والدہ کی وفات کا غم بھلا بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے ایک دن اسی ہوٹل کی طرف سے ایک خط ملا جس میں ہم دونوں ماں بیٹے نے رات کا کھانا کھایا تھا۔ وہ رات ہمارے لیے ایک تاریخی رات بن گئی تھی۔ مجھے اس ہوٹل کی طرف سے غیر متوقع خط پا کر تعجب ہوا۔ لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"مجھے لگتا ہے کہ میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہوں گی، بہر حال میں نے دو آدمیوں کے لیے ہوٹل کا بل ادا کر دیا ہے، ایک تم اور دوسری تمھاری بیوی!!......تم دونوں ہوٹل جانا اور میری طرف سے کھانا کھا لینا!!...... مجھے اُس رات تمھارے ساتھ ہوٹل کا کھانا کھا کر اور تم سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے بڑا لطف آیا تھا۔ میرے بیٹے! میں تم سے بے تحاشا پیار کرتی ہوں۔

والدہ صاحبہ نے یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھا تھا!۔ خط پڑھ کر والدہ محترمہ بڑی شدت سے یاد آنے لگیں۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں دیر تک اس خط کے سحر میں کھویا رہا، پھر میں نے اسے کسی مقدس صحیفے کی طرح سنبھال کر رکھ دیا۔

آج میں ہوں، میرے بیوی بچے ہیں، دوست یار اور رشتے دار ہیں۔ لیکن میں ان سب کے درمیان ایک خلا محسوس کرتا ہوں، وہ خلا جو صرف میری ماں ہی پُر کر سکتی ہیں۔ مگر اب وہ مجھ سے رخصت ہو چکی ہیں۔

ع...........ایسا کہاں سے لاؤں کہ اُن سا کہیں جسے؟

ماں کی بد دعا، اللہ کی پناہ!

رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کے مطابق جس نے اس دنیا میں ماں باپ کو خوش کر دیا، اُس سے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں خوش رہیں گے اور جس نے ماں باپ کو ناراض کیا، اُس سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض رہتے ہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

''وہ آدمی بڑا بد بخت ہے جس نے ماں باپ کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو اس دنیا میں پایا لیکن ان کی خدمت کر کے جنت کا مستحق نہیں ہو سکا۔''[1]

جس طرح ماں باپ کی دعائیں اولاد کے حق میں موثر اور مقبول ہوتی ہیں، اسی طرح ان کی بد دعائیں بھی بہت جلد لگ جاتی ہیں، اس لیے بندے کو چاہیے کہ وہ ہرگز ہرگز اپنے ماں باپ کو ناراض نہ کرے۔ اللہ نہ کرے، اگر ماں باپ کی بد دعا اولاد کو لگ جائے تو پھر اُسے دنیا ہی میں سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ استاذ عبدالرؤف حناوی رحمہ اللہ ایک معروف عالم دین ہیں۔ انھوں نے کئی ایک مفید کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے حوالے سے «بر الوالدین» نامی ان کی بہت

[1] صحیح مسلم، البر والصلة، حدیث:2551.

مشہور کتاب ہے اور اپنے موضوع پر واقعی نادر کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ اس واقعے کے وہ خود چشم دید گواہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرا ایک قریبی رشتے دار تھا۔ وہ ایک نامور تاجر تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے اپنے پیچھے ڈھیر ساری دولت چھوڑی۔ سونے چاندی کے علاوہ بہت بڑا بینک بیلنس بھی چھوڑا۔ اُس کے انتقال کے وقت کئی ایک مکانات کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے پسماندگان میں بیوی کے علاوہ ایک بیٹا چھوڑا تھا۔ یہ بیٹا انتہائی بااخلاق تھا مگر اُس نے کسی بات پر اپنی والدہ کو ناراض کر دیا۔ ماں سے برداشت نہیں ہو سکا۔ اُس کی زبان سے بیٹے کے لیے بد دعا نکل گئی! ماں کی زبان سے بد دعا نکلنی تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں لڑکے کی زندگی خوشحالی سے بدحالی میں بدلنے لگی۔ باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کافی

تھی۔ اگر وہ زندگی بھر بیٹھ کر کھاتا تب بھی ختم ہونے والی نہیں تھی۔ مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی دولت بہت جلد اُڑ نچھو ہو گئی اور وہ سڑک پر آ گیا۔ اس کا انتقال ہوا تو وہ انتہائی محتاج اور فقیر تھا۔ اُس نے اپنے پیچھے کوئی مال نہیں چھوڑا۔ یہ واضح رہے کہ وہ کسی اخلاقی برائی یا عیاشی میں مبتلا نہیں تھا، نہ اس نے اپنی دولت جوئے میں ہاری تھی۔ لیکن چونکہ اس کو ماں کی بد دعا لگ چکی تھی، چنانچہ اس کی سزا اُسے دنیا ہی میں بھگتنی پڑی۔

استاذ عبد الرؤف حناوی رحمہ اللہ نے یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماں کی بد دعا کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اس نوجوان کی ساری دولت ختم ہو گئی اور اس کے پاس باپ کے ورثے میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ وہ پیسے پیسے کا محتاج ہو گیا۔ اس کی حالتِ زار کو دیکھ کر میرے والد محترم اس پر صدقہ کیا کرتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں اس کے لیے اور اس کے بیوی بچوں کے لیے بھیجا کرتے تھے۔''[1]

---

[1] یہ واقعہ شیخ عبد الرؤف الحناوی رحمہ اللہ کی کتاب برالوالدین، ص: 135 سے ماخوذ ہے۔ ہم نے اسے تمہید اور معمولی تصرف کے ساتھ لکھا ہے۔

اور چٹان ہٹ گئی!

انسان جو بھی نیک عمل کرتا ہے، اس کا بدلہ اسے دنیا میں مل کر رہتا ہے۔ اگر اِس دنیا میں اس کے عملِ صالح کا اَجر نہ مل سکے تو آخرت میں اس کا صلہ ضرور ملے گا، البتہ کافر کی نیکی کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ لیکن ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والی اولاد کو اللہ تعالیٰ آخرت میں تو بدلہ دیں گے ہی، دنیا میں بھی اس کا اچھا بدلہ مل جاتا ہے۔ عملی زندگی میں بھی یہ مشاہدہ کیا جا چکا ہے کہ جو لڑکا اپنے والدین کے ساتھ نرمی برتتا ہے، اس کی اولاد بھی اس کے بڑھاپے میں اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنے ماں باپ کے ساتھ ناروا سلوک کرتا ہے، اس کی اولاد بھی اس کے بڑھاپے میں اس کے ساتھ ناروا سلوک کرتی ہے۔

ماں باپ کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے والا شخص بلاشبہ خوش قسمت ہوتا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنے والا شخص جب بھی خطرے سے دو چار ہوتا ہے تو ایسی نازک حالت میں والدین کے ساتھ اس کا احسان آڑے آجاتا ہے اور وہ خطرے سے نجات پا جاتا ہے۔ کیا آپ نے رسول اکرم ﷺ کی وہ حدیث نہیں پڑھی؟ جس میں آیا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے شخص کی دعا سے بھاری چٹان

بھی اپنی جگہ سے کھسک گئی تھی، حالانکہ اُسے ایک بڑی امدادی ٹیم بھی مل کر آسانی سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

اس موقعے پر میں قارئین کی خدمت میں رسول اکرم ﷺ کی وہ حدیث بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مصائب ومشکلات کے وقت ماں باپ کے ساتھ احسان کا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

تین آدمیوں پر مشتمل ایک جماعت کہیں جا رہی تھی۔ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے زمانے کا ہے۔ یہ لوگ ابھی راستے ہی میں تھے کہ یکایک آسمان پر کالی گھٹائیں چھانے لگیں اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ان تینوں کے پاس بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کی نظر ایک غار پر پڑی، چنانچہ وہ تینوں جلدی سے غار میں داخل ہو گئے۔ باہر موسلا دھار بارش کے ساتھ زوردار طوفان بھی تھا۔ اچانک پہاڑ کے اوپر سے ایک بھاری چٹان گری جس سے غار کا منہ بند ہوگیا۔ یہ تینوں اندر ہی تھے۔ غار کا منہ بند ہونے کے سبب اندر اندھیرا چھا گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کِیا جائے۔

بارش رک گئی، طوفان کا زور تھم گیا تو انھوں نے غار سے باہر نکلنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ طاقت کے بل بوتے پر چٹان کو غار کے سامنے سے لڑھکا دیں۔ مگر چٹان ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بڑی پریشانی کے عالم میں تھے۔ انھیں اپنی جان خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ یکایک ان کا ذہن اس طرف گیا کہ کیوں نہ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے نیک اعمال کا حوالہ دے کر دعائیں مانگیں۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں سن لے اور چٹان

کو غار کے منہ سے ہٹا دے۔ حدیث کے الفاظ میں انھوں نے یہ کہا:

«إِنَّهُ لَا يُنْجِيكُمْ مِنْ هٰذِهِ الصَّخْرَةِ إِلَّا أَنْ تَدْعُوا اللّٰهَ بِصَالِحِ أَعْمَالِكُمْ»

''تمھیں اِس چٹان سے نجات دلانے کا یہی ایک راستہ ہے کہ تم اپنے نیک اعمال کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرو۔''

چنانچہ ان تینوں نے اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کا حوالہ دے کر دعائیں کیں۔ سب سے پہلے اس آدمی نے آغاز کیا جو اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ نہایت مخلصانہ محبت کرتا اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنی دعا ان الفاظ میں شروع کی:

''الٰہ العالمین! میرے ماں باپ بوڑھے تھے۔ میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ جب بکریاں چرا کر گھر لوٹتا تو دودھ دوہنے کے بعد سب سے پہلے اپنے بوڑھے ماں باپ کو دودھ پلاتا۔ ان کے بعد اپنے بیوی بچوں کو دودھ پلاتا تھا۔ ایک مرتبہ میں بکریوں کو لے کر دور نکل گیا۔ گھر آنے میں تاخیر ہوگئی۔ جب میں گھر آیا تو دودھ دوہنے کے بعد اپنے والدین کی خدمت میں پہنچا۔ وہ دونوں میرے گھر آنے سے پہلے ہی سو چکے تھے۔ میں نے اپنی بیوی اور بچوں کو والدین سے پہلے دودھ پلانا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ میرے بچے شدتِ بھوک سے چلا رہے تھے۔ میں ہاتھ میں دودھ کا پیالہ لے کر اپنے والدین کے سرہانے کھڑا ہوگیا اور ان کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ روایت کے الفاظ یوں ہیں:

«فَلَبِثْتُ وَالْقَدَحُ عَلٰى يَدَيَّ أَنْتَظِرُ اسْتِيقَاظَهُمَا حَتّٰى بَرَقَ الْفَجْرُ»

”میں اپنے والدین کے نیند سے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگا، یہاں تک کہ فجر نمودار ہوگئی۔“

صبح جب میرے والدین نیند سے بیدار ہوئے تو میں نے انھیں دودھ کا پیالہ پیش کیا۔ جب انھوں نے دودھ پی لیا تو میں اپنی بیوی اور بچوں کے لیے دودھ لے کر گیا۔ وہ سو چکے تھے۔ میں نے انھیں جگا کر دودھ پلایا۔

«اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتُ فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ وَجْهِكَ، فَفَرِّجْ عَنَّا مَا نَحْنُ فِيهِ مِنْ هٰذِهِ الصَّخْرَةِ»

”الٰہ العالمین! اگر میں نے یہ کام تیری خوشنودی کی خاطر کیا ہے تو اِس چٹان کو ہم پر سے ہٹا دے۔“

نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

«فَانْفَرَجَتْ شَيْئاً لَّا يَسْتَطِيعُونَ الْخُرُوجَ»

”چنانچہ چٹان تھوڑی سے ہٹ گئی مگر وہ اتنے کم سوراخ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔“

جب پہلا آدمی اپنے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی کا حوالہ دے کر دعا کر چکا اور اس کی دعا سے غار کے منہ سے چٹان کچھ ہٹ گئی تو اس کے بعد دوسرے آدمی نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہاتھ اٹھا دیے اور ان الفاظ میں دعائیں کرنے لگا:

”پروردگار! میری ایک چچا زاد تھی۔ میں اسے دل سے چاہتا تھا۔ میں نے اسے ورغلانا چاہا لیکن وہ میرے جال میں نہیں پھنسی۔ میں سال بھر اس کے

پیچھے پڑا رہا۔ وہ میری بات ماننے سے مسلسل انکار کرتی رہی۔ ایک روز وہ خود ہی میرے پاس آئی۔ اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے اُسے ایک سو بیس اشرفیاں دیں بشرطیکہ وہ خود کو میرے حوالے کردے۔ وہ راضی ہوگئی۔ جب میں غلط ارادے سے اس کی طرف بڑھا تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے بندے! اللہ کا خوف کھا اور امانت میں خیانت نہ کر۔ میں نے جب اس کی بات سنی تو میرے اندر خوف الٰہی سما گیا اور میں اس گناہ سے باز آ گیا۔ میں نے اسے جو ایک سو بیس اشرفیاں دی تھیں وہ بھی واپس نہیں لیں۔ وہ چلی گئی، حالانکہ میں اسے بہت چاہتا تھا۔ میرے پروردگار! اگر میں نے یہ تیری رضا اور خوشنودی کے لیے کیا ہے تو ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دے۔"

اس دوسرے آدمی کی دعا بھی رنگ لائی اور چٹان کا کچھ اور حصہ غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اب انھیں تھوڑا تھوڑا آسمان نظر آ رہا تھا اور غار کے اندر باہر کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ مگر چٹان ابھی اتنی نہیں ہٹی تھی کہ وہ باہر نکل سکتے۔ اب تیسرے شخص کی باری تھی۔ اس نے اللہ کے دربار میں یہ دعا کی:

"الٰہ العالمین! میں مزدوروں سے کام لیتا تھا اور ان کے حقوق دے دیا کرتا تھا۔ مگر ایک مزدور میرے پاس سے اپنی مزدوری لیے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے اس کی مزدوری کا حصہ اپنے کاروبار میں لگا دیا۔ میرے کام میں اتنی برکت ہوئی کہ اس کے حصے میں بھی بہت اضافہ ہوگیا۔ اونٹ، گائے، بکری اور غلام کی شکل میں اس کا مال بہت بڑھ چکا تھا۔ میں نے ایک عرصے تک اس مزدور کے آنے کا انتظار کیا۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد وہ میرے پاس آیا اور مجھ

سے اپنی مزدوری طلب کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ سامنے جو اونٹ، گائے، بکریاں اور غلام ہیں، یہ سب تیری مزدوری کا حصہ ہیں۔ یہ سب کچھ لے جا۔ اُسے میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، چنانچہ اس نے کہا:

«يَا عَبْدَ اللّٰهِ! لَا تَسْتَهْزِئْ بِي»

''اللہ کے بندے! میرا مذاق نہ اڑا۔''

میں نے یقین دلایا کہ میں تیرا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ جب تو اپنی مزدوری میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا تو میں نے اس مال کو تجارت میں لگا دیا تھا اور یہ اونٹ، گائے، بکریاں اور غلام سب تیرے اسی مال کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں، اس لیے تو اپنا حصہ لے جا، چنانچہ اس نے یہ سارا مال اپنے قبضے میں کیا۔ اس میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑا، سارا مال لے کر چلا گیا۔ اے اللہ! اگر یہ کام میں نے تیری خوشنودی اور رضامندی کے لیے کیا ہو تو ہماری پریشانی دور فرما دے اور چٹان کو ہٹا دے۔''

نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اِس تیسرے شخص کی دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے چٹان کو غار کے منہ سے ہٹا دیا۔ وہ تینوں غار سے نکل آئے اور جہاں جانا تھا، چلے گئے۔ [1]

[1] صحيح البخاري، الإجارة، حديث:2272.

گورنر کی ماں

مروان بن الحکم جب مدینہ سے باہر جاتے تو سیدنا ابو ہریرہ کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کر جاتے۔ ابو ہریرہ مشہور راویٔ حدیث ہیں۔ وہ اپنی والدہ کے نہایت مطیع اور فرماں بردار تھے۔ ان کی والدہ علیحدہ مکان میں رہتی تھی۔ ابو ہریرہ کا گھر ان کے قریب ہی تھا۔ اب ذرا مدینہ طیبہ کے قائم مقام گورنر کی شان ملاحظہ کریں۔

اپنے گھر سے نکلتے تو سیدھے اپنی والدہ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے اور صدا لگاتے:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا أَمَتَاهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ

میری پیاری اماں جان! آپ پر سلامتی، اللہ کی طرف سے رحمت اور برکت نازل ہو۔

جواب میں والدہ فرماتیں:

وَعَلَيْكَ يَا بُنَيَّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ

میرے بیٹے! تم پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی، رحمت اور برکت نازل ہو۔

ابو ہریرہ کہتے: رَحِمَكِ اللّٰهُ كَمَا رَبَّيْتِنِي صَغِيرًا

اللہ آپ پر اس طرح اپنی رحمتیں نازل فرمائے، جس طرح آپ نے بچپن میں

میری پرورش کی۔

والدہ جواب میں فرماتیں: رَحِمَكَ اللّٰهُ كَمَا بَرَرْتَنِي كَبِيرًا

اللہ تم پر بھی رحمتیں نازل فرمائے، جس طرح تم نے میری بزرگی کے ایام میں میری عزت وتوقیر کی ہے۔ [1]

[1] الأدب المفرد للبخاري، حديث: 12.
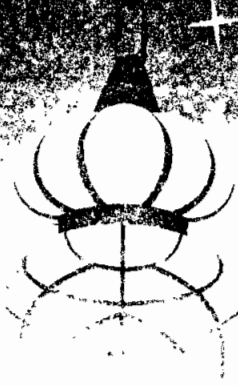
عید کی خوشی دفن ہوگئی

بعض لوگ بڑے بدقسمت ہوتے ہیں۔ والدین کے حقوق کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ بیوی کی محبت میں اس قدر مدہوش ہو جاتے ہیں کہ والدین کو بھول جاتے ہیں۔ ماں باپ کی خواہش کا بالکل احترام نہیں کرتے۔ یہ کہانی ایسے ہی بدقسمت شخص کی ہے۔ اسے بیان کرنے والے شیخ علی بن عبدالخالق القرنی ہیں۔ وہ سعودی عرب کے معروف داعی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ قصہ ان سے ایک جوہری نے بیان کیا۔ یہ

واقعہ اس کی دکان میں پیش آیا تھا وہ بیان کرتا ہے:

''رمضان کے آخری عشرے میں میری دکان میں ایک آدمی اپنی بیوی، بچے اور والدہ کے ساتھ سونے کی خریداری کے لیے آیا۔ اس کا ننھا سا بچہ بوڑھی ماں کی گود میں تھا۔ ماں بچے کو گود میں اٹھائے دکان کے ایک جانب کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واقعی کسی اچھے خاندان کی شریف زادی ہے۔ ادھر میاں بیوی نے مختلف اقسام کے جواہرات پسند کیے۔ ان کے منتخب کردہ جواہرات کی قیمت کوئی بیس ہزار ریال تھی۔

ماں کی نظر انواع واقسام کے جواہرات پر پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر دکان کے اُس حصے میں گئی جدھر سونے کی انگوٹھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ماں کو ان میں سے ایک انگوٹھی پسند آ گئی اور اس نے پسندیدہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔ اس کی قیمت کوئی سو ریال تھی۔

جوہری کا بیان ہے: بیٹا جب حساب چکانے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو اس نے جیب سے بیس ہزار ریال نکال کر مجھے دیے۔ میں نے اس سے کہا کہ سو ریال اور بھی دیں۔ وہ کہنے لگا: ابھی تو ہم نے حساب کیا تھا، کل قیمت بیس ہزار ریال تھی، پھر یہ سو ریال کیوں؟

میں نے کہا: سو ریال اُس انگوٹھی کی قیمت ہے جو تمھاری ماں نے لی ہے۔

''اوہ'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ان بوڑھی عورتوں کو بھلا سونے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اپنی والدہ کی طرف بڑھا اور کہنے لگا: کدھر ہے انگوٹھی؟ پھر اس نے اپنی والدہ کی انگلی سے انگوٹھی اتار لی۔ اسے کاؤنٹر پر رکھا، پرس اپنی جیب میں ڈالا اور چلتا بنا...... میں ہکا بکا رہ گیا۔

ماں کی حالت قابلِ دید تھی۔ مگر اُس نے کوشش کی کہ اس کی تکلیف کسی پر ظاہر نہ

ہو، اس نے اپنے پوتے کو گود میں اٹھا لیا اور دکان سے نکل گئی۔ بچے کو لے کر گاڑی میں پہنچی تو بیوی اپنے شوہر سے تلخ لہجے میں کہنے لگی:

''تم نے اپنی والدہ کو انگوٹھی خرید کر کیوں نہیں دی؟ خواہ مخواہ تم نے اپنی ماں کا دل دکھا دیا! اب اگر وہ غصے میں آ کر گھر سے چلی جائیں گی تو ہمارے بچے کو کون سنبھالے گا؟...... اس کا فیڈر کون دھوئے گا؟......'' وہ بڑبڑائی۔

جوہری کا بیان ہے: بیوی کی بات سن کر شوہر دکان کے اندر آیا ور مجھ سے وہ انگوٹھی مانگی جسے وہ ماں کے ہاتھ سے چھین کر کاؤنٹر پر پھینک گیا تھا۔ میں نے انگوٹھی اسے دے دی۔ اس نے بھی اس کی قیمت ادا کر دی۔ جب وہ انگوٹھی لے کر ماں کے پاس گیا تو بوڑھی ماں کہنے لگی:

''اللہ کی قسم! میں زندگی بھر سونا نہیں پہنوں گی۔ میں اِس انگوٹھی کے سوا کچھ اور نہیں چاہتی تھی میری خواہش تھی کہ میں اسے عید کے دن پہنوں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی عید کی خوشیاں مناؤں۔ اب میں نے عید کی خوشی اپنے دل ہی میں دفن کر دی ہے۔ بیٹا! اللہ تعالیٰ تم سے درگزر فرمائے۔''

دودھ پیتے بچے کی گواہی

بنی اسرائیل میں ایک بزرگ گزرے ہیں۔ اُن کا نام جریج تھا۔ وہ انتہائی صالح اور عبادت گزار انسان تھے۔ اُن کی نیکی اور عبادت کا دُور دُور تک چرچا تھا۔ وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ جب بھی کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اُن سے مشورے لیا کرتے تھے۔ مصائب ومشکلات کے ایام میں اُن سے دعائیں بھی کرائی جاتی تھیں۔

جب بنی اسرائیل کے بزرگوں کا تذکرہ آتا ہے تو اُن میں جریج کا نام نمایاں ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں بطور مثال گزشتہ تاریخ کی جن بزرگ شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سرفہرست جریج کا قصہ ہے۔ مگر جریج جیسی بزرگ شخصیت سے بھی جب ماں کے حضور ایک معمولی سی نافرمانی ہوگئی تو انھیں اسی دنیا میں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ انھیں ماں کی بددعا لگ گئی اور وہ آزمائش میں پڑ گئے۔ اُن کا یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ حدیث کی متعدد کتابوں میں درج ہے۔ آیئے ہم آپ کی خدمت میں جریج کا یہ واقعہ پیش کرتے ہیں، اِس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ماں باپ کا درجہ کتنا بڑا ہے۔

جریج کے اس واقعے کے راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس واقعے کی تفصیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

صرف تین شیر خوار بچے ایسے ہیں جنھوں نے ماں کی گود میں بات چیت کی ہے۔ ان تینوں میں سے ایک تو سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہیں۔ جب اُن کی والدہ مریم نے انھیں جنم دیا تو لوگوں نے اُن پر بہتان تراشی کی کہ یہ ناجائز بچہ ہے۔ کیونکہ مریم کی شادی ہی نہیں ہوئی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے بچے، یعنی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لوگوں کے سامنے یہ گواہی دلوائی کہ یہ کرشمۂ قدرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے بچہ پیدا کیا ہے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا تھا۔ گود میں بات کرنے والا دوسرا بچہ وہ ہے جس نے بنی اسرائیل کے بزرگ، یعنی جریج کو بَری قرار دینے کے لیے شیر خواری کے عالم میں زبان کھولی اور اُن کی پاک دامنی کی لوگوں کے سامنے شہادت دی۔

جریج کا قصہ یہ ہے کہ وہ ایک عبادت گزار انسان تھے۔ دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے رہتے تھے۔ انھوں نے عبادت کی خاطر ایک گرجا گھر تعمیر کرا رکھا تھا۔ وہ گرجے ہی میں رہتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ وہ اپنی عبادت اور ریاضت میں اِس قدر مشغول ہوتے کہ انھیں دنیاوی معاملات کا کوئی دھیان ہی نہ رہتا۔ انھوں نے کبھی دنیا کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ بس وہ اللہ کو خوش رکھنے کے لیے دن رات اُس کی عبادت میں لگے رہتے تھے۔ ایک روز جریج کی والدہ اُن کے پاس آئیں، یہ اُن کی عبادت کا وقت تھا، وہ حسب معمول عبادت میں مشغول تھے۔ ماں گرجے کے دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے بیٹے جریج کو آوازیں دینے لگی۔

جریج نے جب ماں کی آواز سنی تو عبادت کے دوران ہی اُن کے دل میں یہ بات آئی کہ اے اللہ! میں ابھی تیری عبادت میں لگا ہوا ہوں، تیری بندگی کر رہا ہوں، تجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، ادھر میری ماں مجھے بلانے چلی آئی ہے، اَب میں کیا کروں؟ اِس نازک موقعے پر مجھے کیا کرنا چاہیے؟، آیا مجھے عبادت ہی میں لگے رہنا چاہیے یا عبادت ترک کر کے ماں کی بات سُننی چاہیے؟ بہر حال وہ عبادت میں مشغول رہے اور ماں کی آواز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کی ماں نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا۔ بیٹے کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو واپس چلی گئی۔

دوسرے روز بھی جریج کی والدہ گرجے میں آئی۔ اُس وقت بھی جریج اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول تھے۔ ماں نے اُن کا نام لے کر پکارا۔ ماں کی آواز جب جریج کے کانوں میں پڑی تو انھوں نے اپنے دل میں کہا: اے پروردگار عالم! میں تیری عبادت میں مشغول ہوں اور ادھر میری ماں مجھے بلا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، عبادت چھوڑ کر ماں کو جواب دوں یا عبادت مکمل کروں؟ بہرحال وہ عبادت ہی میں مشغول رہے۔ ماں کی آواز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کی ماں کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی۔ پھر بیٹے کا کوئی جواب نہ پا کر واپس چلی گئی۔ مگر اِس دفعہ ناراض ہو کر اُس نے بیٹے کو بددعا دے دی:

«اَللّٰهُمَّ لَا تُمِتْهُ حَتّٰى يَنْظُرَ إِلٰى وُجُوهِ الْمُومِسَاتِ»

''اے اللہ! اسے اس وقت تک موت نہ دے، جب تک یہ کسی بدکردار عورت کا منہ نہ دیکھ لے۔''

بلاشبہ بنی اسرائیل کے ہاں جریج ایک انتہائی برگزیدہ اور پرہیزگار شخص تھے۔ لیکن

ماں کی بد دعا کے بعد ماحول اُن کے خلاف ہونے لگا۔ لوگ آپس میں ان کے بارے میں باتیں کرتے اور ان کی عبادت کا تذکرہ بھی کرتے۔ چند لوگوں میں اُن کے خلاف حسد بھی پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہ جریج کو خوار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک دفعہ ان لوگوں کے پاس ایک عورت آئی۔ اُس نے اُن کے عزائم سنے تو اُن سے کہنے لگی: میرے لیے جریج کو بہکانا اور اُسے اپنے حُسن کے پھندے میں پھنسانا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر تم لوگ مجھے اجازت دو گے تو میں جریج کی شخصیت کو مجروح کر سکتی ہوں اور اسے اپنی طرف مائل کر سکتی ہوں۔ اِس طرح تمھیں جریج کو رسوا کرنے کا موقع مل جائے گا اور وہ لوگوں میں بدنام ہو جائے گا۔

یہ عورت نہایت خوبصورت مگر بدچلن تھی۔ سب لوگوں کو اس کی حقیقت معلوم تھی۔ اس عورت کو اپنے حُسن پر اِتنا ناز تھا کہ وہ جس کو چاہتی اپنے فتنے میں مبتلا کر دیتی۔ اسی لیے جریج کے حاسدین کے سامنے اُس نے وعدہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح جریج کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا لے گی، چنانچہ وہ بدکردار عورت جریج کے گرجا کے پاس پہنچی اور اسے اپنے ناز و انداز سے پھانسنا چاہا۔ مگر جریج واقعی ایک نیک اور صالح انسان تھے۔ اُن کے اندر ہمیشہ خوفِ خدا رہتا۔ اسی لیے وہ رات دن عبادت میں مشغول رہتے، بھلا وہ اُس بدچلن عورت کے جال میں کیسے پھنس سکتے تھے۔ اُس بدکردار عورت نے طرح طرح سے جریج کو ورغلانا چاہا اور اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی مگر ہزار جتن کے باوجود وہ اپنے مقصد میں ناکام رہی۔

جب اس بدچلن عورت نے دیکھا کہ جریج کسی طرح اُس کے قابو میں آنے والے نہیں تو اُسے بڑا طیش آیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے جریج نے اس کی شدید توہین کی

ہے۔ کیونکہ جریج کے پاکیزہ کیریکٹر سے اُس کی اَنا کو بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ ایسے اللہ والے سے پالا پڑا تھا جو رات کی تنہائی میں بھی جبکہ انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہوتا، وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ انھیں یقین ہوتا ہے کہ بندے کی آنکھ سے تو اوجھل رہا جا سکتا ہے مگر اس ذات باری تعالیٰ سے کوئی راز پوشیدہ نہیں رہ سکتا، جو سینوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ اب وہ بدچلن عورت ایک دوسری چال چلنے لگی۔ وہ ایک چرواہے کے پاس پہنچی۔ چرواہا جریج کے گرجا کے آس پاس ہی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ عورت نے چرواہے کو پھانس لیا اور اُس سے اپنا منہ کالا کر آئی۔ اُسے چرواہے کا حمل ٹھہر گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو وہ لوگوں سے کہنے لگی کہ یہ بچہ جریج کا ہے۔

لوگوں نے اس عورت کی بات سُنی تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔فوراً جریج کے گرجے میں پہنچ کر توڑ پھوڑ کرنے لگے۔ جب لوگوں نے جریج کو مارنا پیٹنا شروع کیا تو وہ کہنے لگے: بھائیو! مجھے یہ تو بتاؤ کہ آخر تم لوگ مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ لوگوں نے کہا: تم نے اِس بدکردار عورت سے منہ کالا کیا ہے۔ اُس نے تمھارا بچہ جنم دیا ہے۔ جریج نے کہا: میں نے زنا کا ارتکاب نہیں کیا۔ یہ مجھ پر ایک بہتان ہے، سراسر جھوٹ ہے، مجھے جان بوجھ کر پھنسایا جا رہا ہے۔

مگر ان کی طرف سے لاکھ صفائی اور دُہائی دینے کے باوجود لوگ اُن کو بَری تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے جریج کا گرجا منہدم کر دیا اور انھیں مارتے پیٹتے رہے۔

جب جریج نے دیکھا کہ لوگ اُن کی پاکیزگی تسلیم کرنے کے لیے کسی بھی قیمت پر تیار نہیں تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ تم بچے کو میرے پاس لاؤ، وہی میری براءت

کا اقرار کرے گا۔

وہ بچہ اُن کے پاس لایا گیا تو انھوں نے کہا:

«دَعُونِي حَتّٰى أُصَلِّيَ»

''مجھے نماز پڑھ لینے دو۔''

چنانچہ انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر بچے کے پاس آئے اور پوچھا:

«يَا غُلَامُ! مَنْ أَبُوكَ؟»

''بچے! تیرا باپ کون ہے؟''

بچہ بولا: فلاں چرواہا میرا باپ ہے۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ شیر خوار بچے نے جریج کی براءت اور پاکیزگی کی شہادت دے دی ہے تو اُن کی نظر میں جریج کی اہمیت اور عزت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ وہ اب جریج کے سامنے معذرت پیش کرنے لگے۔ اور اُن کے ہاتھوں پر بوسہ دینے لگے۔ انھوں نے جریج سے کہا:

«نَبْنِي لَكَ صَوْمَعَتَكَ مِنْ ذَهَبٍ»

''ہم آپ کا گرجا سونے کا بنا دیتے ہیں۔''

جریج نے کہا:

«لَا، أَعِيدُوهَا مِنْ طِينٍ كَمَا كَانَتْ»

''نہیں، میرے گرجے کو سونے کا بنانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جیسا پہلے مٹی کا تھا ویسا ہی بنا دو۔''

چنانچہ لوگوں نے جریج کے لیے پہلے کی طرح گرجا تعمیر کر دیا۔ [1]

قارئین کرام! میں نے یہ واقعہ اس لیے بیان کیا ہے تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ماں کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے اور اُس کی معمولی بددعا پر بھی کتنی عظیم آزمائش آسکتی ہے۔ اِس واقعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ماں کی فرماں برداری نفلی عبادت پر مقدم ہے۔ اسی طرح مختلف روایات کے تناظر میں علمائے کرام اور فقہائے اسلام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ماں کے حکم کی تعمیل جہاد جیسے عظیم کام سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جہاد پر ماں کا حکم مقدم ہے۔ اسی طرح ہجرت پر بھی ماں باپ کا حکم مقدم ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنے ماں باپ کی کتنی زیادہ خدمت کرنی چاہیے؟ اِس کا آپ خود اندازہ لگالیں۔

---

[1] یہ واقعہ حدیث متعدد کتابوں میں وارد ہے۔ اس کے لیے ملاحظہ فرمائیں: صحیح البخاري أحاديث الأنبياء، حديث:3436، صحيح مسلم، البر والصلة، حديث:2550 واللفظ له.

ماں کی فرماں برداری سے جان بچ گئی

معروف کتاب ''سعادۃ الدارین في بر الوالدین'' کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا جا رہا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک نوجوان کی جان ماں کی فرماں برداری کے سبب بچ گئی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو ماں باپ کی خدمت کرنے سے جس طرح بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح ماں باپ کی فرماں برداری کے سبب بے شمار مصائب اور مشکلات بھی ٹل جاتی ہیں۔ اس کتاب کے مؤلف لکھتے ہیں:

ایک نوجوان اپنے ایک دوست کا قصہ یوں بیان کرتا ہے کہ اُس کا دوست روزانہ

اپنی والدہ کو مسجد میں نماز کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ اُس کی ماں پنج وقتہ نماز مسجد میں ادا کرنے کی عادی تھی۔ ایک روز اُس نوجوان نے اپنے ایک ساتھی سے کسی جگہ جانے کا وعدہ کرلیا۔ دونوں دوستوں کے مابین یہ طے پا گیا کہ فلاں تاریخ کو ہمیں فلاں جگہ جانا ہے، چنانچہ وہ تاریخ آ گئی۔ میرے دوست کا ساتھی اُس کے گھر آیا اور وعدے کے مطابق اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

میرا دوست اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا:

''امی جان! آپ کہیں جانا چاہتی ہیں؟''

ماں نے جواب دیا: نہیں، آج میرا کہیں جانے کا ارادہ نہیں، تمھیں جہاں جانا ہے جا سکتے ہو، اللہ تعالیٰ تمھاری حفاظت فرمائے۔

دروازے کے باہر میرے دوست کا ساتھی انتظار کر رہا تھا۔ میرا دوست ماں سے اجازت لے کر گھر سے باہر آیا اور اپنے ساتھی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ تو اچانک اُسے گھر میں کوئی چیز یاد آ گئی جسے وہ بھول گیا تھا۔ چنانچہ وہ گھر میں گیا تا کہ اپنی بھولی ہوئی چیز لے آئے۔ اُس وقت ماں نے بیٹے سے کہا:

''میں چاہتی ہوں کہ مجھے مسجد تک پہنچا دو''

بیٹے نے کہا:

''چند لمحے پہلے آپ نے کہا تھا کہ مجھے کہیں نہیں جانا۔''

ماں نے کہا: ہاں میں نے کہا تھا مگر اب میں جانا چاہتی ہوں۔

بیٹے نے کہا: امی جان! آپ کا حکم میرے سر آنکھوں پر! آپ کی خدمت میرے لیے باعثِ صد افتخار ہے۔ بیٹا گھر سے نکل کر باہر اپنے ساتھی کے پاس آیا اور کہنے لگا:

دوست! معاف کرنا، میں ابھی گھر سے نہیں نکل سکتا کیونکہ میری ماں مسجد جانا چاہتی ہے، اس لیے تم جاؤ، پھر کبھی دیکھیں گے۔ نوجوان یہ کہہ کر گھر کے اندر داخل ہو گیا اور اس کا ساتھی گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل دیا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا۔ سب کے سب ایک بڑے حادثے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اُس وقت ماں کے وفادار اور فرماں بردار نوجوان کو معلوم ہوا کہ اُس کے ساتھی کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے اور وہ موقع ہی پر جاں بحق ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قارئین کرام! ذرا آپ اس واقعے کو دیکھیں کہ ماں باپ کی خدمت میں کتنا فائدہ ہے۔ ماں باپ کا مطیع بیٹا کیسی کیسی مصیبتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ کاش! ہمارے سارے مسلمان بھائی اپنے والدین کے حقوق کا لحاظ کریں اور اپنی مصروفیات پر اپنے والدین کی ضروریات کو ترجیح دیں۔ [1]

---

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں کتاب: سعادة الدارين في بر الوالدين، ص: 77,76.

دادی اماں کے ساتھ حسنِ سلوک کا صِلہ

شریعت اسلامیہ میں جہاں والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کا شوق دلایا گیا ہے وہیں دادا، دادی کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی ترغیب دی گئی ہے۔ صلہ رحمی کا سلسلہ اتنا وسیع ہے کہ اس سے اسلامی سوسائٹی کی فضا انتہائی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو صلہ رحمی کی بے حد تاکید کی ہے۔

دادا، دادی اور نانا، نانی بھی دراصل والدین کے قائم مقام ہیں۔ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ جس طرح اپنے ماں باپ کی خدمت میں دلچسپی لیتا ہے، اسی طرح اپنے والدین کے ماں باپ کے ساتھ بھی انتہائی محبت سے پیش آئے۔ آخر دادا دادی اور نانا نانی بھی تو ہمارے والدین کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی اہمیت ہمارے لیے اپنے والدین کی ہے۔ یہ واقعہ جو ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں، اس کا تعلق بھی صلہ رحمی سے ہے۔ اس واقعے میں ایک لڑکے نے اپنی دادی کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کی تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے اس کا مستقبل روشن کر دیا۔ آیئے یہ واقعہ پڑھتے ہیں:

دادی اماں ہمارے گھر منتقل ہو چکی تھیں۔ میں نے جب انھیں دیکھا تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ دادی جان کی آمد سے مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جنت

میرے گھر میں قدم رکھ چکی ہے، میں نے عزم کر لیا کہ دادی جان کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ میں دادی جان کی خدمت کر کے جنت کا مستحق بننے کی تمنا کر رہا تھا۔ دادی جان کے گھر میں تشریف لاتے ہی میں نے اور امی جان نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب رات دن دادی جان کی خدمت کریں گے۔

دادی جان حالات حاضرہ سے بڑی دلچسپی رکھتی تھیں، اس لیے امی جان مختلف جرائد اور اخبارات پڑھ کر دادی جان کو سنایا کرتی تھیں۔ میں دادی جان کو کھانا کھلاتا اور وقت پر انھیں دوائیں پلایا کرتا تھا۔

دادی جان کو ہمارے گھر آئے ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ وہ دل کے خطرناک عارضے میں مبتلا تھیں۔ جب ان کا مرض بڑھا تو انھیں ہسپتال داخل کرا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ جب دادی اماں کو ہسپتال میں داخل کیا گیا اور انھیں آکسیجن دی جانے لگی تو وہ اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف بلند کر کے تسبیح و تہلیل کرنے لگیں۔ میں نے کسی بھی مریض کو ایسی حالت میں اللہ کی تسبیح، تکبیر اور تہلیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ دادی جان ایسی خطرناک صورتحال میں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہی تھیں۔ ہسپتال میں دادی اماں کو داخل ہوئے کئی ہفتے ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے خاص توجہ دی۔ ان کا بھرپور علاج ہوا۔ اللہ کے فضل وکرم سے دادی اماں ٹھیک ہو گئیں اور وہ ہسپتال سے گھر چلی آئیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دادی اماں تقریباً پچھلے تیس برسوں سے ایامِ بیض، یعنی ہر ماہ کی تیرہ چودہ پندرہ تاریخ کو روزے رکھا کرتی تھیں۔ رمضان المبارک کے علاوہ ان کا معمول تھا کہ وہ شعبان المعظم اور شوال المکرّم میں بھی روزہ رکھا کرتی تھیں۔ ان

کے علاوہ یوم عاشوراء کو بھی پابندی سے روزہ رکھتیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹروں نے دورانِ علاج انھیں بہت تاکید کی تھی کہ وہ اس قدر کثرت سے روزہ نہ رکھا کریں کیونکہ کثرت سے روزے رکھنے میں ان کی صحت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ وقت پر دوا نہ لینے پر مرض کے بڑھنے کا خدشہ ہے، پھر جب مرض مزید بڑھنے لگے گا تو دل کا متاثر ہونا لازم ہے۔ میں دادی اماں کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ سلام کر کے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ ایک دن میں ان کے پاس عشاء کی نماز کے بعد پہنچا اور انھیں کچھ رقم دی۔ میں نے دادی جان کو بتلایا کہ چونکہ میں کالج کی ڈگری حاصل کر چکا ہوں۔ اس لیے اب کالج میں میرا تعلیمی مرحلہ مکمل ہو چکا ہے، اسی خوشی میں کچھ رقم آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ دادی اماں نے رقم دیکھ کر مجھے شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ میں نے اس موقعے پر دادی اماں سے کہا کہ چونکہ ڈاکٹروں نے آپ کو روزہ رکھنے سے منع کیا ہے اور وقت پر دوائیں لینے کی تاکید کی ہے، اس لیے آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق روزہ نہ رکھیں۔

دادی اماں نے میری باتیں غور سے سُنیں اور وعدہ کیا کہ جیسا تم کہہ رہے ہو ویسا ہی کروں گی۔ اتنا کہہ کر میں اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔ نمازِ فجر کے فوراً بعد میرے دروازے پر زور زور سے دستک کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نوکرانی پریشان کھڑی ہے۔ اس نے بتایا کہ دادی اماں زمین پر گری پڑی ہیں۔ میں یہ سنتے ہی دادی جان کے کمرے میں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ دادی اماں زمین پر گری ہوئی ہیں۔ داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے قبلہ کی

طرف منہ کیے ہوئے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نماز میں ہیں۔ انھوں نے اُس وقت تک دوا نہیں لی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اُن کے جسم پر رکھا تو اُن کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ اِس دارِ فانی سے دارِ آخرت کی طرف کوچ کر چکی تھیں۔ إنا للّٰہ وإنا إليه راجعون.

دادی اماں کے انتقال کو تین ماہ گزر چکے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے گھر کے قریب والے اسکول میں پڑھاؤں۔ اس کے لیے مجھے وزارتِ تعلیم میں اپنا سرٹیفکیٹ پیش کرنا ضروری تھا، تاکہ اگر کوئی اسامی خالی ہو تو مجھے مل جائے چنانچہ میں وزارتِ تعلیم کے دفتر میں درخواست لے کر پہنچ گیا۔ جنرل منیجر نے سیکریٹری سے وہ فائل منگوائی جس میں اسکولوں کی فہرست تھی۔ اس فہرست سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ کس اسکول میں اسامی خالی ہے۔ سیکریٹری نے فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد جنرل منیجر کو بتایا کہ درخواست دینے والے صاحب کی خواہش ہے کہ وہ فلاں اسکول میں بحیثیت ٹیچر تعینات ہوں، جبکہ اُن کے مطلوبہ اسکول کے علاوہ تقریباً سارے ہی اسکولوں میں دو دو ٹیچروں کی ضرورت ہے۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں وزارتِ تعلیم کی کوئی بھی نوکری سفارش کی بنیاد پر نہیں بلکہ میرٹ اور امتحان کی بنیاد پر ملتی تھی۔ اس وزارت سے نوکری حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ جنرل منیجر نے مجھ سے کہا: نا امید ہونے کی ضرورت نہیں، ہفتے کے روز آنا، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی گنجائش نکال دے۔ میں نے ان شاء اللہ کہا اور وہاں سے نکل کر گھر واپس آ گیا۔ رات کو سویا ہوا تھا۔ خواب میں دادی جان آئیں۔ انھوں نے میری خیریت دریافت کی اور میری بڑی سرزنش کی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ کیا بات ہے کئی دنوں سے تم سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میں نے

خواب ہی میں ان کو جواب دیا کہ دنیا کے کاموں میں مصروفیات کی وجہ سے ملاقات میں تاخیر ہوئی ہے، پھر وہ مجھے دعائیں دینے لگیں: اللہ تعالیٰ تمھاری مراد پوری کرے، اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانیاں پیدا کرے۔

میں خواب سے بیدار ہوا تو یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے نوکری مل چکی ہے۔ میں نے تیاری کی اور وزارتِ تعلیم کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ جنرل منیجر نے مجھے دیکھ کر سیکریٹری سے فائل منگوائی اور اسکولوں کی فہرست پر نظر ڈالنے لگا۔ جب اس نے فائل کھولی تو اسے یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ جن اسکولوں کو دو دو ٹیچرز کی ضرورت تھی وہ آسامیاں پر ہوچکی تھیں، البتہ جس اسکول میں ٹیچر کی کوئی اسامی خالی نہیں تھی، یعنی وہ اسکول جو میرے گھر کے قریب تھا اور میں اسی میں نوکری کا متمنی بھی تھا، اُس میں ایک ٹیچر کی ضرورت تھی۔

جنرل منیجر نے یہ دیکھ کر سیکریٹری سے سختی سے پوچھا کہ کیا تم کوئی اور فائل تو نہیں لے آئے؟ اس نے کہا: متعلقہ فائل یہی ہے۔ الحمد للہ میرا انتخاب حسب خواہش گھر کے قریب والے اسکول میں ہوگیا، پھر میں وہاں پڑھانے لگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کے فضل وکرم کے بعد مجھے اپنی دادی کے ساتھ حسن سلوک کے نتیجے میں یہ ملازمت ملی ہے۔[1]

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں کتاب: قصص مؤثرة في بر الوالدين: 14-16.

قرآن کریم اور گاڑی

بچپن ہی میں اُس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کی پرورش و پرداخت کی ذمے داری اُس کے والد پر آن پڑی تھی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکیلا گھر میں رہا کرتا تھا۔ اس کا والد شہر کا ایک نامی گرامی بزنس مین تھا۔ کاروبار میں اس نے بے تحاشا کامیابی حاصل کی۔ کاروباری مصروفیات کے باوجود وہ اپنے بیٹے کی ضروریات کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسے اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی۔ بیوی کے انتقال کے بعد اُس کے خوابوں کی تعبیر یہی اکلوتا بیٹا تھا۔ بے شک باپ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ مگر روپے پیسے کے معاملے میں وہ بڑا محتاط تھا۔ حتیٰ کہ اپنے اکلوتے بیٹے پر بھی اُس کی مٹھی ایک حد تک ہی کھل پاتی تھی۔ ضرورت کے بغیر وہ بیٹے کو ایک پیسہ بھی نہیں دیتا تھا۔

اب اس کا یہ اکلوتا بیٹا جوان ہو چکا تھا اور گاڑی بھی چلانے لگا تھا۔ اُس نے باپ سے فرمائش کی کہ مجھے فلاں گاڑی چاہیے۔ یہ گاڑی بہت قیمتی تھی۔ اس پر مالدار باپ کے بیٹے ہی سواری کر سکتے تھے۔ باپ نے بیٹے کی فرمائش سن کر کہا: بیٹا! یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، تم محنت سے پڑھو اور امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرو۔ اگر تم نے امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کیے تو میں تمھیں ایک ایسا قیمتی تحفہ دوں گا کہ وہ تمھاری پسندیدہ

گاڑی سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہوگا۔

آج بیٹا امتیازی نمبروں سے امتحان میں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ وہ بڑا خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ اپنے باپ کو اپنی ترقی کی خوش خبری سنائے گا تو اس کا باپ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، چنانچہ وہ خوشی خوشی گھر پہنچا اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ والد کو اپنی اعلیٰ کامیابی کا مژدہ سنایا۔ باپ نے بیٹے کا سرٹیفکیٹ دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا وہ اپنے آفس میں داخل ہوا تجوری میں سے ایک ڈبہ نکالا۔ اس نے بیٹے کو یہ ڈبہ دیا اور کہا کہ بیٹا! یہ ہے تمھارا تحفہ۔

بیٹے نے تحفہ لے لیا۔ اُس کے چہرے پر خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ جب اُس نے ڈبہ کھولا تو اُس کے اندر قرآن کریم کا نسخہ دیکھ کر اُسے غصہ آ گیا اس نے ڈبہ اُٹھا کر باپ کے سامنے میز پر پھینک دیا اور کہنے لگا: ابو جان! کیا آپ نے مجھے گاڑی دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ میں نے کتنی محنت سے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کیے۔ لیکن آج وعدہ پورا کرنے کی بجائے آپ مجھے یہ قرآن دے کر بہلا رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ گھر سے نکل گیا، اُس نے باپ کا جواب سننے کی زحمت بھی نہیں کی۔

باپ چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کیا جواب دے۔ اب جبکہ بیٹا گھر سے نکل چکا تھا تو اُسے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ بیٹے کو آواز دے کر بلا لے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔ اُدھر اس کا یہ نوجوان بیٹا گھر سے نکل کر کسی دوسرے شہر چلا گیا اور وہیں رہنے لگا۔ نہ کبھی گھر کی فکر ہوئی، نہ کبھی باپ سے ملنے کی تمنا۔ وہ اسی غلط فہمی میں رہا کہ میرے باپ نے وعدہ خلافی کی ہے اور وہ مجھے بالکل نہیں چاہتا۔

قصہ مختصر، بیٹا بیس سال تک گھر سے باہر ہی رہا۔ اس نے اپنے والد کے پاس جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اُس کے خیال میں اُس کے والد نے فرمائش پوری کرنے کا وعدہ پورا نہ کر کے اُس کے ساتھ ایک ایسا جرم کیا تھا جس کی تلافی محال تھی۔ وہ غصے کے عالم میں بیس سال تک گھر سے اور باپ سے دُور رہا۔ بیس سال بعد جب اسے گھر جانے کی خواہش ہوئی تو اپنے شہر روانہ ہوا۔ شہر پہنچا تو سارا منظر بدل چکا تھا۔ اپنے گھر پہنچا تو والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب اُس گھر اور اپنے باپ کی ساری جائیداد کا وہ اکیلا مالک تھا۔

گھر کے اندر مختلف اوراق بکھرے پڑے تھے۔ گھر کی صفائی کے دوران اُس کی نگاہ اچانک اُس ڈبے پر پڑی جس میں قرآن کریم رکھا ہوا تھا۔ اس نے ڈبے کو اٹھایا اور حسرت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا، پھر اُس نے ڈبہ کھولا۔ ڈبے میں قرآن کریم کے علاوہ ایک چابی بھی تھی۔ یہ اُس گاڑی کی چابی تھی جس کی اُس نے اپنے باپ سے فرمائش کی تھی۔ اب کیا تھا، اس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ زار وقطار رونے لگا۔ اُسے ایسا صدمہ لاحق ہو گیا کہ اس کی زبان ہی گنگ ہو گئی، پھر وہ ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکال سکا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیا چگ گئیں کھیت!!

قارئین کرام! دیکھا آپ نے باپ کی بیٹے سے محبت اور بیٹے کی باپ کے بارے میں غلط فہمی؟ دراصل آج بھی بہت سارے بیٹے اپنے باپ کے دل کی باتیں نہیں سمجھ پاتے۔ اُلٹا باپ پر لعن طعن کرنے لگتے ہیں، حالانکہ باپ کی محبت کا کیا پوچھنا۔ وہ ہرصورت اپنے بیٹے کی بھلائی ہی چاہتا ہے۔ میرے بھائیو! اس بات کو ذہن میں ہمیشہ تازہ رکھو کہ تمھاری ترقی سے اگر اس روئے زمین پر کسی کو حقیقی خوشی ہوتی ہے تو وہ صرف تمھارے والدین اور اساتذۂ کرام ہیں۔

سب سے بڑا گناہ

محدثین کرام اور سلف صالحین میں ایک نام بڑا معروف ہے۔ زہد وتقویٰ اور اخلاقِ حسنہ کے بارے میں لکھی جانیوالی کوئی کتاب ان کی بیان کردہ روایات سے خالی نہیں دنیا انھیں ''ابن ابی الدنیا'' کے نام سے جانتی ہے۔ ذیل میں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے اس کے راوی بھی ابن ابی الدنیا ہیں۔ یہ واقعہ اگرچہ بنی اسرائیل کا ہے لیکن اس قسم کے واقعات کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی اس واقعے کے راوی سیدنا کعب احبار رضی اللہ عنہ ہیں جو اسلام لانے سے پہلے بھی انتہائی معتبر سمجھے جاتے تھے اور معاشرے میں ان کے بارے میں بڑے اچھے تاثرات پائے جاتے تھے۔ یہودیوں کا ہر فرد اُن کا احترام کرتا تھا۔ علمی حلقوں میں ان کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا تھا۔ کعب احبار رضی اللہ عنہ کا بیان کردہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں، وہ بیان کرتے ہیں:

بنی اسرائیل میں تین افراد تھے۔ اُن کا چرچا دُور دُور تک تھا۔ وہ تینوں کے تینوں

انتہائی عبادت گزار اور متقی تھے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ تینوں کہیں اکٹھے گفتگو کررہے تھے۔ دوران گفتگو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں اپنی نیکیوں کے ساتھ ساتھ گناہوں کو بھی یاد کرتے رہنا چاہیے۔وہ کہنے لگے۔

«تَعَالَوْا حَتّٰى يَذْكُرَ كُلُّ إِنْسَانٍ مِنَّا أَعْظَمَ ذَنْبٍ عَمِلَهُ»

"آؤ ہم میں سے ہر ایک اپنے کیے ہوئے سب سے بڑے گناہ کا تذکرہ کرے"

ان میں سے ایک آدمی کہنے لگا: جہاں تک میرا تعلق ہے۔میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا گناہ یہ کیا ہے کہ میرا ایک ساتھی تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک درخت آ گیا۔ میں اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ میرا ساتھی کہنے لگا کہ آج میں تمھاری وجہ سے ڈر گیا ہوں، مارے خوف کے میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔تمھاری اس حرکت کا فیصلہ اللہ کے ہاں ہوگا۔ شاید میری اس حرکت سے اسے تکلیف پہنچی۔ میرے خیال میں زندگی بھر میں نے اس سے بڑا گناہ کبھی نہیں کیا۔

دوسرے آدمی نے کہا: ہم بنی اسرائیلیوں کو پیشاب کی چھینٹوں سے بچنے کی سختی سے تاکید کی گئی ہے۔ ایک دن مجھے بار بار پیشاب آرہا تھا۔ اس روز میں پوری طرح احتیاط نہیں کرسکا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اُس روز پیشاب کی چھینٹیں میرے کپڑوں پر پڑی ہوں گی۔ مجھے تو اپنا سب سے بڑا گناہ یہی محسوس ہوتا ہے۔

تیسرے آدمی نے کہنا شروع کیا: ایک دفعہ میری ماں نے مجھے آواز دی۔ اس وقت زوردار آندھی چل رہی تھی۔ میں نے اپنی ماں کی بات کا جواب دیا مگر آندھی کی شدت

کے سبب میری آواز اُس کے کانوں تک نہیں جا سکی، چنانچہ وہ غصے میں لال پیلی ہو کر میرے پاس آئی، زور زور سے چلانے لگی اور غصے میں مجھے ایک پتھر دے مارا۔ میں نے اُس کا غصہ دیکھا تو ایک لاٹھی لا کر اُسے دے دی اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا کہ جتنا چاہو مجھے مار کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لو۔ مگر میری ماں مجھے اِسی حالت میں چھوڑ کر چلی گئی۔ جلدی میں ایک درخت سے ٹکرا گئی اور اس کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا گناہ ہے۔[1]

قارئین کرام! ذرا اندازہ کریں کہ بنی اسرائیل کے تیسرے بزرگ نے کتنی معمولی سی بات کو اپنے حق میں سب سے بڑا گناہ تصور کیا؟ کیا ہم بھی اپنی ماؤں کی اسی طرح عزت کرتے ہیں؟ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیں۔

---

[1] حلیۃ الأولیاء:9,8/6، وموسوعۃ الإمام ابن أبي الدنیا:221/1، حدیث: 147.

یہ تھا ماں کا احترام

کون ایسا عالم ہوگا جو محمد بن سیرین کی عظیم شخصیت سے واقف نہ ہوگا۔ ہر خاص وعام اُن کے علم اور تعبیر رؤیا میں ان کا مرہونِ منت ہے۔ یہ مشہور ومعروف تابعی ہیں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ علم وفضل اور زہد وورع میں ان کا مقام اتنا اُونچا تھا کہ کبھی وہ بازار چلے جاتے تو لوگ اُن کے احترام میں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرنے لگتے تھے۔ ابوعوانہ ان کی فضیلت بیان کرتے ہیں:

"میں نے محمد بن سیرین کو بازار سے گزرتے دیکھا۔ لوگ انھیں دیکھ کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔"

محمد بن سیرین کے زہد وتقویٰ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بقول اشعث:

«إِذَا سُئِلَ عَنْ شَيْءٍ مِنَ الْفِقْهِ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ وَتَبَدَّلَ حَتّٰى كَأَنَّهُ لَيْسَ بِالَّذِي كَانَ»

’’جب محمد بن سیرین سے حلال وحرام کے حوالے سے کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ ایسے مرعوب ہوتے کہ ان کی حالت ہی بدل جاتی۔‘‘

مؤرخین نے لکھا ہے کہ محمد بن سیرین تابعین کے امام ہیں۔ مگر اتنے اُونچے مرتبے کے باوجود ماں کے سامنے ان کی کیفیت ایسی ہوتی تھی جیسے وہ ایک ادنیٰ سے آدمی ہیں۔ یہ اُن کی کمال درجے کی تواضع تھی۔ ان کی بہن حفصہ بنت سیرین کا بیان ہے:

«كَانَ مُحَمَّدٌ إِذَا دَخَلَ عَلٰى أُمِّهِ لَمْ يُكَلِّمْهَا بِلِسَانِهِ كُلِّهِ تَحَشُّمًا لَهَا»

’’محمد بن سیرین جب اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ماں کے بے حد احترام اور تواضع کے سبب اپنی زبان نہیں کھولتے تھے۔‘‘

ایک دفعہ محمد بن سیرین رحمہ اللہ اپنی ماں کی خدمت میں حاضر تھے۔ ایک آدمی اُن سے ملاقات کے لیے آیا۔ وہ آدمی محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی مجلس کو پہلے دیکھ چکا تھا اور ان کے رعب اور علمی جاہ وجلال سے واقف تھا۔ جب اُس نے محمد بن سیرین کو ایک عورت کے سامنے اس طرح تواضع اور خاکساری کے عالم میں دیکھا تو وہ وہاں موجود لوگوں سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ محمد بن سیرین ہی ہیں؟ کیا یہ بیمار ہو گئے ہیں؟ وہ اس قدر سہمے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہیں؟ اُسے یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ وہ ماں کی خدمت میں اسی انداز سے رہا کرتے ہیں۔ لوگوں نے اسے بتلایا:

«لَا، وَلٰكِنَّهٗ هٰكَذَا يَكُونُ إِذَا كَانَ عِنْدَ أُمِّهٖ»

”نہیں، وہ بیمار نہیں ہیں، بلکہ جب بھی وہ اپنی والدہ کے پاس ہوتے ہیں تو ان کی حالت ایسی ہی ہوجاتی ہے۔“ [1]

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی وفات سن 110 ہجری میں ہوئی۔ اس وقت اُن کی عمر اَسّی (80) سال سے تجاوز کر چکی تھی۔

قارئین کرام! والدین کے ساتھ اپنا سلوک بھی دیکھیں اور تابعین کے امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کا جو سلوک اپنی والدہ کے ساتھ تھا اس کا بھی مطالعہ کریں پھر خود ہی فیصلہ کریں کہ کیا ہم بھی اپنے ماں باپ کی اسی طرح عزت کرتے ہیں جس طرح امام محمد بن سیرین کیا کرتے تھے؟

[1] صحیح كتاب الزهد، حديث: 1770 وفي نسخة: 1771 وفي نسخة: 1767، وحلية الأولياء: 310/2، حديث: 2350 میں ہے۔ نیز موسوعة الإمام ابن ابی الدنیا: 472/3، حديث: 230، وتاريخ دمشق: 162/56، و سیر اعلام النبلاء: 619/4، وفیات الاعیان اور صفوۃ الصفوۃ میں بھی اسے دیکھا جا سکتا ہے۔

آدھی چادر کا راز

صاحبِ کتاب ''سعادة الدارَیْنِ في بر الوالدَیْن'' نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ اس میں ہر آدمی کے لیے درسِ عبرت ہے۔ میں ان کی مذکورہ کتاب کے حوالے سے یہ واقعہ قلمبند کررہا ہوں۔ واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص تھا۔ اُس کی بیوی اُس کے بوڑھے والد سے سخت نالاں تھی۔ اُسے گھر کے اندر بوڑھے سسر کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، اِس لیے وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سے اپنے شوہر کو ورغلا کر اس کے بوڑھے والد کو گھر سے باہر نکال دے۔

وہ موقع کی تلاش میں رہتی تھی کہ کوئی بہانہ ملے اور وہ اپنے شوہر کو بھڑکا کر اس بوڑھے کو گھر سے بھگا دے۔ باپ کے خلاف بیوی کی باتیں سنتے سنتے شوہر کے بھی کان پک چکے تھے۔ ایک روز شوہر گھر آیا تو اُس کی بیوی نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا:

"تمھارا باپ بہت خراب آدمی ہے۔ مجھے پریشان کرتا رہتا ہے۔ یہ اس قابل نہیں کہ ہم اس کی خدمت کریں۔ اسے فوراً گھر سے باہر نکال دو، اب ہم اس بڈھے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔"

شوہر اپنی بیوی کو سمجھانے کے بجائے اُس کی بات پر عمل درآمد کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے اپنے والد کو گھر سے باہر نکالا اور ایک پہاڑ کے غار میں لے گیا۔ باپ نے پوچھا کہ بیٹا! مجھے اس غار میں کیوں لائے ہو؟ وہ کہنے لگا: آج کے بعد یہی غار آپ کا مسکن ہے، آپ کے گھر میں رہنے کے سبب سے میری بیوی بڑی تکلیف میں ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کو پہاڑ کے غار میں لا کر رکھ دوں تاکہ گھر کا ماحول خراب نہ ہونے پائے۔

"بیٹا! بھلا میں اس غار میں بغیر چادر اور کمبل کے کیسے رہ سکوں گا؟ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ کتنی سردی ہے، اگر مجھے تم اس غار ہی میں رکھنا چاہتے ہو تو کم سے کم ایک چادر مہیا کر دو۔" باپ نے لجاجت سے بیٹے سے کہا۔

اس نافرمان کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی ساتھ تھا۔ بمشکل اس کی عمر کوئی آٹھ دس سال کی ہوگی۔ نافرمان نے اپنے بچے سے کہا: بیٹا! گھر جاؤ اور جلدی سے اپنے دادا کی چادر لے آؤ۔ وہ بچہ بڑا ذہین تھا۔ دوڑتا ہوا گھر گیا اور اپنے دادا کی چادر کو کاٹ کر اس کا آدھا حصہ لے آیا۔ اس کے باپ نے یہ آدھی چادر دیکھ کر کہا: یہ تم نے کیا کیا؟ اس

کا دوسرا حصہ کہاں ہے؟ بچہ کہنے لگا: میں نے آدھی چادر گھر کے اندر ہی چھوڑ دی ہے۔ وہ آپ کے لیے ہے۔ جب آپ بوڑھے ہو جائیں گے تو میں آپ کو اسی غار میں لے آؤں گا اور وہ آدھی چادر آپ کو دے دوں گا۔ یہی سوچ کر میں نے چادر کا آدھا حصہ آپ کے لیے چھپا دیا ہے![1]

قارئین کرام! دیکھا آپ نے اس چھوٹے سے بچے نے اپنے نافرمان باپ کو کیسا دندان شکن جواب دیا۔ دراصل دنیا کا دستور یہی ہے۔ جو جیسا کرتا ہے اسے ویسا ہی پھل ملتا ہے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے ماں باپ کی اچھی سے اچھی خدمت کریں تا کہ ہماری اولاد بھی ہمارے ساتھ بڑھاپے میں نیک سلوک کرے۔

---

[1] دیکھیے کتاب: سعادة الدارين في بر الوالدين، ص:85.

اللہ اللہ! کافر والدین کا بھی کیا مرتبہ ہے

والدین کے حوالے سے جب ہم قرآن کریم اور اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے آدمی کا بہت بڑا درجہ ہے۔ اولاد کی طرف سے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک ہر حالت میں مطلوب ہے۔ اِس کا اندازہ اِس بات سے لگائیے کہ کفر سے بڑھ کر اللہ کی نگاہ میں کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ہر گناہ کو چاہے تو معاف کرسکتا ہے سوائے شرک اور کفر کے۔ شرک اور کفر ایسے گناہ ہیں، جو اللہ تعالی کے خلاف بغاوت اور شرفِ انسانیت کی توہین ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گھناؤنے گناہوں کے مرتکب کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ لیکن والدین کا اتنا بڑا درجہ ہے کہ اُن کے کفر اور شرک پر قائم رہنے کے باوجود اولاد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کافر اور مشرک والدین سے نیک سلوک کریں اور ان کے ساتھ بھی صلہ رحمی سے پیش آئیں۔

یہ فاتحِ عراق وایران سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ سورۃ العنکبوت کی آیت (8) میرے والد ہی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت میں کافر والدین کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کر لیا تو اُن کی ماں آگ بگولہ ہوگئی اوران پر بے حد ناراض ہوئی۔ اُس نے بڑی کوشش کی کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اسلام سے منہ موڑ لیں اور دوبارہ کفر کے ماحول میں آجائیں۔ مگر اُن کے دل میں ایمان پوری طرح راسخ ہو چکا تھا اور وہ کسی حالت میں اسلام کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب ماں نے دیکھا کہ اُس کا کوئی حربہ بیٹے کو اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تو اس نے بھوک ہڑتال کر دی اور بیٹے سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ میں اُس وقت تک کھانے پینے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی جب تک تو اسلام چھوڑ کر دوبارہ ہمارے دین میں داخل نہیں ہو جاتا۔ مگر سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر ماں کا یہ حربہ بھی بے کار ثابت ہوا، چنانچہ وہ اپنے بیٹے سے کہنے لگی:

«زَعَمْتَ أَنَّ اللّٰهَ وَصَّاكَ بِوَالِدَيْكَ وَأَنَا أُمُّكَ، وَأَنَا آمُرُكَ بِهٰذَا»

''تمھارا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم فرمایا ہے، میں تمھاری ماں ہوں میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ اسلام چھوڑ دو اور ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ۔''

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کب اپنی کافر ماں کی باتوں میں آنے والے تھے۔ وہ اسلام کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بھی معلوم تھا کہ والدین کی اطاعت ضروری ہے مگر اُن کے حکم پر کفر اور گمراہی کا راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ غرض ماں تین دن تک بھوکی پیاسی دھوپ میں پڑی رہی۔ جب بھوک اور پیاس کی شدت سے اس پر غشی طاری ہوگئی تو سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی عمارہ نے ماں کے منہ میں پانی ڈالا۔ بعد ازاں وہ کھانے پینے لگی۔ اسی

موقعے پر سورۃ العنکبوت کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسٰنَ بِوٰلِدَيْهِ حُسْنًا﴾

''اور ہم نے انسان کو اُس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔'' [1]

مزید برآں یہ آیات بھی نازل ہوئیں:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسٰنَ بِوٰلِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوٰلِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَإِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰى أَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''ہم نے انسان کو اُس کے ماں باپ کے متعلق نصیحت کی ہے، اُس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اسے پیٹ میں رکھا اور اس کا دودھ چھڑانا دو برس میں ہوا، کہ تو میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر گزار رہے، تم سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کا یہ کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا میں اُن کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور اُس کی راہ چلنا جو میری طرف جھکا ہوا ہو، پھر میری ہی طرف تمھیں لوٹنا ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو میں اس سے تمھیں آگاہ کر دوں گا۔'' [2]

در اصل سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ماں انھیں والدین کے بارے میں شریعت اسلامیہ کے مثالی موقف کا حوالہ دے کر عار دلانا چاہ رہی تھی کہ اگر وہ کھانا پینا

[1] العنکبوت 8:29۔ [2] لقمان 15,14:31۔

چھوڑ دے گی تو لوگ انھیں برا بھلا کہیں گے، کہ ماں کو بھوکا پیاسا رکھ کر تڑپا رہا ہے، کیسا سخت دل بیٹا ہے۔ لیکن ماں باپ کے بے حد احترام اور ان کے ساتھ بہتر سے بہتر برتاؤ کا حکم دینے والا اسلام یہ کب گوارہ کر سکتا ہے کہ ماں باپ کی بات مان کر اللہ کی جگہ کسی اور کو معبود تسلیم کر لیا جائے، چنانچہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے دین پر پہاڑ کی طرح مضبوطی سے قائم رہے اور ماں کے لاکھ سمجھانے مجبور کرنے اور شریعت کا حوالہ دے کر کفر کی طرف بلانے پر مطلق توجہ نہیں دی۔ [1]

قارئین کرام! دیکھا آپ نے کہ ماں باپ کا کتنا عظیم مقام و مرتبہ ہے اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کو شرک سے شدید نفرت ہے اور مشرکین کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہرگز معافی نہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمان اولاد کو مشرک ماں باپ کے ساتھ بھی صلہ رحمی اور حُسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے مذکورہ آیات میں یہ حکم ربانی پڑھ لیا ہے کہ دنیا میں اپنے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔ جب کافر اور مشرک ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کی اس قدر تاکید ہے تو پھر مسلم والدین کا کتنا عظیم مقام و مرتبہ ہوگا اور ان کی خدمت گزاری سے اللہ تعالیٰ ہم سے کتنا خوش ہوگا؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

[1] سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ کا یہ واقعہ دیکھنے کے لیے ملاحظہ فرمائیں: صحیح مسلم، فضائل الصحابة، حديث: 1748، بعدالحديث: 2412، وجامع الترمذي، تفسير القرآن، حديث: 3189.

کافر ماں اور مسلمان بیٹی

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا مسلمان ہو گئی تھیں لیکن اُن کی ماں غیر مسلم تھی۔ بیٹی ہونے کے ناتے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کو اس بات کا بے حد ملال تھا کہ اُن کی ماں کافرہ اور مُشرکہ ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہر کافر اور مشرک کے لیے ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ واجب کر دی ہے۔ ایسی صورت میں ایک بیٹی کا اپنی ماں کے لیے تڑپنا اور بے قرار رہنا ایک فطری عمل تھا، چنانچہ وہ اپنی ماں کو گاہے بگاہے اسلام اور اسلامی تعلیمات کے متعلق بتاتی رہتی تھیں، تاکہ ماں کا دل اسلام کی طرف مائل ہو جائے اور وہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ مگر اُن کی ماں اپنے کفر اور شرک پر مُصِر رہی اور اسلام قبول کرنے سے انکار کرتی رہی۔ اس بات پر سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا انتہائی رنجیدہ رہیں۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ چلی آئیں۔ اُن کی ماں مشرکین کے ساتھ مکہ ہی میں رہ گئی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار قریش کے درمیان جب معاہدہ ہوا کہ مکہ کے لوگ مدینہ اور مدینہ کے لوگ مکہ بلاخوف وخطر آ جا سکتے ہیں۔ مسلمان یا کافر ایک دوسرے کو تنگ نہیں کریں گے۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کی والدہ مدینہ منورہ آئیں۔ وہ بیٹی کی محبت میں مکہ سے چل کر مدینہ پہنچی تھیں۔ ماں کو دیکھ کر بیٹی کی رگوں میں محبت

کی بجلیاں کوندنے لگیں، مگر وہ تذبذب کا شکار تھیں کہ آیا از رُوئے دینِ حنیف کافر والدین کے ساتھ بھی صلہ رحمی کا معاملہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میری ماں مکہ سے چل کر میرے پاس مدینہ آئی ہے۔ وہ مجھ سے صلہ رحمی کی توقع رکھتی ہے۔ وہ اب تک حالتِ شرک میں ہے، مسلمان نہیں ہوئی۔ کیا میں اُس کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟

نبی کریم ﷺ نے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا: «نعم، صليها»

''ہاں ہاں، اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔''[1]

اندازہ کریں کہ نبی کریم ﷺ نے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کو کیا جواب دیا۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ کافر مرد اور عورت دونوں ہی اس روئے زمین پر اللہ اور اُس کے دین کے دشمن اور نجس ہیں، ان کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت مت دو۔ اُن کے ساتھ کسی قسم کا نرم برتاؤ مت کرو۔ بلکہ آپ ﷺ نے سیّدہ اسماء رضی اللہ عنہا کو مشرک اور کافر ماں کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک کرنے اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعے سے اسلام کی آفاقیت اور حقانیت کا پتہ چلتا ہے کہ کافر والدین کو بھی اسلام نے کتنا بڑا مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس میں یہ تعلیم ہے کہ جب کافر ماں باپ کے لیے حُسنِ سلوک اور صلہ رحمی کا یہ حکم ہے تو پھر مسلم والدین کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک کا حکم کس قدر زبردست اہمیت کا حامل ہوگا۔ ہر مسلمان کو اپنے ماں باپ کی زیادہ سے زیادہ عزت اور خدمت کرنی چاہیے۔

---

[1] یہ واقعہ حدیث کی متعدد کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دیکھیے: صحيح البخاري، الجزية والموادعة، حديث: 3183، و صحيح مسلم، الزكاة، حديث: 1003.

جہاد کے لیے ماں باپ سے اجازت لینے کا حکم

ایک آدمی یمن سے چل کر مدینہ منورہ پہنچا۔ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار تھا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح اُسے بھی مسلم مجاہدین کے ساتھ کفار اور اللہ کے دشمنوں سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے کسی جنگی مہم پر بھیج دیا جائے، تاکہ اُسے شہادت نصیب ہو سکے یا کم ازکم غازیوں میں اُس کا شمار ہو جائے۔ اُس نے کوشش کی کہ اُس کا بھی نام مسلم مجاہدین کی فہرست میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ نبی کریم ﷺ ہی کرتے تھے کہ درپیش مہم میں کون کون سے افراد شامل ہوں گے۔ چنانچہ جہاد کے لیے درخواست دینے والوں میں ایک نام اس یمنی نوجوان کا بھی آیا۔ نبی کریم ﷺ نے اُسے اپنے پاس بلوایا اور پوچھا:

«هَلْ لَكَ أَحَدٌ بِالْيَمَنِ؟»

''کیا یمن میں تمھارا کوئی ہے؟''

اُس نے عرض کیا: جی ہاں، میرے ماں باپ ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«هَلْ أَذِنَا لَكَ؟»

''کیا تمھارے ماں باپ نے تمھیں جہاد پر جانے کی اجازت دی ہے؟''

اُس نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِرْجِعْ إِلَيْهِمَا فَاسْتَأْذِنْهُمَا، فَإِنْ أَذِنَا لَكَ فَجَاهِدْ وَإِلَّا فَبِرَّهُمَا»

''تم واپس اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاؤ اور اُن سے جہاد کرنے کی اجازت طلب کرو، اگر وہ اجازت دیں تو پھر جہاد کرنا، ورنہ اُنھی کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا (یہی تمھارا جہاد ہے)۔'' [1]

اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث ہے۔ ذرا وہ بھی پڑھیں:

ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے ہجرت پر بیعت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ جب میں آپ ﷺ کی خدمت میں ہجرت پر بیعت کرنے کے لیے گھر سے آ رہا تھا تو میرے ماں باپ رو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اس نوجوان سے فرمایا:

«اِرْجِعْ إِلَيْهِمَا فَأَضْحِكْهُمَا كَمَا أَبْكَيْتَهُمَا»

''اپنے ماں باپ کے پاس واپس جاؤ اور انھیں ہنساؤ جیسا کہ انھیں رُلایا ہے۔'' [2]

---

[1] دیکھیے: سنن أبي داود، الجهاد، حديث: 2530. [2] دیکھیے: سنن أبي داود الجهاد، حديث: 2528، و سنن ابن ماجه الجهاد، حديث: 2782 واللفظ له.

والدین کو راضی رکھنے کے چند اور اصول

(3)

والدین کو راضی رکھنے کے چند اور اصول

میں نے اپنی عملی زندگی میں دیکھا ہے کہ چاہے والدین دنیا دار ہی ہوں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چاہے وہ بعض اخلاقی کمزوریوں میں بھی مبتلا ہوں، تب بھی وہ اپنی اولاد کو نہایت اعلیٰ اخلاق کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد قرآن پڑھے، نماز روزے کی پابند ہو، والدین چاہے خود کتنے ہی گئے گزرے ہوں، وہ کسی بھی قیمت پر اپنی اولاد کو چور، ڈاکو، یا قاتل کی شکل میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے، اس لیے وہ امکان بھر پوری تگ و دو کرتے ہیں کہ ان کی اولاد تمام اخلاقی برائیوں سے پاک رہ کر اعلیٰ اخلاق و کردار کی حامل شخصیت بنے۔

والدین کو اپنی گفتگو سے یہ باور کروائیں کہ آپ مجھے یقیناً سعادت مند، خوش خرم، ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری بھی دلی تمنا ہے کہ آپ مجھ سے راضی اور خوش رہیں۔ آپ کے یہ الفاظ ان کی تمام امیدوں کو بر لانے والے ثابت ہوں گے۔ یاد رکھیں کہ والدین کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی اولاد ان سے خوش ہو۔ اگر آپ ان سے راضی ہیں اور وہ آپ سے خوش ہیں تو پھر سمجھ لیجیے کہ آپ کی قسمت کے کواڑ کھل گئے۔ اب دنیا جہاں کی کامیابیاں آپ کے مقدر میں ہیں۔

اگر یہ خود نمائی نہ ہو تو تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے بار بار اپنی والدہ ماجدہ کے پاس بیٹھ کر اس قسم کی گفتگو کی ہے۔

کیفیت یہ ہوتی کہ والدہ ماجدہ عموماً آرام کر رہی ہوتیں، میں ان کے پاس بیٹھ جاتا، اکثر ان کا ہاتھ تھام کر کہتا:

اچھا تو امی جان! آپ مجھ سے راضی ہیں ناں؟

جواب ملتا: ہاں! بیٹا راضی ہوں۔

واقعی آپ مجھ سے راضی ہیں؟

ہاں بیٹے! میں واقعی تم سے راضی ہوں۔

نہیں امی جان! آپ یوں ہی اوپری طور پر کہہ رہی ہیں۔

میں سچ کہہ رہی ہوں کہ تم سے دل و جان سے راضی ہوں۔

نہیں امی جان! مجھے اعتبار نہیں آ رہا، آپ قسم کھائیں کہ آپ مجھ سے راضی ہیں۔

اچھا میں قسم کھاتی ہوں کہ تم سے ہر طرح راضی اور خوش ہوں۔

اچھا اگر ایسی بات ہے تو پھر قیامت والے دن آپ اللہ کے حضور کوئی شکوہ تو نہیں کریں گی؟

نہیں بیٹا! میں تم سے دل و جان سے راضی ہوں، بھلا میں تمھارا شکوہ کیوں کروں گی۔

قارئین کرام! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی گفتگو کے بعد والدہ کے دل سے دعائیں نہ نکلتی ہوں گی؟ آپ یقین جانیے، وہ مجھے ڈھیروں دعائیں دے دیتی تھیں۔ مجھے اپنی شفقت و مرحمت کے چھینٹوں سے اس قدر نہلا دیتی تھیں کہ میں ان کی ممتا کے لمس سے نہال ہو جاتا تھا۔

محترم قارئین! ان گزارشات کے بعد کیا میں آپ سے یہ التجا نہ کروں کہ آپ بھی اپنے گرامی والدین سے ایسی ہی محبت بھری باتیں کریں اور اُن کی دعاؤں کے خزانے سے مالا مال ہو جائیں۔ ذرا آپ ایسا کر کے تو دیکھیے، آپ کو عجیب سی لذت اور سرور ملے گا۔

اگر آپ کے دادا جان، دادی جان، نانا جان، نانی جان زندہ ہیں تو ان کی عزت وتوقیر میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیں۔ حتی الامکان ان کی خدمت کریں۔ان کی ضرورت کے کام کریں۔ ان کے علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ چھوڑیں۔ ان کو راضی رکھیں۔ ایسا کرنے سے آپ کے والدین آپ سے بے حد خوش ہوں گے آپ کو بے شمار دعائیں ملیں گی۔ یوں آپ پر خیر و برکت کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

اگر یہ بزرگ وفات پا چکے ہیں تو ان کا ذکر خیر بڑے اچھے انداز میں کیجیے۔ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کیجیے۔ راقم کو یاد ہے کہ جب میں شروع شروع میں سعودی عرب آیا تو دادا جان، دادی جان اور نانا جان، نانی جان کی طرف سے حرمین الشریفین میں ایک ایک قرآن پاک کا نسخہ خرید کر رکھا۔ نیت یہ تھی کہ اس نیک کام کا اجر وثواب ان کو حاصل ہو، پھر میں نے اپنے ایک خط میں اپنے والد محترم کو اس کی اطلاع دی۔ اس کا جواب والد محترم کی طرف سے بے شمار دعاؤں کی صورت میں ملا۔ بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ نے وفات پا جانے والوں کے بارے میں جو فرمایا ہے وہ حق اور سچ ہے کہ "جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اُس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں: ❶ صدقہ جاریہ۔ ❷ ایسا علم جس سے لوگ مرنے کے بعد بھی فائدہ اٹھائیں اور ❸ نیک اولاد، جو اُس کے لیے

دعا کرے۔'' [1]

کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ والدین کی وفات کے بعد کوئی ایسا کام کریں جو ان کی نیکیوں میں اضافے کا سبب بنے، مثلاً: مسجد تعمیر کرنا، ضروری نہیں کہ آپ پوری مسجد تعمیر کرائیں، ہاں! اگر آپ صاحب استطاعت ہیں تو پوری مسجد خود بنوائیں ورنہ آپ اپنی حیثیت کے مطابق اس میں حصہ ڈال دیں۔ والدین کے نام سے کنواں کھدوا دیں یا ٹیوب ویل لگوادیں، بعض یتیموں کی کفالت اپنے ذمہ لے لیں۔ قرآن کریم کی طباعت اور اشاعت میں حصہ ڈالیں۔ ہسپتال میں والدین کے نام کا بلاک بنوادیں۔ قرآن وسنت کی تعلیم کے پابند مدارس کی تعمیر میں والدین کا حصہ ڈال دیں۔ بہت سے ایسے کام ہیں جن میں آپ حصہ ڈال کر اپنے والدین کی نیکیوں میں اضافے کا سبب بن سکتے ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اپنے والدین کو ہر کام اور ہر بات میں ترجیح دیں، اپنے دوستوں اور بیوی بچوں پر اُنھی کو فوقیت دیں۔

اگر آپ کے والدین آپ کے پاس نہیں رہتے تو کبھی کبھار ان کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیں۔ ان سے التجا کریں کہ وہ آپ کے پاس آکر رہیں، آپ کا یہ کام ان کی زندگی میں نمایاں تبدیلی کا باعث ہوگا۔ اپنے بیٹے کے اس اہتمام سے وہ یقیناً بے حد خوش ہوں گے۔

جس طرح آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز میں جائیں وہاں جاکر خریداری کریں، والدین کی بھی کم وبیش ایسی ہی خواہش ہوتی ہے، اس میں

---

[1] صحيح مسلم، الوصية، حديث:1631.

شک نہیں کہ بزرگوں میں دنیا کی رعنائیوں کی رغبت بتدریج کم ہو جاتی ہے۔ مگر فطری تقاضے بھی اپنی جگہ کام کرتے رہتے ہیں، انھیں بھی سیر کرائیے۔ کبھی کبھی شاپنگ کے لیے انھیں بڑی بڑی عمارتوں اور شاپنگ سنٹرز میں لے جایا کریں۔ اس سے وہ خوش ہوں گے۔

والدہ کے سامنے اپنے والد کی تعریف کیجیے، ان کے محاسن اور خوبیاں بیان کیجیے۔ اسی طرح والد کے سامنے والدہ کے حُسنِ سیرت وکردار کا تذکرہ کیجیے۔ ان کی اچھی باتوں کو نمایاں کر کے پیش کیجیے۔ اس طرح آپ کے والد اور والدہ کی باہمی محبت میں اضافہ ہوگا۔ وہ آپ پر فخر کریں گے کہ ہمارے خوشگوار تعلقات کی استواری میں ہمارے بیٹے کا نمایاں ہاتھ ہے۔

والدین، خصوصاً والدہ صاحبہ کے گھریلو معاملات کے سلیقے کی تعریف کریں۔ عموماً ہمارے معاشرے میں گھر کا بجٹ عورتیں چلاتی ہیں، جس عمدہ انداز میں وہ اپنے خاوند کی کمائی خرچ کر کے پس انداز بھی کرتی ہیں، اگر ان کو اس حُسنِ تصرف پر داد دی جائے اور کھل کر اعتراف کیا جائے کہ گھر کے معاملات کو والدہ صاحبہ نے بڑے ہی اچھے انداز میں چلایا ہے تو آپ کی والدہ خود اعتمادی سے مالا مال ہو جائیں گی اور وہ گھر کا نظام مزید بہتر انداز میں چلائیں گی۔

اگر آپ بیٹی ہیں تو یہ بات معلوم اور معروف ہے کہ آپ اپنی والدہ کے بہت قریب ہیں۔ آپ والدہ کے راز کبھی فاش نہ ہونے دیں۔ ان کی نفسیات کو سمجھیں اور اس کے مطابق ان سے معاملہ کریں۔ ان سے آپ کا رویہ بالکل ایک دوست اور سہیلی جیسا ہونا چاہیے۔ ہر چھوٹی بڑی بات میں ان کو اعتماد میں لیں۔ ان سے مشورہ کریں۔

اگر آپ کی اور بھی بہنیں ہیں تو ان کے ساتھ محبت، پیار اور حسن معاملہ کا سلوک کریں۔ ان کو گاہے گاہے تحفے تحائف پیش کریں۔ آپ کے اس عمل سے آپ کی والدہ آپ سے بہت راضی اور خوش ہوں گی۔ ماں کی فطرت میں ہے کہ اگر کوئی اس کی بیٹیوں سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی اسے محبت اور پیار کرے گی۔ آپ کا یہ عمل جہاں صلہ رحمی کے ضمن میں آئے گا وہاں والدہ کی رضا اور خوشی کا باعث بھی ہوگا۔

اپنی اولاد کی تربیت اس انداز میں کریں کہ وہ اپنے بزرگوں خصوصا دادا جان، دادی جان، نانا جان، نانی جان کی عزت اور احترام کریں۔ اپنے بچوں سے کہیں کہ وہ ان کو مختلف مواقع پر تحفے پیش کریں۔ یہ بے شک بیش قیمت نہ ہوں اپنی حیثیت کے مطابق ہی پیش کریں، خواہ وہ ایک پھول ہی ہو۔ اپنی اولاد کی اولاد کے ہاتھوں سے ملنے والا تحفہ ان کے لیے ہفت اقلیم سے کم اہمیت کا حامل نہ ہوگا۔ ذرا آزما کر تو دیکھیں۔

والدین اگر ضعیف ہیں تو ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو مسجد، بازار، ہسپتال اور عزیزوں کے ہاں لے جائیں۔ اگر وہ اٹھنے لگیں تو ان کے سامنے اُن کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھ دیں۔ یاد رکھیں کہ ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سب سے زیادہ آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ والدین کے حقوق کبھی ختم نہیں ہوتے۔ آپ ان کا جتنا بھی حق ادا کریں کم ہے۔

والدین کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کا گھر صاف ستھرا ہو۔ آپ ان کے گھر کو بنانے سنوارنے میں ان کی مدد کریں، اس کی مرمت کراتے رہیں۔ کوئی توڑ پھوڑ کا مرمت طلب کام ہو، رنگ روغن کرنا ہو، صحن میں پھول بوٹے لگانے ہوں، اس سلسلے میں آپ اپنے والدین کی مدد کریں۔ ان کو مشورے دیں۔ خود عملی طور پر شریک ہوں۔ والدین کو یہ احساس دلائیں کہ ان کے گھر کی تعمیر اور دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے۔

والدین کے سونے کے کمرے کو بھی آپ اپنی توجہ کا مرکز بنائیں۔ اُنھیں سارا دن وہاں گزارنا ہوتا ہے۔ اس کمرے کو خوبصورت ہونا چاہیے۔ انھیں اپنی دیگر اولاد سے بھی اسی کمرے میں ملنا ہے۔ مہمانوں کو بھی یہیں آنا ہے تو اس کمرے کی ضروریات کو دیکھیں۔ کیا اس کے پردے مناسب ہیں؟ مختلف اوقات میں بیڈ شیٹ تبدیل کریں۔ اگر وہاں کرسیاں یا صوفہ ہے تو جائزہ لیں کہ وہ زیادہ پرانا تو نہیں ہوگیا؟ یہ بات ذہن میں رہے کہ بڑے بوڑھوں کے پاس ان کے ملاقاتیوں کو انھی کے کمروں میں آنا ہے تو کیا والدین کا کمرہ ان کے شایانِ شان ہے؟

والدین کے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے وہ خوش بھی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر بھی عمل درآمد ہوگا۔

بعض معاشروں میں والدین کے نام پر اولاد کے نام رکھنے کا رواج ہے اور والدین اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کے نام کو زندہ رکھا جائے۔ خصوصاً عربوں میں یہ بات عام ہے۔ خود راقم الحروف نے اپنے بعض عزیزوں کے نام اپنے بزرگوں کے نام پر رکھوائے۔ یہ درست ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں مگر اس طرح ان کے نام زندہ رہتے ہیں اور ان کے محاسن کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔

فرض کیجیے آپ کہیں جا رہے ہیں، گاڑی میں سوار ہونا ہے تو پیش قدمی کر کے پہلے والدین کو سوار کریں، ان کا بازو تھام کر انھیں اگلی سیٹ پر بٹھائیں۔ اس طرح ان میں اعتماد پیدا ہوگا کہ میرا بیٹا میری عزت کرتا ہے۔ اسی طرح اترتے وقت بھی ان کو پہلے اترنے دیں، ہاں اگر ان کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے تو آپ پہلے اتر کر ان کی مدد کریں۔ بظاہر یہ بات معمولی نظر آتی ہے مگر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

یہ قرآنی تعلیمات ہیں کہ ہم اپنے والدین کے لیے دعائیں کریں۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا اس سے زیادہ اور کون سا خوبصورت کام ہے کہ آپ اپنے ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے کہہ رہے ہوں: ﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ ”اے ہمارے رب! ان پر اس طرح رحم فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں میرے اوپر رحم کیا۔“[1] اگر یہ دعائیں قبولیت دعا کے اوقات میں کی جائیں تو ان کی افادیت دوچند ہوجاتی ہے۔

والدین کے پاس بیٹھنے سے پہلے ان سے گفتگو کے لیے وقت مقرر کرلیں۔ اس دوران اپنی پوری توجہ ان کی طرف مبذول رکھیں۔ اخبارات، ٹی وی اور موبائل وغیرہ بند کردیں۔ پورے انہماک سے ان کی باتیں سنیں اور اپنی باتیں سنائیں۔

اپنے والدین پر، ان کی شخصیت پر فخر کریں، جہاں بیٹھیں والدین کا تذکرہ اس انداز میں کریں کہ وہی آپ کے رول ماڈل ہیں اور آپ ان کی ہر معاملے میں پیروی کررہے ہیں۔

والدین کی دعائیں اپنی اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہیں۔آپ ان سے دعا کی درخواست کرتے رہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ والدین اپنی اولاد کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ مگر مختلف مواقع پر ان سے دعا کے لیے کہنا بڑی مستحسن بات ہے۔راقم الحروف کی زندگی میں والدین کی خصوصاً والدہ صاحبہ کی دعاؤں کا بڑا دخل ہے۔ جب وہ پاکستان میں ہوتیں تو میں عموماً فجر کی نماز کے بعد ان کو فون کرتا۔کوئی اہم میٹنگ ہوتی تو اُن سے عرض کرتا کہ آج میری میٹنگ ہے، امی جان! دعا فرمائیں وہ عموماً

---

[1] بنی إسرآء یل 24:17.

مصلّی پر بیٹھی ہوتی تھیں۔ معاً فرماتی تھیں: بس میں ابھی دو نفل پڑھ کر تمھارے لیے دعا کرتی ہوں، ان شاء اللہ تمھیں کامیابی نصیب ہو گی۔ بلاشبہ ایسا ہی ہوتا کہ میں کامیاب و کامران واپس آتا۔ والدین سے دعا کرانے میں کتنی لذت، ٹھنڈک اور تب و تاب ملتی ہے۔ نوکری پر، کاروبار پر جانے سے پہلے آپ والدین کے پاس آتے ہیں، ان سے اجازت لیتے ہیں کہ میں جا رہا ہوں۔ دعا فرمائیں اور پھر آپ ڈھیروں دعاؤں کو سمیٹتے ہوئے گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ اپنے دل سے پوچھیے، کیا والدین کی دعائیں آپ کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہیں؟

......اور انھوں نے مرغی کو دانہ ڈال دیا

حیوہ بن شریح ﷫ مشہور تابعی ہیں۔ اُن کے علمِ و زُہد کا دُور دُور تک چرچا تھا۔ ان کے درس میں دُور دراز سے طلبہ حاضر ہوا کرتے تھے۔ اُن کا درس مثالی ہوا کرتا تھا۔ مسجد میں اُن کے درس کا حلقہ تھا۔ سیرت نگاروں نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اپنی والدہ کے ساتھ نہایت ادب واحترام سے پیش آتے تھے۔ ماں کے حکم کی تعمیل کرنا انھیں ہر حال میں محبوب تھا۔ وہ اپنی ماں کی بات کو کبھی ٹال مٹول کے انداز میں نہیں لیتے تھے۔ اُن کے زمانے میں بھی یہ مشہور تھا کہ حیوہ بن شریح ﷫ اپنی والدہ کے بے حد مطیع اور فرماں بردار ہیں۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ حیوہ بن شریح ﷫ درس وتدریس میں مشغول ہوتے۔ ان کے پاس طلبہ کا ایک جمِ غفیر ہوتا۔ وہ انھیں پڑھانے میں مصروف ہوتے۔ مسئلہ زیرِ بحث ہوتا اور وہ مسئلے کو سلجھانے کے لیے مختلف دلائل پیش کر رہے ہوتے۔ طلبہ کاغذ قلم ہاتھ میں لیے اُن کی باتوں کو نوٹ کر رہے ہوتے۔ اِسی اثنا میں اُن کی والدہ مسجد میں آ جاتی اور کہتی:

«قُمْ فَاعْلِفِ الدَّجَاجَ»

''اٹھو اور مرغی کو دانہ ڈال دو۔''

چنانچہ حیوہ بن شریح رحمہ اللہ ماں کی بات سنتے ہی فوراً اٹھتے اور مرغی کو دانہ ڈالنے کے لیے چلے جاتے۔ طلبہ کاپی قلم ہاتھ میں لیے اُن کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ جب وہ مرغی کو دانہ ڈال کر واپس آتے تو ادھورا درس مکمل فرماتے۔

اِس واقعے سے ہمارے اسلاف کی اپنے والدین کے ساتھ بے حد محبت اور حُسنِ سلوک کا پتہ چلتا ہے۔ اے کاش! آج کے مسلم نوجوان بھی اپنے اسلاف کا یہ مبارک عمل اپنالیں۔ [1]

[1] حیوہ بن شریح کے بارے میں تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اسلامی مؤرخین کی اکثریت نے ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ آپ اسلامی تاریخ کی کتابوں میں ان کے احوال پڑھ سکتے ہیں۔ یہ واقعہ آپ انٹرنیٹ پر بھی آن لائن پڑھ سکتے ہیں۔ دیکھیے: www.islamway.com

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی رو پڑے

امیہ الکنانی کا شمار اُس کی قوم کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام کلاب تھا۔ کلاب بن امیہ الکنانی اپنے والد کا بڑا وفادار اور اطاعت گزار تھا۔ رات ہو یا دن، جب بھی فرصت ملتی وہ اپنے والد کے پاس آتا۔ اُس سے خیریت دریافت کرتا اور اُس کی خدمت کرتا۔ اُس کا والد امیہ الکنانی بیٹے کی اطاعت اور فرماں برداری سے بڑا خوش تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا تھا۔ پَل بھر کے لیے بھی بیٹے کو اپنی نظروں سے دُور نہیں ہونے دیتا تھا۔ باپ بیٹے کی باہمی محبت اور الفت کا چرچا دُور دُور تک تھا۔

کلاب بن امیہ الکنانی جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچا تو یہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت تھا۔ مدینہ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور لوگ ہر طرف سے جوق در جوق اسلام قبول کرنے کے لیے حکومتِ اسلامیہ کے

دار الخلافہ، مدینہ منورہ کا رخ کر رہے تھے۔ انھی ایام میں کلاب بن امیہ الکنانی بھی مدینہ منورہ پہنچا اور باشندگانِ مدینہ کے ساتھ بودو باش اختیار کر لی۔ ایک عرصے تک مدینہ میں اُس نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں۔ اُسے جب ایمان وعلم میں کچھ پختگی محسوس ہوئی تو اُس نے اپنی سیرت کو اور زیادہ مجلّا کرنے کی کوشش کی۔

کلاب بن امیہ الکنانی کو جب علم ہوا کہ اسلام میں سب سے افضل عمل اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے تو وہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں اپنے پاکیزہ جذبات سے آگاہ کیا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان کو جہاد پر نکلنے کے لیے اجازت طلب کرنے پر ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے اُس کا نام اسلامی لشکر میں درج کرا دیا، پھر ایران کی طرف کوچ کرنے والی اسلامی فوج میں اسے بھی شامل کر لیا گیا۔

کلاب بن امیہ الکنانی کے بارے میں جب اس کے والد امیہ الکنانی کو پتا چلا کہ بیٹا جہاد کے لیے ایران کی طرف کوچ کرنے والی اسلامی فوج کے ساتھ روانہ ہونا چاہتا ہے تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر جہاد کے لیے نہ جاؤ۔ ہم دونوں میاں بیوی نے تمھیں بڑے پیار سے پالا پوسا ہے تاکہ بڑھاپے میں تم ہمارے کام آؤ۔ ہماری خدمت کرو لیکن آج تم ہمیں چھوڑ کر دور جا رہے ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم پل بھر کے لیے بھی ہماری نظروں سے اوجھل رہو۔

کلاب بن امیہ الکنانی نے اپنے والد کے جواب میں عرض کیا:

«أَتْرُكُكُمَا لِمَا هُوَ خَيْرٌ لِّي»

''میں اس کام کے لیے آپ دونوں کو چھوڑ رہا ہوں جو میرے حق میں بہتر ہے۔''

کلاب بن امیہ الکنانی نے جب دیکھا کہ اس کے والدین اس کی وضاحتوں سے راضی ہو گئے ہیں اور اُن کی طرف سے اجازت مل گئی ہے، وہ ایران کی طرف کوچ کرنے والی اسلامی فوج کے ساتھ جہاد کی مہم پر روانہ ہو گیا۔لشکر کو مدینہ سے نکلے ہوئے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ اُس کے ماں باپ نے اُسے جنگ کی مہم پر نکلنے کی اجازت تو دے دی تھی مگر اُس کے سفرِ جہاد پر روانہ ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد انھیں بیٹے کی محبت ستانے لگی۔ دونوں میاں بیوی رات کو سوتے وقت اپنے بیٹے کلاب بن امیہ الکنانی کا ذکر کرتے اور اپنے ساتھ اُس کے حُسنِ سلوک کو یاد کر کے آنسو بہاتے۔ کلاب بن امیہ الکنانی کے پاس کھجوروں کا ایک باغ تھا۔ ایک روز وہ دونوں میاں بیوی اپنے باغ میں بیٹھے ہوئے کسی خاص موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ اس روز پھلدار درختوں کا سایہ کچھ زیادہ ہی سہانا منظر پیش کر رہا تھا۔ اُوپر سے چڑیوں کے چہچہانے کی خوش آہنگی سے فضا نغمہ بار معلوم ہو رہی تھی۔ چڑیاں ایک درخت سے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی دوسرے درخت کا رُخ کرتیں اور بیٹھ کر چہچہانے لگتیں۔ اچانک کلاب بن امیہ الکنانی کے بوڑھے والد کی نگاہ اٹھی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک کبوتر اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔کبھی بچے کے پاس جاتا اور کبھی اس کے پاس سے اڑ کر دوسرے درخت پر جا بیٹھتا۔ امیہ الکنانی کو کبوتر اور اس کا بچہ دیکھ کر اپنا بیٹا کلاب یاد آ گیا اور وہ آہیں بھرنے لگا۔کلاب کی ماں بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے جب شوہر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو بیٹے کی محبت میں اُس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔ اب کیا تھا میاں بیوی باغ کے خوشگوار ماحول میں بھی رنجیدہ ہو گئے اور سسکیاں بھرنے لگے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ امیہ

الکنانی اپنے بیٹے کلاب بن امیہ الکنانی کی یاد میں بہت رویا۔ وہ پہلے ہی کمزور اور بوڑھا تھا۔ لیکن بیٹے کی جدائی کے غم سے اُس کے بڑھاپے کی جُھریوں میں مزید اضافہ ہوگیا، اور اُس کی بینائی بھی کمزور ہوگئی۔

کلاب بن امیہ الکنانی کو جہاد کی مہم پر روانہ ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ بیٹے کی جدائی سے باپ کو سخت تکلیف تھی۔ اُس نے ایک حد تک تو برداشت کیا مگر ایک دن وہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ امیہ الکنانی اب امیر المؤمنین سے مخاطب تھا۔ اس نے کہا:

«وَاللّٰهِ! يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! لَئِنْ لَّمْ تَرُدَّ عَلَيَّ وَلَدِي لَأَدْعُوَنَّ عَلَيْكَ فِي عَرَفَاتٍ»

''اللہ کی قسم! اے خطاب کے بیٹے! اگر تم نے میرے بیٹے کو واپس نہیں بلایا تو میں میدانِ عرفات میں تمھارے لیے بددعا کروں گا۔''

امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بڑے صاحب فراست اور فرد شناس انسان تھے۔ وہ اپنی رعایا کے جذبات کو فوراً بھانپ لیا کرتے تھے۔ انھوں نے فوراً بیٹے کے لیے امیہ الکنانی کی محبت کو بھانپ لیا اور اُس کے پیمانۂ صبر کو چھلکتا دیکھ کر فوج کی طرف ایک نمایندہ یہ حکم دے کر روانہ کر دیا کہ امیہ الکنانی کے فرزند کلاب کو جنگ کی مہم سے فارغ کر کے فوراً مدینہ منورہ بھیج دیا جائے۔ چند دنوں میں کلاب بن امیہ الکنانی امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

امیر المؤمنین نے کلاب بن امیہ الکنانی سے دریافت فرمایا: «مَا بَلَغَ بِرُّكَ بِأَبِيكَ؟»

''والد کے ساتھ تمھارے حُسنِ سلوک کا کیا قصہ ہے؟''

کلاب بن امیہ الکنانی نے سیدنا عمر بن خطاب کے جواب میں عرض کیا:

''بات یہ ہے کہ میں ہر بات میں اپنے والد محترم کو اپنے پر ترجیح دیا کرتا تھا۔ اُن کے حکموں کی فوراً تکمیل کرتا۔ جب میں اپنے والد کے لیے دودھ دوہنے کا ارادہ کرتا تو اُس اونٹنی کا رخ کرتا جو سب سے زیادہ دودھ دینے والی ہوتی۔ میں اسے کھلا پلا کر پہلے تیار کرتا۔ اُسے چند لمحے آرام کرنے دیتا، پھر اُس کا تھن دھوتا تاکہ وہ ٹھنڈا ہو جائے، اُس کے بعد دودھ دوہتا اور وہی دودھ اپنے والد کو پلایا کرتا۔''

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کلاب کے والد امیہ الکنانی کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا، بینائی ماند پڑ گئی تھی۔ بڑھاپے کے بوجھ سے اُس کی کمر بھی جھک گئی تھی۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

''ابو کلاب! تم کیسے ہو؟''

''امیر المؤمنین! میں ویسا ہی ہوں جیسا آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔'' امیہ الکنانی نے جواب دیا۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: «مَا أَحَبُّ الْأَشْيَاءِ إِلَيْكَ الْيَوْمَ؟»

''آج کے دن تمھاری نظر میں سب سے زیادہ محبوب چیز کونسی ہے؟''

امیہ الکنانی: «مَا أُحِبُّ الْيَوْمَ شَيْئًا، مَا أَفْرَحُ بِخَيْرٍ وَلَا يَسُوءُنِي شَرٌّ»

''آج کے دن مجھے کسی چیز کی چاہت نہیں، مجھے نہ کسی خیر سے کوئی خوشی ہوگی، نہ کسی شر سے کوئی تکلیف۔''

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا تمھیں اپنے بیٹے کلاب کے علاوہ اس دنیا

میں اور کچھ نہیں چاہیے؟

امیہ الکنانی کہنے لگا: ہاں، بس میری یہی تمنا ہے کہ میرا لختِ جگر کلاب میرے پاس آ جائے، کیونکہ مرنے سے پہلے میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں، اُسے بوسہ دینا چاہتا ہوں اور اُسے گلے لگانا چاہتا ہوں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے باپ کی بیٹے سے اِس قدر محبت دیکھی تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، فرمانے لگے: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ان شاء اللہ تمھاری مراد پوری ہوگی۔

پھر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے امیہ الکنانی کے صاحبزادے کلاب کو اپنے پاس بلوایا اور کہا: جاؤ! اپنے والد کے لیے اونٹنی کا دودھ اُسی طرح دوہ کر لاؤ، جس طرح پہلے اپنے والد کے لیے یہ اہتمام کرتے تھے۔

کلاب نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل کی۔ ٹھیک اُسی طرح سے اونٹنی کا انتخاب کیا۔ اُسی طرح دودھ دوہا، جیسا کہ وہ پہلے اپنے والد کے لیے دوہا کرتا تھا۔ جب وہ دودھ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس لایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے دودھ لے جا کر کلاب کے والد امیہ الکنانی کی خدمت میں پیش کیا۔ امیہ الکنانی کو اپنے بیٹے کلاب کی آمد اور یہ دودھ دوہنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دودھ امیہ الکنانی کی خدمت میں پیش کر کے فرمایا: دودھ نوش فرمایئے۔

امیہ الکنانی نے دودھ کا پیالہ ہاتھ میں اٹھایا اور لب سے لگایا تو دودھ کی خوشبو سونگھتے ہی کہنے لگا: «وَاللّٰهِ! یَا أَمِیرَ الْمُؤْمِنِینَ! إِنِّي لَأَشُمُّ رَائِحَةَ یَدَيْ کِلَابٍ»

”امیر المؤمنین! اللہ کی قسم! بلاشبہ میں اپنے بیٹے کلاب کے ہاتھوں کی مہک

محسوس کر رہا ہوں۔"

اتنا سننا تھا کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی رو پڑے۔ فرمانے لگے:

«هٰذَا كِلَابٌ عِنْدَكَ وَقَدْ جِئْنَاكَ بِهِ»

"لو یہ تمھارا بیٹا کلاب تمھارے پاس حاضر ہے، ہم نے پہلے ہی اسے تمھاری خاطر بلا لیا تھا۔"

یہ سنتے ہی امیہ الکنانی اپنے بیٹے کی طرف لپکا۔ بیٹے کو گلے لگایا اور بوسے دینے لگا۔ باپ کی بیٹے سے شدید محبت کا یہ دل رُبا منظر دیکھ کر امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کی خدمت میں موجود تمام حاضرین بھی رو دیے۔ سب کی آنکھیں بھیگ گئیں، پھر امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کلاب کو مخاطب کر کے فرمایا:

"بیٹے! جاؤ اور جب تک تمھارے والدین زندہ ہیں، اُن کے ساتھ رہ کر اُن کی خدمت گزاری کی شکل میں جہاد کرو جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں تو پھر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا کہ اب تمھیں کیا کرنا چاہیے۔"[1]

---

[1] کلاب بن امیہ الکنانی اور ان کے والد کی سوانح حیات معروف کتاب أسد الغابة: 465/4، اور الإصابة: 460,459/5 وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے علاوہ سیرت و تاریخ کی مختلف کتابوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ واقعہ کتاب «موسوعة قصص السلف» (166-168) اور موسوعة الإمام ابن أبي الدنيا: 473/3، 474، حدیث: 240,239 میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جیل میں باپ کی خدمت کا یادگار واقعہ

خلیفہ مامون کا بیان ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ایک ایسا واقعہ دیکھا ہے جس کی دوسری مثال میں نہیں جانتا۔ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے حوالے سے یہ واقعہ یقیناً مثالی ہے۔ اسے پڑھ کر قارئین کو والدین کے ساتھ اپنے سلوک کا تقابل ضرور کرنا چاہیے۔

یہ واقعہ فضل بن یحییٰ کا ہے۔ فضل بن یحییٰ نے اپنے والد کے ساتھ جس حُسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ صرف تاریخ اسلامی ہی کی خصوصیت ہے کہ ہمارے اسلاف نے والدین کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ فضل بن یحییٰ کے والد، یحییٰ سردی کے دنوں میں ہمیشہ گرم پانی ہی سے وضو کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے سردی کے دنوں میں ان کے لیے ہروقت گرم پانی کا خاص انتظام کیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ کسی وجہ سے فضل بن یحییٰ کے والد کو جیل جانا پڑا۔ فضل بن یحییٰ بھی باپ کے ساتھ گرفتار ہو گئے۔ باپ بیٹا دونوں جیل کی ہوا کھا رہے تھے۔ یہ سردی کا موسم

تھا۔ قید خانے میں قیدیوں کے لیے گرم پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جبکہ فضل بن یحییٰ کے والد کی عادت گرم پانی سے وضو کرنے کی تھی۔ فضل بن یحییٰ نے جیلر سے مطالبہ کیا کہ میرے والد کے لیے گرم پانی کا بندوبست کرایا جائے۔ جیلر نے جواب دیا کہ جیل کے اندر کسی قیدی کے لیے گرم پانی کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ فضل بن یحییٰ نے جیلر سے کہا کہ پھر باہر سے لکڑی منگوا دو، ہم اس کی قیمت ادا کریں گے۔

جیلر نے کہا: جیل کے اندر قیدیوں کے لیے لکڑی جلانے کی اجازت نہیں ہے۔

فضل بن یحییٰ نے جیلر کی بہت منت سماجت کی کہ کسی طرح گرم پانی کا بندوبست ہو جائے تاکہ صبح وہ والد کو گرم پانی سے وضو کرا سکیں۔ جب ان کی تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں اور جیلر نے اُن کی بات ماننے سے بالکل انکار کر دیا، تو انھوں نے پانی کا برتن چراغ کے قریب کر دیا اور طلوعِ فجر تک برتن کو چراغ کے قریب کر کے کھڑے رہے۔ جب اُن کے والد فجر کے وقت بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنے والد کو گرم پانی سے وضو کرایا۔

فضل بن یحییٰ نے رات بھر جاگ کر اور چراغ کے پاس کھڑے ہو کر پانی گرم کیا تو یہ واقعہ جیلر کو بھی معلوم ہو گیا۔ جب دوسرے دن کا سورج غروب ہوا تو فضل بن یحییٰ کے والد سو گئے۔ وہ گزشتہ شب کی طرح پانی گرم کرنے کے لیے چراغ کے پاس جانے لگے تو انھیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ چراغ اپنی جگہ پر موجود نہیں ہے، بلکہ اُسے ایسے مقام پر رکھ دیا گیا ہے جہاں تک ان کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ فضل بن یحییٰ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اب والد کے لیے پانی گرم کرنے کی کون سی تدبیر اختیار کی جائے۔ وہ اسی سوچ میں تھے کہ اُن کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ انھوں نے ٹھنڈے

پانی کے برتن کو اپنے پیٹ پر رکھ لیا، تاکہ پیٹ کی حرارت سے پانی گرم ہو جائے۔ اُن کی یہ تدبیر کامیاب ثابت ہوئی۔ صبح تک پانی گرم تو نہ ہو سکا تاہم وہ ٹھنڈا بھی نہ تھا۔ نمازِ فجر کے وقت جب اُن کے والد بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنے والد کو اس پانی سے وضو کرایا۔

فضل کی وفات رقہ کے قید خانے ہی میں 193ھ میں ہوئی۔ ابنِ اثیر رحمہ اللہ اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فضل بن یحییٰ دنیا کے بہت سے محاسن کا مجموعہ تھے، اُن کا ثانی دنیا میں پھر نہیں دیکھا گیا۔" [1]

---

[1] فضل بن یحییٰ بن خالد البرمکی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے دیکھیں: علامہ خیر الدین زِرِکلی کی کتاب "الاعلام" (153/5)، ابن الاثیر (69/6)، وفیات الاعیان (408/1)، تاریخ بغداد (334/12) وغیرہ، یہ واقعہ انٹرنیٹ کی ویب سائٹ http://muntada.islamtoday.net پر بھی آن لائن پڑھا جا سکتا ہے۔

پھر وہ مسلمان ہوگئی

اس واقعہ کے راوی ایک مشہور مبلغ ہیں۔ ایک دفعہ دعوت وتبلیغ کی غرض سے انھیں یورپی ممالک کے دورے پر جانا پڑا۔ وہ ایک یورپی ملک میں ٹرین کے انتظار میں ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسٹیشن پر اُن کی نگاہ ایکِ بوڑھی خاتون پر پڑی۔ جس کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اُس کے اکثر دانت گر چکے تھے۔ اب ایک دو دانت ہی اُس کے منہ میں باقی تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ بڑھیا کے ہاتھ میں ایک سیب تھا جسے وہ کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن چونکہ اُس کے زیادہ تر دانت گر چکے تھے، اس لیے سیب کھانا اس کے لیے بڑا مشکل تھا، پھر بھی وہ اپنے بقیہ دانتوں کی مدد سے سیب کو کاٹ کاٹ کر کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مبلغ اس بڑھیا کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور اس سے کہا کہ اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو میں سیب کاٹنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ انھوں نے بڑھیا کے ہاتھ سے سیب لیا۔ اپنے بریف کیس سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور اس کی چھوٹی چھوٹی قاشیں بنا کر بڑھیا کو پیش کیں، تا کہ اسے کھانے میں آسانی ہو سکے۔ بڑھیا نے اس اجنبی شخص کا

اپنے ساتھ یہ حسنِ سلوک دیکھا تو اس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

مبلغ نے اس بُڑھیا سے پوچھا: اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟

اُس نے سسکیاں بھرتے ہوئے بتلایا کہ میں کوئی دس سال سے اسی طرح بے یارو مددگار ہوں، کسی نے بھی مجھ سے کبھی میرا حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ نہ میری اولاد میں سے کسی نے میری خیر خبر لی۔ اب میں حیران ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ یہ حسن سلوک کیوں کیا؟ جبکہ آپ شکل وشباہت اور ظاہری حالت سے ایک غیر ملکی اجنبی لگ رہے ہیں؟

اس مبلغ نے بڑھیا کی باتیں غور سے سنیں۔ جب اس نے اپنی بات پوری کر لی تو اُسے بتلایا: اماں جان! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، یہ اُس دین کی اتباع میں کیا ہے جس کا میں پیروکار ہوں۔ اُس دین نے مجھے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ میں جس دین کی اتباع کرتا ہوں، اس کا اپنے ماننے والوں کو یہی حکم ہے کہ بڑوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ بچوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔ والدین کی اطاعت وفرماں برداری کی جائے، ہم پر لازم ہے کہ والدین کا کہا مانیں، ان کے حکم کو ہر حکم پر ترجیح دیں۔ ان کے سخت لب ولہجے کو بھی خوشی خوشی گوارا کریں، بلکہ والدین کی رضا وخوشنودی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا وخوشنودی اور والدین کی ناراضی کو اپنی ناراضی قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں بچے اپنے بوڑھے والدین سے انتہائی محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ شریعت نے انھیں اسی

کی تعلیم دی ہے۔ اور ہاں! میرے ملک میں میری ماں میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس کی عمر بھی آپ کی عمر کے برابر ہوگی۔ میری ماں میرے گھر میں اس طرح رہتی ہے جیسے وہ گھر کی مالکن ہی نہیں بلکہ ملکہ ہو۔ ہم جب بھی گھر سے باہر نکلتے ہیں، اُس سے اجازت لیتے ہیں۔ ہم اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتے جب تک وہ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو۔ میں خود بھی اپنی ماں کی خدمت کرتا ہوں۔ میرے بیوی بچے بھی اس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ ہم اپنی والدہ کی خدمت اس لیے کرتے ہیں کیونکہ ہمارے دینِ حنیف نے ہمیں اپنے والدین کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔

مبلغ کی یہ باتیں سننے کے بعد بڑھیا نے دریافت کیا: تمھارا دین کیا ہے؟ بیٹا!

ہمارا دین ''اسلام'' ہے۔ مبلغ نے جواب دیا۔

بڑھیا نے اسلام کے بارے میں صرف سُن رکھا تھا، اس کی عملی تعلیمات کو قریب سے دیکھنے کا موقع کبھی نہیں مل سکا تھا۔ آج پہلی بار اُسے ریلوے اسٹیشن پر اسلام کی عملی تعلیمات کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس مبلغ کے اخلاق وکردار اور بات چیت سے بہت متاثر ہوئی۔ مبلغ کی زبان سے اسلام اور حقوقِ والدین کے بارے میں جو کچھ سنا، اُس سے وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس نے ریلوے اسٹیشن ہی پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

مبلغ اُس بڑھیا کے اسلام قبول کرنے کا ذریعہ بنا۔ بڑھیا تو خوش نصیب تھی ہی، ساتھ ہی وہ مبلغ بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوگیا جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:
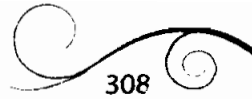
«لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ تَكُونَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ»

''اللہ تعالیٰ تمھارے ذریعے کسی کو راہِ راست کی ہدایت بخشے، یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے (اُن دنوں عرب میں سرخ اونٹ کی بہت زیادہ قیمت ہوا کرتی تھی اور سرخ اونٹ بہت کم ملتے تھے۔)''[1]

[1] اس حدیث کے لیے دیکھیں: صحیح البخاري، الجهاد والسیر، حدیث: 3009، وصحیح مسلم، فضائل الصحابة، حدیث: 2406، و مسند أحمد: 333/5 وغیرہ، یہ واقعہ انٹرنیٹ کی ویب سائٹ http://muntada.islamtoday.net پر بھی آن لائن پڑھا جا سکتا ہے۔

آنکھ کا عطیہ

میری ماں کی ایک ہی آنکھ تھی۔ مجھے اپنی ماں کی ایک آنکھ کے سبب کئی دفعہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری ماں کو میرے ساتھ دیکھ کر جب کوئی پوچھ لیتا کہ یہ تیری ماں ہے؟...... تو مجھے اس قدر شرمندگی ہوتی کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔

میری ماں گھر کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ایک پرائمری اسکول میں باورچی کا کام کیا کرتی تھی۔ اتفاق سے میں بھی اُسی پرائمری اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ ایک دن میری ماں دورانِ تعلیم میرے کلاس روم میں آئی تاکہ وہ میرے بارے میں معلومات حاصل کرسکے کہ میں پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لیتا ہوں یا میری ساری توجہ کھیل کود میں ہے۔ انھوں نے میری پڑھائی لکھائی کے بارے میں میرے اساتذہ سے پوچھا۔ مجھے اپنی ماں کو کلاس روم میں دیکھ کر بڑی شرمندگی کا احساس ہورہا تھا۔ میں اندر ہی اندر اپنی ماں کو کوس رہا تھا۔

دوسرے دن میں اسکول آیا۔کلاس روم میں بیٹھا ہی تھا کہ میرا ایک کلاس فیلو

میرے پاس آیا اور کہنے لگا: کل جو باورچن آئی تھی، جس کی ایک ہی آنکھ تھی، کیا وہی تیری ماں ہے؟ اوہ!...... میں نے جب اپنے کلاس فیلو سے یہ بات سنی تو شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج کا دن دیکھنے سے پہلے ہی میں مر چکا ہوتا، مجھے یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ نہ یہ ذلت برداشت کرنی پڑتی۔ اور سچ مچ دوسرے دن میں نے اپنی والدہ سے کہا: تم نے مجھے دوستوں کے سامنے ایک تماشا بنا ڈالا ہے، تم مر کیوں نہیں جاتیں تاکہ میں اِس عار سے نجات پا جاؤں۔ ایک آنکھ والی ماں سے بہتر تھا کہ میری کوئی ماں ہی نہ ہوتی۔

میں اپنی ماں کے سامنے بہت کچھ اول فول بکا، مگر اُس نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ مجھے اپنی سخت کلامی پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ کیونکہ فی الواقع میں اپنی ماں کی وجہ سے ایک قسم کی گھٹن محسوس کرتا تھا۔ مجھے اُس کے جذبات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ بلکہ میں نے اندر ہی اندر پلان بنا لیا تھا کہ میں پڑھ لکھ کر جب بڑا آدمی بن جاؤں گا تو اپنی ماں سے کہیں دور جا کر رہنے لگوں گا تاکہ مجھے کسی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میری ماں مسلسل میرے بارے میں فکرمند رہتی۔ وہ میری پڑھائی لکھائی پر دھیان دیا کرتی تھی مگر میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ میں نے محنت سے تعلیم حاصل کی۔ میرا داخلہ سنگاپور کی ایک یونیورسٹی میں ہوگیا۔ ایک دن آیا کہ میں سنگاپور پہنچ کر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اعلیٰ ڈگری لے کر جب وطن پہنچا تو مجھے معقول ملازمت مل گئی۔ میں نے شادی کی اور اپنے لیے ایک الگ عالیشان مکان خرید کر اس میں رہنے لگا۔ میں اپنی زندگی سے بڑا مطمئن اور خوش تھا۔ مجھے اس دوران اپنی ماں کی

یاد بھی نہیں آئی، نہ اس سے ملنے کی مجھے کبھی خواہش ہوئی۔ بلکہ میں نے اُسے ملنے کے لیے بلایا بھی نہیں۔ میں کئی بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ انھیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کی کوئی دادی بھی ہے۔

میری والدہ نے بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اسے میری اداؤں سے محسوس ہو چکا تھا کہ میں اندر ہی اندر اُس سے نفرت کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی بچے اُسے دیکھنے پائیں۔ آخر وہ ماں تھی، کب تک بیٹے کی جدائی برداشت کرتی۔ ایک دن وہ میرے گھر کا پتہ پوچھ کر میرے پاس آ ہی گئی۔ ابھی وہ دروازے ہی پر تھی کہ میرے بچے گھر سے باہر نکلے اور اُس کی ایک آنکھ دیکھ کر ہنسنے لگے۔

میں نے گھر سے نکلتے ہی اپنی ماں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ آخر تم نے میرے گھر آنے کی جرأت کیسے کی۔ کیا اِس لیے آئی ہو کہ میرے بچوں کو اپنے ڈراؤنے چہرے سے خوف زدہ کر دو۔ تم ابھی یہاں سے چلی جاؤ۔ اُس نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا: معاف کرنا، شاید میں پتا ہی بھول گئی، پھر وہ واپس چلی گئی۔

ایک دن مجھے اسی پرائمری اسکول کی جانب سے افراد خانہ کے ساتھ میٹنگ کی دعوت ملی، جس میں میری ماں باورچی کا کام کرتی تھی۔ میری ابتدائی تعلیم اسی سکول میں ہوئی تھی۔ میں نے بیوی سے بہانہ بنا دیا کہ میں ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں۔ میں اسکول پہنچا اور میٹنگ ختم ہونے کے بعد اپنے پرانے گھر کی طرف چلا۔ میں بے ارادہ یونہی اپنے گھر جا رہا تھا۔ والدہ کی زیارت مقصود نہ تھی۔ گھر پہنچ کر پڑوسیوں
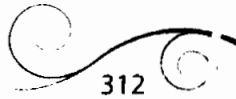
سے معلوم ہوا کہ میری ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے یہ خبر سُن کر بھی کوئی صدمہ نہیں ہوا۔ میری آنکھوں نے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکایا۔ پڑوسیوں نے مجھے ایک خط دیا اور بتلایا کہ تمھاری ماں مرتے وقت یہ خط دے گئی تھی۔

میں نے خط کھولا تو اس میں لکھا تھا:

''بیٹا! میں نے کئی دفعہ تم سے ملنے کی خواہش کی۔ میری بہت تمنا تھی کہ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ اور دنیا جہاں میں تمھارا نام روشن ہو۔ تم پڑھ لکھ کر بڑے بھی بن گئے۔ اُس روز مجھے بہت افسوس ہوا جب میں تمھارے گھر دن بلائے چلی گئی اور تمھارے لاڈلے بچے مجھ سے ڈر گئے۔ بعد ازاں میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ آخر میں تمھارے گھر کیوں گئی۔ اور ہاں، مجھے جب خبر ملی کہ تم اسکول کی میٹنگ میں افرادِ خانہ کے ساتھ شرکت کرنے والے ہو تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں تمھیں دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میرے دل میں فوراً یہ بات آئی کہ مجھے اسکول نہیں جانا چاہیے۔ ویسے بھی تم پہلے کئی دفعہ میری وجہ سے سُبکی محسوس کر چکے ہو۔ یوں بھی میں بستر سے اٹھنا بھی چاہتی تو نہیں اٹھ سکتی تھی۔ اور ہاں آج میں تمھیں یہ بات بھی بتلائے دیتی ہوں جسے میں نے تم سے اب تک چھپائے رکھا کہ بچپن میں تمھارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس کے سبب تمھاری ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ مجھے تمھارے بارے میں اور تمھاری آنکھ کے بارے میں بے حد صدمہ تھا۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں تمھارے لیے آنکھ خرید سکتی۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹروں سے کہہ کر اپنی ایک آنکھ تمھیں دے دی تا کہ جب تم بڑے ہو جاؤ تو تمھیں آنکھ کی کمی محسوس نہ

ہونے پائے۔ تمھارا آپریشن کامیاب ہوگیا اور میری آنکھ تمھارے کام آ گئی تو میں بے حد خوش ہوئی۔ مجھے فخر محسوس ہو رہا تھا کہ چلو میری ایک آنکھ نہیں رہی تو کیا ہوا، میرا بیٹا تو میری آنکھ سے دنیا دیکھنے کے قابل ہو گیا ہے۔''[1]
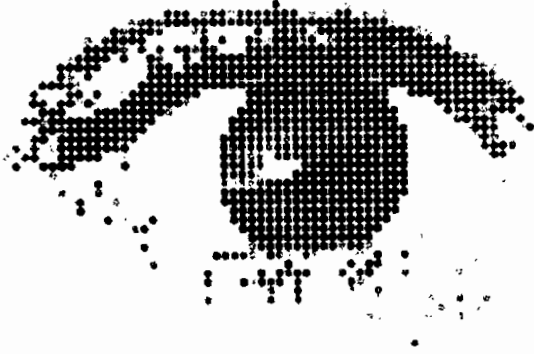
[1] یہ واقعہ انٹرنیٹ پر ''انسائیکلو آف اسٹوریز'' کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ ویب سائٹ یہ ہے:
www.gesah.net

اُن کو رونے کا سبب یاد آیا

ایاس بن معاویہ اپنے وقت کے بڑے مشہور عالم دین تھے، جب ان کی والدہ فوت ہوئیں تو بہت روئے۔ لوگوں کے لیے یہ منظر بڑا تعجب خیز تھا کہ اپنے وقت کا اتنا بڑا عالم اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔

لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ادب سے پوچھا: حضرت! آپ یوں بچوں کی طرح کیوں رو رہے ہیں؟

انھوں نے فرمایا: میرے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوئے تھے، آج ان میں سے ایک بند ہوگیا ہے۔ بس اسی محرومی پر رو رہا ہوں۔

دنیا ہی میں جنت کے مزے

کتاب ''برالوالدین'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عالم دین اپنے دوستوں کی مجلس میں تاخیر سے پہنچے۔

ساتھیوں نے پوچھا کہ آپ لیٹ کیوں آئے ہیں؟

جواب ملا کہ میں ریاض الجنہ کے مزے لوٹ رہا تھا۔

اس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ اپنی والدہ کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

جو میں نے کیا تھا، وہی آیا مرے آگے!

اس دنیا میں محنت ومشقت کا کون سا ایسا عمل ہے جسے میں نے انجام نہ دیا ہو۔ پوری دنیا کو سر پر اٹھائے پھرتا تھا۔ آخر کس کے لیے؟ اپنے بچوں کی راحت اور آرام کے لیے۔ لیکن میری بیوی کے انتقال کے بعد آج اللہ کے سوا میرا کوئی نہیں۔ میں اپنے بچوں کی طرف سے بے رخا پن محسوس کر رہا ہوں۔ میرے سارے بیٹوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ سب کے سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے ملنے نہیں آتا، بلکہ انھوں نے مجھے گھریلو نوکروں کے حوالے کر دیا ہے۔

میرے بچوں کا میرے ساتھ جو رویہ ہے اور انھوں نے جس طرح مجھے فراموش کر دیا ہے، اس بات کا مجھے کوئی افسوس نہیں۔ بلکہ دنیا کا دستور ہے کہ جیسا کرو گے ویسا ہی بھرو گے۔ میں نے جو کچھ اپنے والدین کے ساتھ کیا تھا، آج میں اُسی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ میں آج اُسی گلاس کا پانی پینے پر مجبور ہوں جس گلاس سے میں نے اپنے ماں باپ کو پانی پلایا تھا۔ آج میری عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ ایکسیڈنٹ

ہونے کے سبب میں چلنے پھرنے سے معذور ہو چکا ہوں۔ آج میرے سامنے کوئی کام نہیں ہے، سوائے اِس کے کہ میں کتابِ ماضی کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہوں۔

جب میں گردن موڑ کر اپنی سابقہ زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے وہی گلاس نظر آتا ہے جس سے میں نے اپنے ماں باپ کو پلایا تھا اور پانی بھی وہی ہے جسے میں نے اپنے والدین کے لیے استعمال کیا تھا۔ ہاں، آج میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اپنے والدین کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا۔ میں نے انھیں کبھی اہمیت نہیں دی۔ اُن کی خواہش تھی کہ میں اُن کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ وہ لڑکی انتہائی دین دار اور خدا پرست تھی۔ میرے والدین کو بے حد پسند تھی۔ لیکن میں نے اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی چاہت کے مطابق دوسری لڑکی سے شادی کر لی۔ میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد تنہائی کی زندگی گزارنے لگے۔ اُن کی بہت تمنا تھی کہ میں اُن کے پاس بیٹھوں کچھ اُن کی سنوں، کچھ اپنی سناؤں مگر میں نے اُن کے جذبات کا کبھی احترام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے والد کے پاس سے کہیں دور جا کر رہائش اختیار کر لوں تاکہ ان کی باتیں نہ سن سکوں۔ حالانکہ اُن دنوں میرے والد انتہائی ضعیف اور کمزور ہو چکے تھے۔ اُن کی عمر بھی اُن دنوں اُتنی ہی تھی جتنی آج میری ہے۔ اور واقعی میں انھیں چھوڑ کر دوسرے شہر میں جا بسا۔ تین سال گزر گئے، میں نے اپنے والد سے ملاقات نہیں کی تھی۔ اس دوران میرے قریبی رشتے دار میرے پاس آتے تھے اور مجھے والد کے پاس رہنے کی نصیحت کرتے تھے۔ لیکن میں اُن کی بات یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں سارے کام کاج چھوڑ کر بس اپنے باپ ہی کے پاس بیٹھا رہوں۔

آج میں اپنی سابقہ زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو اولاد کی بے رخی میں مجھے اپنا ہی قصور نظر آتا ہے۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میرے والد نے مجھے اطلاع بھیجی کہ انھیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن میں نے طرح طرح کے بہانے بنا کر ان کی ضرورت پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنے ناروا سلوک کے ساتھ ساتھ میں اس بات کا بھی متمنی تھا کہ کب میرے والد کا انتقال ہو اور میں ان کی جائداد کا اکیلا وارث بنوں۔

آج میرے بچے میری موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا کوئی ملال نہیں ہے۔ میں اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھ رہا ہوں۔ میں نے بس اللہ تعالیٰ ہی سے امید لگا رکھی ہے۔ شاید وہ میری توبہ قبول کر لے۔ اگر میری توبہ قبول ہو جائے تو میرے لیے یہی کافی ہے۔[1]

---

[1] اس واقعے کی تفصیل آپ جریدۂ عکاظ مورخہ 2/2/1412 میں دیکھ سکتے ہیں۔ جریدۂ عکاظ کے حوالے سے اسے کئی ایک مؤلفین نے اپنی اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے۔

مری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے!

اس واقعے کا راوی ایک ماہر نفسیات ہے۔ وہ خدمت خلق کے لیے قائم شدہ ایک ہسپتال میں خدمات انجام دیتا ہے۔ وہ یہ واقعہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میں خدمت خلق کے لیے جس ادارے میں کام کرتا تھا، اُس میں ایک بوڑھا شخص داخل ہوا۔ یہ بوڑھا اکیلا تھا۔ اُس سے ملاقات کے لیے کوئی نہیں آتا تھا۔ صرف ایک آدمی تھا جو کبھی کبھار اُس کے پاس آجاتا تھا۔

بوڑھے کو چلنے پھرنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔ اُس کے جسم کا آدھا حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ فالج کی وجہ سے وہ بستر سے اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں ایک عرصے تک اس کا علاج کرتا رہا۔ میں ہی اُس کی دیکھ بھال کرتا اور جتنا ممکن ہوتا تعاون کرتا۔ بوڑھے مریض کو کچھ عافیت محسوس ہوتی تو اُس کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ جاری ہوتا کہ ''میرے بیٹے کہاں ہیں، وہ مجھے ملنے کیوں نہیں آتے؟''

میں بوڑھے کی حالت زار دیکھ کر اُسے اطمینان دلاتا اور صبر سے کام لینے کی نصیحت کرتا۔ میں اُسے دلاسہ دیتا کہ میں کوشش کر کے تمھارے بیٹوں سے ضرور ملواؤں

گا۔ مگر بوڑھے کے احساسات بتلا رہے تھے کہ وہ بیٹوں کی بے وفائی سے اندر ہی اندر کڑھ رہا ہے۔ بوڑھے کو جب بھی ہوش آتا وہ بیٹوں کے بارے ہی میں پوچھتا کہ آخر وہ اَب تک مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟

جب میں نے دیکھا کہ بوڑھا مریض اپنے بیٹوں سے ملاقات کے لیے پاگل ہوا جا رہا ہے۔ وہ جب تک اپنے بیٹوں کو نہیں دیکھے گا، اُسے صبر نہیں آئے گا، اس لیے میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اُس کے بیٹوں کے پاس جاؤں گا۔ میں نے مختلف لوگوں سے معلوم کیا اور بوڑھے کے بیٹوں کا اتہ پتہ پوچھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس بوڑھے مریض کے ایک دو نہیں بلکہ دس بیٹے تھے اور سب کے سب معقول پیشوں سے منسلک تھے۔ میں نے کسی طرح بوڑھے کے بیٹوں کا پتہ معلوم کیا اور اُن کے پاس جا پہنچا۔ میں نے بیٹوں کے سامنے باپ کی حالتِ زار کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ تمھارا باپ تم لوگوں سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔ جب بھی اسے بیماری سے کچھ عافیت ملتی ہے وہ تم لوگوں ہی کے بارے میں پوچھنے لگتا ہے۔

میری باتیں سننے کے بعد بوڑھے مریض کے بیٹوں کا جو ردعمل سامنے آیا، اُس سے مجھے بڑا دھچکا لگا۔ انھوں نے میری بات کے جواب میں کہا کہ ہمارا باپ تو کب کا انتقال کر چکا ہے۔ پھر یہ بوڑھا مریض کون ہے جو ہمیں اپنا بیٹا بتاتا ہے اور اپنی زیارت کرانا چاہتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ وہی لوگ اس بوڑھے مریض کے بیٹے تھے۔ مگر وہ بدبختی کے آخری کنارے پر پہنچ چکے تھے بدبختی کی انتہا تھی کہ آج وہ اپنے ہی باپ کو پہچاننے سے انکاری تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ تم دس بیٹوں کے ہوتے ہوئے تمھارا باپ ایک خیراتی ادارے میں زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے۔ کیا یہ تمھارے

لیے باعث شرم نہیں؟ مگر میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکا۔ میں اُن کے پاس سے واپس آ گیا۔

اب میری تمام تر توجہ اُس بوڑھے مریض کی طرف تھی۔ وقت پر میں اسے دوائیں کھلاتا، مجھ سے جو خدمت ہو سکتی، انجام دیتا۔ رفتہ رفتہ وقت گزرتا گیا اور بوڑھے کی حالت بگڑتی گئی۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اُس کے مزاج میں چڑ چڑا پن آ گیا۔ دوائیں بھی بہت مشکل سے کھاتا۔ بار بار اپنے بیٹوں ہی کے بارے میں پوچھتا اور کہتا کہ آخر میرے بیٹے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آ رہے؟ اُس کی زبان سے الفاظ بھی صاف نہیں نکل پاتے تھے۔ وہ یہی رٹ لگائے ہوئے تھا: میرے بیٹے کہاں ہیں؟ میرے پاس جتنا مال و دولت ہے وہ سب کا سب میرے بچوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میرے بچوں نے مجھے چھوڑ دیا تو کیا ہوا مگر میں انھیں ایسے نہیں چھوڑوں گا۔ میری تمام جائیداد کے مستحق صرف میرے بیٹے ہیں۔

ایک روز میں نے ارادہ کیا کہ میں کسی عالم دین کے پاس پہنچ کر اُسے بوڑھے مریض کے بیٹوں کے پاس بھیجوں کہ وہ انھیں سمجھائے بجھائے، انھیں حقوقِ والدین کا ثواب بتلائے اور والد کی خدمت پر آمادہ کرے تاکہ انھیں اپنی بے حسی اور سنگ دلی پر کچھ شرمندگی محسوس ہو۔ وہ اپنے والد کی خدمت میں دلچسپی لیں، چنانچہ میں کویت کے ایک بزرگ عالم دین کے پاس گیا۔ وہ عرب ممالک کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ جب میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچا تو ان کے گھر والوں نے بتایا کہ وہ کئی دنوں سے بیمار ہیں۔ جب ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی تو انھیں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ میں نے فوراً گاڑی کا رخ اپنے ادارے کی طرف موڑ دیا۔ میرے دل میں بار بار ایک

ہی خیال آرہا تھا کہ اگر وہ عالم دین میری بات مان کر بوڑھے مریض کے بیٹوں کے پاس جا کر سمجھائیں گے تو وہ ضرور ان کی باتوں پر دھیان دیں گے اور اپنے باپ سے ملنے آجائیں گے۔ میں نے اپنے ادارے میں پہنچ کر بوڑھے مریض کو دیکھنا چاہا کہ اس کی حالت کیسی ہے۔

جب میں بوڑھے مریض کے بیڈ روم میں پہنچا تو وہ چادر اوڑھ کر سویا ہوا تھا۔ میں نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن مجھے اصل حقیقت اُس وقت معلوم ہوئی جب میں نے اُس کے بارے میں اپنے ایک اسٹاف ممبر سے پوچھا۔ اُس نے مجھے بتلایا کہ مریض سویا ہوا نہیں ہے، بلکہ وہ انتقال کر چکا ہے۔ وفات کے بعد میں نے اُس کے اوپر چادر ڈال دی ہے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ مریض اپنے بچوں کے بارے میں بڑے حسرت آمیز کلمات کہہ رہا تھا۔ اس کی روح نکل رہی تھی مگر اُس وقت بھی اس کی نگاہیں اپنے بیٹوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

قارئین کرام! ابھی یہ قصہ تمام نہیں ہوا۔ اصل عبرتناک قصہ اور قابل افسوس بات تو آگے آ رہی ہے۔ بوڑھے کی وفات کے بعد میں نے کفن دفن کی کارروائیوں سے پہلے دستور کے مطابق اس کے بیٹوں سے فون پر رابطہ کیا اور انھیں اُن کے والد کی وفات کی اطلاع دی۔ کیونکہ اپنے والد کے کفن دفن کا اہتمام کرنے کے وہی زیادہ مستحق تھے۔ لیکن اُن بیٹوں کی بدبختی دیکھیے کہ وہ اپنے والد کی آخری رسوم کی ادائیگی کے لیے بھی آنے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے ایک بیٹے کے گھر فون کیا تو اُدھر سے اُس کی بیوی کی آواز آئی: میرے شوہر گھر پر موجود نہیں ہیں اور ہاں، اب دوبارہ ٹیلی فون کرنے کی زحمت مت کرنا۔

قصہ مختصر یہ کہ ان دس بیٹوں میں سے کسی نے بھی ہمارے ادارے کا رخ نہیں کیا۔ اب ہم اسٹاف والوں نے مل کر ہی میت کو نہلایا دھلایا اور اُسے جنازے کے لیے تیار کیا، پھر مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے اس کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ باپ کے انتقال کو ابھی کچھ ہی ہفتے گزرے تھے کہ اس کے چند بیٹے ادارۂ خدمتِ انسانیت کے آفس میں دندناتے ہوئے آئے اور اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے سامان کا تقاضا کرنے لگے۔ جانتے ہو وہ کیا سامان تھا؟ وہ اس کے ذاتی استعمال کا سامان تھا۔

یہ ایک سچا واقعہ ہے جو میرے سامنے پیش آیا۔ اور میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ان بیٹوں کو ان کی سنگدلی پر سزا نہیں ملے گی؟ ملے گی اور ضرور ملے گی۔ اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اُس کی لاٹھی بے آواز ہے۔[1]

---

[1] یہ واقعہ ہم نے انٹرنیٹ سے نوٹ کیا ہے۔ آپ بھی انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.gesah.net پر یہ واقعہ آن لائن مطالعہ کر سکتے ہیں۔

جنت میں موسیٰ علیہ السلام کی رفاقت کا راز

انبیائے کرام کی سیرت پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک واقعہ کا کثرت سے ذکر آتا ہے۔ ایک دفعہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا:

«يَا رَبِّ! دُلَّنِي عَلٰى رَجُلٍ هُوَ رَفِيقِي فِي الْجَنَّةِ»

''اے میرے پروردگار! مجھے اُس آدمی کے بارے میں بتا، جو جنت میں میرا رفیق ہوگا۔''

موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: تمھاری خواہش ہے کہ اِس دنیا ہی میں اپنے جنتی ساتھی کو دیکھ لو، تو فلاں لکڑہارے کے پاس جاؤ۔ وہی جنت میں تمھارا رفیق ہوگا، چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اُس لکڑہارے کے پاس گئے، جس کی اللہ تعالیٰ نے نشاندہی کی تھی۔ اُس کے دروازے پر پہنچے۔ اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ لکڑہارے نے انھیں اندر آنے کی اجازت دی۔ جب موسیٰ علیہ السلام گھر کے اندر داخل ہوئے تو لکڑہارے نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ ابھی حال احوال پوچھنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ لکڑہارے نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''حضور! برائے مہربانی آپ چند لمحے انتظار فرمائیں، میں ابھی آتا ہوں۔''

اتنا کہنے کے بعد لکڑہارا ایک کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں ایک بہت بوڑھا شخص لیٹا ہوا تھا۔ حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ لکڑہارے نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا اور اُس کی صفائی کرنے لگا۔ جب اُس کی صفائی سے فارغ ہو چکا تو اُسے کھلایا پلایا اور آرام سے لٹا دیا۔ جب لکڑہارا بوڑھے شخص کو لٹا کر واپس آنے لگا تو بوڑھے نے آہستہ سے اپنا ہونٹ ہلایا۔ اُس کی بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ بعد ازاں لکڑہارا سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ گیا۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اُس لکڑہارے کی ساری حرکات وسکنات ملاحظہ فرما رہے تھے۔ انھوں نے لکڑہارے سے دریافت فرمایا کہ وہ بوڑھا شخص کون ہے؟ لکڑہارے نے جواب دیا کہ وہ میرے والد ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے ایک سوال کے جواب میں لکڑہارے نے یہ بھی بتلایا کہ وہ اپنے بوڑھے والد کی کئی سال سے خدمت کر رہا ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے لکڑہارے سے دریافت فرمایا: اچھا یہ بتلاؤ کہ تمھارے والد نے جب اپنا ہونٹ ہلایا تو اُس نے کیا کہا؟ لکڑہارے نے جواب دیا کہ میرے والد نے میرے لیے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! قیامت کے دن میرے بیٹے کو اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کا رفیق بنا۔

اُس وقت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے لکڑہارے کی اہمیت اور عظمت کا راز سمجھ میں آیا۔

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیں کتاب سعادة الدارين في بر الوالدين، ص: 50.

ماں باپ کی خدمت سے تقدیر بدل گئی

یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اس کا راوی بھی علمی اور عوامی طبقے میں معروف ہے۔ میری مراد ڈاکٹر محمد بن سعد الشویعر حفظہ اللہ سے ہے۔ وہ سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کے مشیر خاص تھے۔ وہ موجودہ مفتی مملکت سعودی عرب کے بھی مشیر خاص ہیں۔

عبدالعزیز نامی یہ شخص ایک ایسے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ گھریلو حالات بالکل سازگار نہ تھے۔ عبدالعزیز کے والدین بوڑھے ہو چکے تھے۔ اُن کی دیکھ بھال عبدالعزیز ہی کے ذمے تھی۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتا کہ محنت مزدوری کر کے اپنے ماں باپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے۔ مگر چونکہ وہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔اس بستی میں کام کاج کے مواقع بہت کم تھے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنی آمدنی میں اضافہ نہ کر سکا۔

عبدالعزیز اپنے والدین کا نہایت فرماں بردار تھا۔ ہر کام ان سے پوچھ کر کرتا۔ اس کے باوجود کہ والدین بوڑھے ہو چکے تھے اور مزاج میں قدرے سختی آرہی تھی وہ ان کی

خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتا۔ ایک دن اس نے اپنے والدین سے کہا کہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میرے بدن میں خون کی آخری بوند بھی باقی ہے، میں آپ دونوں کی خدمت کرتا رہوں گا۔ بس یہی میری زندگی کا محبوب ترین مقصد ہے۔

عبدالعزیز سچ مچ اپنے والدین کے حق میں بڑا خدمت گزار واقع ہوا تھا۔ اُس کی بستی کے لوگ اسے ''والدین کا مطیع وفرماں بردار'' کا لقب دے چکے تھے۔ لوگوں کی نگاہوں میں اُس کی محبت اور عزت کا سبب صرف اس کا والدین ۔ ساتھ حسن سلوک تھا۔ عبدالعزیز نے جب دیکھا کہ گاؤں کی کمائی سے گھریلو اخراجات پورے نہیں کیے جا سکتے اور بیوی بچوں کے ساتھ والدین کی خاطر خواہ خدمت نہیں کی جا سکتی تو اس نے نجد کے ایک شہر کا رخ کرنے کا ارادہ کر لیا، تاکہ وہاں پہنچ کر کوئی ہنر سیکھ لے۔

اس نے تجارت کا سوچا مگر اس کے لیے مال چاہیے تھا۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر شہر میں فروخت کرنی چاہئیں۔ اس میں خاصا منافع ہو سکتا ہے۔ پہلے ہی دن عبدالعزیز کو دس روپے کی آمدنی ہوئی۔ اُن دنوں سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں ایسی کرنسی استعمال ہوتی تھی جو ہندوستانی کرنسی کی طرح ہوا کرتی تھی۔ عبدالعزیز نے اپنے دھندے سے پہلے اُس حدیث رسول ﷺ کو بھی پیش نظر رکھا کہ آپ ﷺ نے سوال کرنے والے ایک شخص کو کلہاڑی دے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر بازار میں بیچنے کی ہدایت فرمائی تھی[1] اس واقعہ سے اسلام کا یہ موقف عیاں تھا کہ معمولی کام کر کے پیٹ بھرنا بھیک مانگنے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔

عبدالعزیز نے کچھ دن تو لکڑیوں کا کاروبار کیا، پھر اس نے ایک تعمیراتی کمپنی میں

---

[1] سنن أبي داود، الزكاة، حديث:1641 .

کام کرنا شروع کردیا۔ اس کا مالک بڑا سلجھا ہوا دیندار آدمی تھا۔ اس نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ عبدالعزیز کو کوئی کام کرنے سے عار نہ تھا۔ وہ کنویں سے پانی نکالتا، کھجور کے باغات کو سیراب کرتا محنت مزدوری کرتا اور حق حلال کی روزی کماتا تھا۔ اس کی اولین ترجیح اس کے بوڑھے والدین تھے، ان کو خوش کرنا اور بروقت ان کو روٹی مہیا کرنا ہی اس کا سب سے اہم مقصد تھا۔

رزق کی تلاش میں عبدالعزیز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا۔ وہ جس کے گھر میں بھی کام کرتا، اس گھر کا مالک اس کی محنت اور لگن دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ اگر اسے دوبارہ کسی مزدور کی ضرورت پڑتی تو وہ عبدالعزیز ہی کو کام کے لیے ڈھونڈتا۔ اس طرح شہر کے لوگوں میں عبدالعزیز کے متعلق بڑا اچھا تاثر قائم ہوگیا۔ محنت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ حددرجہ غیور بھی تھا اس نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس دوران کئی لوگوں نے اسے زکاۃ کا مال دینا چاہا مگر اس نے یہ کہہ کر زکاۃ کا مال لینے سے انکار کردیا کہ میں کمانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ میں ایک نوجوان آدمی ہوں، میرے لیے زکاۃ لینا ہرگز جائز نہیں۔

عبدالعزیز کے ماں باپ گاؤں ہی میں رہتے تھے۔ اس کے والد مسلسل بیماری کے سبب کافی کمزور ہو چکے تھے، البتہ اُس کی والدہ قدرے صحت مند تھی، اس لیے وہ بھی سوت کات کر کچھ روپے کما لیا کرتی تھیں۔ لیکن یہ آمدنی اُن کے اخراجات کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ عبدالعزیز کا والد اپنے بیٹے کے لیے ہمیشہ دعائیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ عبدالعزیز کے رزق میں برکت دے اور اس کے لیے کامیابی کے راستے کھول دے۔

ایک مرتبہ عبدالعزیز شہر سے گھر آیا ہوا تھا۔ اُس کے والد نے بیٹے کے سامنے یہ

تجویز رکھی کہ ہم بوڑھے والدین کو بھی شہر لے چلو، ممکن ہے وہاں پہنچ کر ہمیں کچھ راحت ملے۔ لیکن والد کی بات کا عبدالعزیز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان سے دعا کے لیے کہا اور شہر چلا گیا۔

شہر میں ایک تاجر تھا جو انتہائی شریف النفس اور باوقار شخصیت کا مالک تھا۔ عبدالعزیز کا اس کے ساتھ جب سے تعارف ہوا تھا، نہ جانے کیوں اس کا دل عبدالعزیز کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ چونکہ تاجر عبدالعزیز سے کئی دفعہ اپنے گھر اور دفتر کا کام کرا چکا تھا۔ اس کی امانت داری اور دیانت داری کا ذاتی طور پر مشاہدہ کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ اِس دفعہ جب عبدالعزیز گاؤں سے شہر پہنچا تو تاجر نے اُس کا پرتپاک استقبال کیا اور اُسے اپنے پاس ہی کام کرنے کے لیے رکھ لیا۔ تاجر کے پاس کئی ایک بڑے بڑے اسٹور تھے، دکانیں تھیں، دُور دُور تک اس کی تجارت پھیلی ہوئی تھی، اُسے عبدالعزیز کی طرح ایک امانت دار ساتھی کی شدید ضرورت تھی۔ آہستہ آہستہ عبدالعزیز تاجر کے دل میں جگہ بناتا گیا اور ایک دن تاجر کو اُس پر مکمل اعتماد ہوگیا۔ اُس نے عبدالعزیز کو اپنے کاروبار اور تجارت کے حوالے سے وہ اسرار و رموز بھی بتلائے جو کسی اور کو نہیں بتلا سکتا تھا۔

ایک دن تاجر نے عبدالعزیز سے اُس کے ذاتی حالات پوچھے۔ اس نے اپنے والدین کا تذکرہ کیا تو تاجر نے اسے کہا کہ والدین کو شہر بلوالو۔ اس نے کہا کہ شہر کے اخراجات دیہات سے بہت زیادہ ہوتے ہیں، یہاں رہائش کا مسئلہ ہوگا۔ جو میرے بس میں نہیں ہیں۔ تاجر نے اسے اپنے گھر کے ایک حصے میں رہنے کی پیشکش کر دی کہ میں نے اس کا ایک حصہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لیے وقف کر رکھا ہے، لہٰذا

وہ تم لوگوں کے لیے کافی ہو جائے گا۔ میری طرف سے تم جب تک چاہو اس میں رہ سکتے ہو۔ جب تمھارے پاس گنجائش ہو جائے گی تو جہاں جی چاہے منتقل ہو جانا۔ جہاں تک شہری اخراجات کی بات ہے تو اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں تمھاری مدد کرے گا اور ہاں، تمھارے اخراجات کا ایک حصہ میں خود برداشت کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ عبدالعزیز نے اللہ تعالیٰ کا اور پھر تاجر کا شکریہ ادا کیا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے والدین اور بیوی بچوں کو گاؤں سے شہر لا چکا تھا۔

تاجر کا معمول تھا کہ وہ اپنے کاروبار اور تجارت کی غرض سے بارہا دوسرے شہروں اور ملکوں کا سفر کرتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں علم کی اہمیت کو بہت کم لوگ سمجھتے تھے۔ مگر تاجر نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ بندوبست کیا ہوا تھا۔ اس نے عبدالعزیز کو بھی کہا کہ وہ اپنے بچوں کو سکول میں داخل کرائے، چنانچہ اس نے والدین سے اجازت طلب کی اور ان کی رضامندی سے بچوں کو سکول میں داخل کرا دیا۔ تعلیمی اخراجات کا ایک حصہ تاجر نے برداشت کر لیا۔

تاجر کے بیٹے نے قرآن کریم حفظ کر لیا اور کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تو اسے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اُس نے بیٹے کے استاد کو بلایا۔ اس خوشی کے موقعے پر ایک محفل کا انعقاد کیا اور طلبہ میں تحائف تقسیم کیے۔ یہ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کی فتح، یعنی سن 1319 ہجری کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد تاجر اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسرے شہر بھیجنا چاہتا تھا مگر بیٹے کو باہر بھیجنے میں اس کے سامنے کئی مسائل درپیش تھے۔ چونکہ اس کا اکلوتا بیٹا ہی اس کی پوری جائیداد کا وارث اور اس کی امیدوں کا مرکز تھا، اس لیے وہ اپنے بیٹے کو اکیلا بھیجنے سے کترا رہا تھا۔

تاجر کی بیوی بڑی ذہین وفطین خاتون تھی۔ اس نے شوہر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ بیٹے کے ساتھ آپ عبدالعزیز ہی کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔ تاجر نے بیوی کی تجویز مان کر عبدالعزیز کے سامنے اپنی بات رکھ دی۔ عبدالعزیز نے تاجر سے کہا کہ میرے والدین بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میں ہی اکیلا ہوں جو ان کی خدمت کرتا ہوں، لہٰذا ایسی صورت میں مجھے اپنے والدین سے اجازت لینی پڑے گی۔ تاجر نے کہا کہ تمھاری بات بالکل درست ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو میں بھی تمھارے والد کے پاس چلتا ہوں۔ کچھ لمحے بعد تاجر، عبدالعزیز کے والد کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

تاجر نے عبدالعزیز کے والد کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا اور یہ بھی کہا کہ عبدالعزیز کی عدم موجودگی میں میری اہلیہ اور مَیں آپ اور دیگر اہل خانہ کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ عبدالعزیز کا والد تاجر کے احسانات دیکھ چکا تھا۔ بھلا وہ تاجر کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔

اب تاجر کا بیٹا اور عبدالعزیز دونوں مطلوبہ شہر میں پہنچ چکے تھے۔ وہاں تاجر کا بیٹا تعلیم حاصل کر رہا تھا اور عبدالعزیز، تاجر کے کاروبار کے ساتھ ساتھ بیٹے کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔ بیٹا جب پڑھ لکھ کر فارغ ہو گیا تو دونوں شہر واپس آ گئے۔ تاجر نے اب اپنی تجوری کی چابی بیٹے کے حوالے کی اور اپنے کاروبار میں شرکا کو شامل کر کے ایک کمپنی بنا ڈالی۔ اس کمپنی میں ایک حصہ عبدالعزیز کے لیے بھی رکھا۔ عبدالعزیز، تاجر کے بیٹے کے ساتھ کمپنی کے پارٹنر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ ایک دن آیا کہ وہی عبدالعزیز جو ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے شہر پہنچا تھا اور بہت مشکل سے پیسہ کماتا تھا، آج اللہ کے فضل وکرم، اپنی امانت داری ودیانت داری اور اپنے والد کے ساتھ

حُسنِ سلوک کی برکت سے ایک کمپنی میں بحیثیت پارٹنر کام کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے کاروبار میں اتنی ترقی دی کہ وہ بعد میں ایک نامی گرامی تاجر بن گیا۔ اُس کی تجارت دُور دُور تک پھیل گئی۔ یہ سب اللہ کے فضل وکرم کے بعد والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی وجہ سے ہوا۔ [1]

[1] دیکھیے: المجلة العربية، ریاض۔ بحوالہ کتاب: نافذة تاريخية على الماضي... 22-235/1

باپ کی عزت کرو

ایک مرتبہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ایک دیوار کے سائے میں اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے ایک صحابی کے ہمراہ سواری پر گزرے۔ عبداللہ بن ابی نے دیکھا تو حسد کے مارے رہ نہ سکا۔ پکار کر کہنے لگا:

«قَدْغَبَّرَ عَلَيْنَا ابْنُ أَبِي كَبْشَةَ»

یعنی اللہ کے رسول ﷺ کے اجداد میں سے ایک کا نام لے کر کہنے لگا کہ ابن ابی کبشہ نے ہمیں غبار آلود کر دیا۔ دراصل غبار اڑنے والی کوئی بات نہ تھی مگر یہ اس کا تکبر تھا، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ حسد تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کو اس کے ان الفاظ پر غصہ آیا۔

ادھر عبداللہ بن ابی کے سچے مسلمان بیٹے عبداللہ کو اس واقعہ کا علم ہوا کہ میرا باپ آپ ﷺ کے ساتھ گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایمان اس کو کہتے ہیں کہ اُدھر باپ ہے اور اِدھر کائنات کے امام ہیں۔ مگر یہ امام کائنات ﷺ کے آگے اپنے منافق باپ کو ہیچ اور ناقابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے باپ نے آپ کی شان

میں ہرزہ سرائی کی ہے۔

«وَالَّذِي أَكْرَمَكَ وَأَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ لَئِنْ شِئْتَ لَآتِيَنَّكَ بِرَأْسِهِ»

''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو عزت وتوقیر سے نوازا،اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔اگر آپ چاہیں تو میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں۔''

ارشاد ہوا:

«لَا وَلَكِنْ بِرَّ أَبَاكَ وَأَحْسِنْ صُحْبَتَهُ»

''نہیں! اپنے باپ کی عزت کرو اور اس کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آؤ۔''[1]

[1] صحیح ابن حبان: 170/2، حدیث 428

دو دِلوں کو جوڑنے والی دلہن

ابھی وہ اس دنیا میں نہیں آیا تھا کہ اُس کا والد شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلا گیا۔ شاید اس کے والدین میں کسی بات پر اختلاف کا زہر پھیل گیا تھا۔ اُس کا والد اُس کی ماں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُس نے اِس جہانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں تو وہ ایک یتیم کی طرح تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ ماں اکیلی تھی۔ اُس کے پاس رہنے کے لیے ایک گھر تھا اور معاش کی ذمے داری بھی ماں ہی کے نازک کندھوں پر تھی۔

ماں نے اُس کی پرورش و پرداخت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جہاں تک ممکن ہو سکا، اُسے پالا پوسا اور جوان کیا۔ مگر بچپن سے جوانی تک اُسے اپنے باپ کا چہرہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ اُسے اتنا تو معلوم تھا کہ اُس کا باپ زندہ ہے مگر اس بات کا اسے شدید صدمہ بھی تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اُس کا باپ اُسے دیکھنے نہیں آتا۔ میری ماں کے ساتھ اُس کے اختلافات ہوں تو ہوں، میں تو اس کا بیٹا ہوں، پھر وہ مجھے کیوں نظرانداز کررہا ہے؟ اس قسم کی باتیں اُس کے ذہن میں آتیں، اس کے دماغ میں

ایک کوندا سا لپکتا اور پھر وہ تصورات کی دنیا میں کھو جاتا۔

وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ اِس دوران اُسے صرف دو تین دفعہ ہی اپنے والد کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مگر باپ بیٹے کی قربت کی جو چاشنی ہوا کرتی ہے۔ باپ بیٹے کے مابین جو قلبی لگاؤ اور محبت ہوا کرتی ہے، اس سے دونوں ہی محروم تھے۔ اتفاق سے ایک دن اُس کے لیے ایک لڑکی سے شادی کا رشتہ آیا۔ اُس کی ماں نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ وہ لڑکی بیٹے کو بھی پسند آ گئی۔ لڑکی سلجھی ہوئی تھی۔ خوبصورت تھی۔ سنجیدہ تھی۔ دیندار تھی۔ اُس کا خاندان بھی نیک نام تھا۔ اُس کے ماں باپ بھی اچھے اخلاق و کردار کے مالک تھے، چنانچہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق یہ شادی آناً فاناً ہوئی اور لڑکی اُس کے گھر میں جلوہ افروز ہوگئی۔

یہ لڑکی حُسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت کی بھی مالک تھی۔ ویسے تو اُسے رشتے سے پہلے ہی اپنے شوہر کے خاندان کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ لیکن جب وہ اس گھر میں بہو کی حیثیت سے داخل ہوئی تو جیسے جیسے دن گزرتے گئے اُس کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے شوہر اور سسر میں بڑے عرصے سے جدائی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ بہو جب گھر میں قدم رکھتی ہے تو اسے سب سے زیادہ اپنے اور اپنے شوہر کے مفاد کی فکر ہوتی ہے۔ ساس اور سسر کے ناگفتہ بہ حالات کو سدھارنا یا انھیں اپنے ساتھ شریک رکھنا یا اس سے متعلقہ معاملات سے بہوؤں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بہو اُن بہوؤں سے مختلف تھی۔ اس کا مزاج دینی تھا۔ یہ ہر حال میں گھر کا ماحول خوشگوار دیکھنے کی آرزومند تھی۔ اس کا بیان ہے:

جب میری شادی ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے شوہر اور اس کے والد کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا شوہر اپنے والد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور باپ کا نام آتے ہی بھڑک اٹھتا ہے۔ میں نے تدبیر سوچی اور باپ بیٹے کے درمیان الفت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں میرے عمل کا پہلا قدم یہ تھا کہ میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ اسلام میں صلہ رحمی کے کیا معنی ہیں؟ جب میں نے اس سلسلے میں شوہر کا جواب سُنا اور اس کے تیور دیکھے تو معلوم ہوا کہ میرا شوہر صلہ رحمی کے معنوں سے بھی آگاہ نہیں ہے۔ خصوصاً والد کے احترام سے وہ بالکل بے خبر تھا۔

ہمارے گھر کا ماحول یہ تھا کہ میرے شوہر کا مزاج الگ تھا۔ اور ساس باہمی اختلافات کے سبب اپنے شوہر کو بھول چکی تھیں۔ میں سوچنے لگی کہ یہ قطع رحمی نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر ہم کب تک صلہ رحمی جیسے ضروری دینی حکم کو فراموش کیے رہیں گے؟ جب ہمارا معاملہ ایسا ہے تو پھر اپنی اولاد سے ہم کیوں کر اُمید رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ صلہ رحمی کرے گی اور ہمارے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آئے گی؟ چنانچہ میں اپنے شوہر کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش میں لگ گئی کہ وہ کسی طرح اپنے والد سے ملاقات کے لیے ہامی بھرے۔ یہ واضح رہے کہ میں اپنے شوہر کو طنزیہ انداز میں نہیں، بلکہ بڑے اچھے انداز میں پیار کے ساتھ سمجھاتی تھی۔ اس موضوع کو میں نے اپنے اور اپنے شوہر کے لیے انتہائی اہم بنا دیا۔ میں بات بات میں اُسے سمجھاتی اور جنت کا شوق دِلاتی کہ ماں باپ کے پیروں تلے جنت ہے اور ماں باپ کے ساتھ قطع رحمی کرنے والا اللہ تعالیٰ کے مردود بندوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ قطع رحمی کرنے والوں کو جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اولاد

پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسٰنًا ﴾

''اور تیرے پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ صرف اور صرف اُسی کی عبادت کرو اور یہ کہ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔''[1]

لیکن ہر دفعہ میری باتیں سننے کے بعد میرے شوہر کا یہی جواب ہوتا کہ کیا تم اُس باپ کی بات کر رہی ہو جس نے بچپن ہی میں مجھے لا وارث لاش کی طرح چھوڑ دیا تھا، مجھے دیکھنے تک نہیں آتا تھا۔ جس نے مجھے یتیم کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ میں بچپن سے جوانی تک محرومی کا شکار رہا۔ بھلا میں اَب اُس کے ساتھ حُسنِ سلوک کروں جس کی طرف سے مجھے آج تک کوئی خوشی نہیں پہنچی۔ میں آج تک نہیں سمجھ پایا کہ باپ کیا ہوتا ہے اور باپ کی محبت کس بلا کا نام ہے؟

میں بار بار اپنے شوہر سے یہی کہتی کہ چلو تمھارے باپ نے تمھارا حق ضائع کر دیا لیکن اب تم تو عقلمندی سے کام لو۔ اپنے والد کے حقوق کو ضائع نہ کرو۔ یہ سچ ہے کہ تمھارے والد نے تمھارے بارے میں اپنا فرض ادا نہیں کیا لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم بھی اُس کے حقوق سے سبکدوش ہو۔ تمھارے والد کا تم پر جو حق ہے وہ آج بھی اُسی طرح برقرار ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ کیا تم نے رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نہیں سنا:

«لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ»

---

[1] بني إسرآءيل 23:17.

”کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ بات چیت چھوڑ دے، دونوں جب ملیں تو ایک دوسرے سے منہ موڑ لیں اور ان دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔“[1]

تم مجھے جواب دو کہ اگر میرے پیٹ میں پلنے والے بچے کا سلوک بھی ہم دونوں میاں بیوی کے ساتھ ویسا ہی ہوگا جیسا سلوک تم اپنے والد کے ساتھ کر رہے ہو، تو تمھیں کیسا محسوس ہوگا؟ کیا بیتے گی اُس روز تمھارے دل پر؟ کبھی تم نے اِس حوالے سے بھی سوچا ہے؟...... کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ تم اپنے بچے کے لیے بہترین نمونہ بنو؟ اللہ کا شکر کہ میرا شوہر اب میری باتیں شوق سے سننے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کا دل اپنے باپ کے لیے نرم پڑنے لگا ہے اور وہ میری باتوں پر دھیان دینے لگا ہے، میں نے یہ موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اُسے والدین کے حقوق کے حوالے سے بہت ساری باتیں بتلائیں۔ اس کا پسیجتا ہوا دل دیکھ کر مَیں نے والد سے ملاقات کی تجویز رکھ دی۔ اب کیا تھا، اس کا دل تو نرم پڑ ہی گیا تھا، اس نے میری تجویز قبول کر لی اور والد سے ملاقات کے لیے راضی ہو گیا۔ اللہ عزوجل نے سچ فرمایا:

﴿ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

”مجھے پکارو میں تمھاری پکار کا جواب دیتا ہوں۔“[2]

میری دعا رنگ لائی۔ ہم دونوں میاں بیوی والد سے ملاقات کی غرض سے ان کے شہر پہنچ چکے تھے۔ میرے شوہر نے آگے بڑھ کر اپنے والد کے سر کا بوسہ لیا۔ یہ اُس کی

---

[1] الأدب المفرد للبخاري، حدیث: 406، شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[2] المؤمن 60:40۔

زندگی کا پہلا بوسہ تھا۔ میں یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ باپ بیٹے کی پہلی ملاقات کا یہ منظر دیکھنے والا تھا۔ بیٹے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور باپ کا برسوں کی محبت کا خوابیدہ جذبہ بھی اُمڈ پڑا تھا، اُس نے بیٹے کو یوں سینے سے لگالیا جیسے وہ کئی برسوں کی محبت کی قیمت یکمشت ادا کر رہا ہو۔

اس کے بعد باپ بیٹے میں اس قدر محبت ہوگئی کہ لگتا ہی نہ تھا کہ پہلے کبھی اُن میں کوئی رنجش تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی محبتیں نچھاور کرنے لگے۔ ایک دوسرے سے ملاقات ان کے معمولات میں داخل ہوگئی۔ گاہے بگاہے اُن کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ میرا شوہر بھی اپنے والد کا مطیع و فرماں بردار بن گیا۔ میرے سسر نے بھی حقوقِ اولاد کے جملہ واجبات کو مکمل کر دکھایا۔

میں سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم کے بعد میں ہی وہ گنہگار بیوی ہوں جس کی بدولت دو دل آپس میں مل گئے۔[1]

کاش! اسلامی معاشرے میں ہماری بہو بیٹیاں اسی طرح مثالی کردار ادا کریں، جیسا کہ مذکورہ بہو نے کیا، تاکہ ہمارا معاشرہ پیار محبت اور باہمی تعاون کا گہوارہ بن جائے۔

[1] اس واقعے کے لیے دیکھیے کتاب: قصص مؤثرة فی بر وعقوق الوالدین، ص: 21,20.

معزز قارئین کرام! میں جن دنوں والدین کے حقوق کے سلسلے میں یہ کتاب ترتیب دے رہا تھا، کئی ساتھیوں سے کہہ رکھا تھا کہ اگر آپ کے پاس والدین کے حوالے سے کوئی انوکھا واقعہ یا مضمون ہو تو ارسال کریں یا مجھے بتلائیں۔ اگر مفید ہوا تو اُسے کتاب میں شامل کر لیا جائے گا۔
یہ واقعہ برادرم رضوان اللہ ریاضی صاحب کو کسی صاحب نے ای میل کے ذریعے بھیجا تھا۔ انھوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دیا تو میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔ ان کے اور اس مضمون نگار کے شکریہ کے ساتھ میں اسے شامل کتاب کر رہا ہوں۔

میری ماں ہمیشہ سچ نہیں بولتی

زندگی میں آٹھ بار میری ماں نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ لیجیے۔ ماں کی دروغ گوئیوں کی گنتی پیش خدمت ہے:

پہلا جھوٹ

یہ کہانی میری پیدائش سے شروع ہوتی ہے۔ میں بہت ہی غریب گھرانے کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ہوش سنبھالا تو ہمارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ کبھی کھانے کو کچھ مل جاتا تو ماں اپنے حصے کا کھانا بھی مجھے دے دیتی اور کہتی کہ "تم کھالو مجھے بھوک نہیں ہے۔" یہ میری ماں کا پہلا جھوٹ تھا جو میری ماں نے مجھ سے بولا۔

دوسرا جھوٹ

جب میں ذرا بڑا ہوا تو ماں گھر کا کام ختم کر کے قریبی جھیل پر مچھلیاں پکڑنے جاتی۔ ایک دن اللہ کے فضل سے اُس نے دو مچھلیاں پکڑ لیں۔ گھر آ کر یہی مچھلیاں جلدی جلدی پکائیں اور میرے سامنے رکھ دیں۔ میں کھا کر جو کانٹا پھینکتا ماں اسے اٹھالیتی اور کانٹے پر جو بھورے لگے ہوتے انھیں کھانے لگتی۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے دوسری مچھلی ماں کے سامنے رکھ دی اور عرض کیا کہ یہ مچھلی آپ کھائیں۔ اس نے یہ کہہ کر مچھلی واپس کر دی کہ بیٹا! تم کھالو، مجھے مچھلی پسند نہیں۔ یہ میری ماں کا دوسرا جھوٹ تھا جو اس نے مجھ سے بولا۔

تیسرا جھوٹ

جب میں اسکول جانے لگا تو ماں نے ایک گارمنٹس فیکٹری میں ملازمت کر لی اور گھر گھر جا کر کپڑے بیچنے لگی۔ سردی کی ایک شام تھی، بارش بھی زوروں پر تھی، میں بے قراری سے گھر پر ماں کا انتظار کر رہا تھا، کیونکہ وہ اَب تک نہیں آئی تھی۔ میں اُسے

ڈھونڈنے نکلا۔ آس پاس کی گلیوں میں نظر دوڑاتا رہا۔ اچانک دیکھا کہ وہ ایک گھر کے دروازے پر کھڑی کپڑے بیچ رہی تھی، میں نے کہا: ماں! اب بس بھی کرو، تھک گئی ہوگی۔ سردی بھی بہت ہے، وقت بھی بہت ہو گیا ہے، باقی کام کل کر لینا یہ سُن کر ماں نے مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور بولی: بیٹا میں بالکل نہیں تھکی، یہ میری ماں کا تیسرا جھوٹ تھا۔

چوتھا جھوٹ

میرا آخری پرچہ تھا، ماں نے ضد کی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گی، میں امتحانی ہال میں امتحان دے رہا تھا اور وہ باہر کڑی دھوپ میں کھڑی میری کامیابی کے لیے دعا کر رہی تھی۔ میں باہر آیا۔ اس نے لپک کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مجھے پینے کے لیے گنے کا ٹھنڈا رس دیا جو اس نے میرے لیے خریدا تھا۔ میں نے رس کا ایک گھونٹ بھرا اور ماں کے پسینے سے شرابور چہرے کی طرف دیکھا۔ میں نے رس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو وہ بولی: نہیں بیٹا! تم پیو، مجھے پیاس نہیں ہے۔ یہ میری ماں کا چوتھا جھوٹ تھا۔

پانچواں جھوٹ

میرے ابا جان جوانی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ میری ماں اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔ اُسے اکیلے ہی زندگی کا بوجھ ڈھونا پڑا۔ مشکلات بڑھ گئیں، گزر بسر نہایت مشکل ہوگئی۔ بے سہارا ماں تن تنہا گھر کا خرچ کس طرح چلاتی؟ نوبت فاقوں تک آگئی۔ میرا چچا ایک رحمدل انسان تھا، وہ ہمارے لیے کبھی کبھار کچھ نہ کچھ بھیج دیتا تھا۔

جب ہمارے پڑوسیوں نے ہماری یہ حالتِ زار دیکھی تو میری ماں کو دوسری شادی کا مشورہ دیا کہ تم ابھی جوان ہو، دوبارہ گھر بسا لو تا کہ تمھیں سہارا ملے۔ مگر میری ماں نے فوراً میری طرف دیکھا اور کہا: نہیں نہیں، میں کسی سہارے کی محتاج نہیں، یہ میری ماں کا پانچواں جھوٹ تھا۔

چھٹا جھوٹ

الحمد للّٰہ! جب میں نے گریجویشن مکمل کر لی تو مجھے اللہ کے فضل سے ایک معقول ملازمت مل گئی، میں نے سوچا اب ماں کو آرام کرنا چاہیے اور گھر کی ذمہ داریاں مجھے پوری کرنی چاہئیں، میری ماں بہت کمزور اور بوڑھی ہو گئی ہے، میں نے ماں کو کام کرنے سے منع کیا اور ماہانہ اخراجات کے لیے اپنی تنخواہ میں سے ایک رقم ماں کے لیے مختص کر دی۔ ماں نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ اللہ کے فضل سے میرے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تمھارے کام آئیں گے۔ یہ میری ماں کا چھٹا جھوٹ تھا۔

ساتواں جھوٹ

میں نے نوکری کے ساتھ ساتھ اپنی مزید پڑھائی مکمل کر لی تو میری تنخواہ بھی بڑھ گئی اور پھر جلد ہی مجھے جرمنی میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی جو میں نے قبول کر لی اور جرمنی چلا گیا۔ جرمنی میں مکمل طور پر سیٹ ہونے کے بعد میں نے ماں کو اپنے پاس بلانے کا ارادہ کیا اور فون کر کے ماں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس نے میری تنگی کے خیال سے مجھے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ بیٹا! تم تو جانتے ہو مجھے اپنے وطن ہی میں رہنا

پسند ہے، میں اپنے ملک سے دور کہیں نہیں رہ پاؤں گی۔ ویسے بھی مجھے یہاں ہر قسم کی سہولت میسر ہے۔ یہ میری ماں کا ساتواں جھوٹ تھا۔

آٹھواں جھوٹ

میری ماں بہت بوڑھی ہوگئی۔ دن رات کی انتھک محنت اور میری جدائی کے غم نے اُسے بہت کمزور کر دیا۔ پھر اُسے سرطان کا موذی مرض لاحق ہوگیا۔ جب مجھے پتہ چلا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بے اختیار مسکرائی مگر نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، وہ بہت لاغر ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار بہہ نکلا۔ ایک قطرہ ماں کے رخسار پر گرا، ماں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھا اور کہا: مت رو بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ یہ میری ماں کا آٹھواں اور آخری جھوٹ تھا، پھر میری ماں نے آنکھیں میچ لیں اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

والد کے دوستوں کے ساتھ بیٹے کا برتاؤ

صحیح مسلم میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَبَرُّ الْبِرِّ أَنْ يَصِلَ الرَّجُلُ وُدَّ أَبِيهِ»

''سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔''[1]

رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک ہی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد جب کسی صحابی کی ملاقات والد کے دوست سے ہوتی تو وہ انتہائی تواضع کے ساتھ اپنے والد کے دوست سے ملتے۔ جہاں تک ہوسکتا، اس کی عزت واکرام کرتے۔ حدیث کی کتابوں میں سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ

[1] دیکھیے: صحیح مسلم، البروالصلة، حدیث:2552.

ایک دفعہ وہ مکہ مکرمہ جا رہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ایک بدو سے ہو گئی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے سلام کیا اور پوچھنے لگے کہ کیا تم فلاں ابن فلاں نہیں ہو؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں میں وہی ہوں۔

پھر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے اپنا وہ گدھا دے دیا جس پر وہ خود سواری کیا کرتے تھے، پھر اپنے سر سے عمامہ اُتارا اور وہ بھی اس بدو کے سر پر رکھ دیا۔ بدو یہ چیزیں لے کر چلا گیا۔ اس سفر میں عبداللہ بن دینار بھی ساتھ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے جب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک بدو کی اتنی تکریم کرتے ہوئے دیکھا تو ہم میں سے چند ساتھیوں نے اُن سے کہا: اللہ آپ پر رحم کرے، یہ عرب کے بدو لوگ ہیں، انھیں تو معمولی چیز بھی دے دی جائے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اتنا قیمتی گدھا جس پر آپ خود سواری کرتے ہیں اسے کیوں دے دیا؟ پھر آپ نے اپنے سر کا عمامہ بھی اُس بدو کے سر پر رکھ دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ساتھیوں کے جواب میں فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

«إِنَّ أَبَرَّ الصِّلَةِ صِلَةُ الرَّجُلِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيهِ بَعْدَ مَا تَوَلَّى»

”آدمی کے لیے سب سے بڑھ کر صلہ رحمی یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے انتقال کے بعد بھی اُس کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتا رہے۔“[1]

---

[1] دیکھیے: شعب الإيمان للبيهقي: 200,199/6، حدیث: 7897، نیز یہ حدیث آپ مسند أحمد: 91/2، میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اسی مفہوم کی ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصِلَ أَبَاهُ فِي قَبْرِهِ فَلْيَصِلْ إِخْوَانَ أَبِيهِ مِنْ بَعْدِهِ»

''جس کو یہ بات پسند ہے کہ وہ اپنے والد کی، اس کی قبر میں بھی صلہ رحمی کرے، (یعنی مرنے کے بعد بھی اس کے ساتھ صلہ رحمی کرے) تو اُسے چاہیے کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد اُس کے ساتھیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔''[1]

حافظ عراقی رحمہ اللہ اِس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے:

''رسول اکرم ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ سب سے اعلیٰ نیکی باپ کے انتقال کے بعد اس کے دوستوں سے صلہ رحمی کرنا ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ زندگی میں تو کسی قسم کی خوشامد اور چاپلوسی کا وہم ہوسکتا ہے لیکن باپ کے انتقال کے بعد اس کے دوستوں سے صلہ رحمی کرنے میں کسی قسم کی چاپلوسی اور دکھلاوے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا، اسی لیے آپ ﷺ نے مرنے کے بعد والد کے دوستوں سے صلہ رحمی کرنے کو اعلیٰ ترین نیکی بتایا ہے۔''[2]

اس موقع پر علامہ ابن العربی رحمہ اللہ نے ایک بہت ہی عمدہ بات لکھی ہے:

---

[1] دیکھیے: مسند أبي يعلى: 37/10، حديث: 5669، وصحيح ابن حبان: 175/2، حديث: 432، وسلسلة الأحاديث الصحيحة: 417/3، حديث: 1432، وصحيح الجامع الصغير: 1034/2، حديث: 5960.

[2] دیکھیے: إتحاف السادة المتقين شرح إحياء علوم الدين: 290/7.

«وَقَدْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُهْدِي لِصَدَائِقِ خَدِيجَةَ بِرًّا بِهَا وَوَفَاءً لَهَا وَهِيَ زَوْجَتُه، فَمَا ظَنُّكَ بِالْوَالِدَيْنِ»

''نبی کریم ﷺ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اُن کی سہیلیوں کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ یہ عمل آپ ﷺ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وفاداری اور صلہ رحمی کے طور پر کرتے تھے۔ بیوی کے ساتھ جب آپ ﷺ کی صلہ رحمی کا یہ حال تھا تو آپ کا والدین کے بارے میں کیا خیال ہے؟''[1]

مذکورہ واقعہ اور احادیث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں والدین کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی کتنی فضیلت اور اہمیت ہے۔ ریاض الصالحین کی شرح میں اس حدیث کے تحت لکھا ہوا ہے:

''ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس قدر وسیع ہیں کہ صلہ رحمی اور نیکی کا باب وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ صلہ رحمی کا یہ سلسلہ صرف ماں باپ تک محدود نہیں ہے، بلکہ ماں باپ کے دوستوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اگر آپ نے اپنی والدہ کی سہیلیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا تو گویا آپ نے اپنی والدہ ہی کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ اسی طرح جب آپ اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں تو دراصل اپنے والد ہی کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر عظیم احسان ہے کہ اس نے ہمارے لیے ہر طرف سے نیکی کے دروازے کھول دیے ہیں۔ بندہ جدھر سے چاہے اور جب چاہے بے شمار نیکیاں اپنے دامن میں

[1] دیکھیے: أحکام القرآن لابن العربي: 183/3.

سمیٹ سکتا ہے۔"[1]

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس موضوع کو بار بار پڑھیں تا کہ صلہ رحمی کے حوالے سے ہر قاری کا ذہن اتنا کشادہ ہو جائے کہ وہ صلہ رحمی کو اپنا مستقل معمول بنا لے اور دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں سے فیض یاب ہو۔

[1] شرح ریاض الصالحین:5/249-250.

روزانہ جنت کی فضا میں سونے والا خوش نصیب

وہ پانچ ساتھی تھے۔ اُن کا تعلق ایک ہی بستی سے تھا۔ وہ دیہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ پانچوں اپنی بستی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ایک دوسری بستی میں کام کرتے تھے۔ اُن کی بستی بہت چھوٹی تھی۔ وہاں کام کے بہت کم مواقع تھے۔ وہاں ایک دن کام کرنے کے بعد کئی دنوں تک کام کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا، اس لیے وہاں کے لوگ قریبی شہروں میں جا کر روزی کماتے تھے۔

وہ پانچوں دوست بھی روزی کی تلاش میں اپنی بستی سے نکل کر دوسری بستی میں آئے تھے۔ وہاں انھیں اچھا خاصا کام مل گیا۔ وہ جس بستی میں کام کر رہے تھے، وہ اُن کی اپنی بستی سے قریب ہی تھی لیکن وہ روزانہ اپنے گاؤں نہیں جاتے تھے۔ کیونکہ ان کا بیشتر وقت کام ہی میں گزر جاتا۔ اسی لیے انھوں نے یہ طے کیا کہ ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے ملنے جایا کریں گے، البتہ ان میں سے ایک شخص ایسا نہیں کرتا تھا۔ وہ روزانہ شام ہوتے ہی اپنی بستی کی طرف روانہ ہو جاتا اور عشاء کی نماز کے بعد اپنے گھر پہنچتا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ راستہ طے کرتا، تاکہ جلدی

سے اپنے گھر پہنچ جائے۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے والدین کی خدمت کرتا، ان کے ساتھ رات گزارتا۔ صبح سویرے فجر کی نماز پڑھ کر دوبارہ اس بستی کی طرف چل پڑتا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اُس کے چاروں دوست اُس کا مذاق اڑایا کرتے اور اُس کے اِس عمل کو احمقانہ فعل گردانتے تھے۔ وہ کہتے کہ آخر تمھیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ روزانہ کام کی تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود تم اپنے گھر چلے جاتے ہو؟ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتے، جبکہ رات کے وقت راستہ کئی خطرات سے پُر ہوتا ہے۔ تمھاری ابھی شادی ہوئی ہے نہ تمھاری کوئی اولاد ہے جن کے بارے میں تمھیں کسی قسم کا اندیشہ لاحق ہو۔

ایک دن اُس نوجوان مزدور نے اپنے ساتھیوں کے جواب میں کہا: اگر یقین مانو تو میں تمھیں بتلائے دیتا ہوں کہ دراصل میں روزانہ رات کو جنت میں سونے کے لیے جاتا ہوں۔ یہ بات سُن کر اُس کے چاروں ساتھی ہنس پڑے۔ انھیں اپنے ساتھی کی بات عجیب سی لگی۔ وہ اُس کا مذاق اڑانے لگے۔ انھوں نے اپنے نوجوان ساتھی سے یہاں تک کہہ دیا کہ دوست! آج سے پہلے ہم تمھیں ایک عقلمند انسان سمجھتے تھے مگر آج تمھاری یہ بے تکی بات سن کر ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ بستی سے باہر رہنے کے سبب تمھاری عقل ماری گئی ہے۔ اب تو تمھیں کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیے۔

نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''اگر تمھیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو ایسا کرتے ہیں کہ ہم اپنے درمیان کسی کو جج مقرر کر لیتے ہیں۔ اُس کی عدالت میں اپنی اپنی باتیں رکھتے ہیں تاکہ وہ فیصلہ کر دے کہ میں اپنی بات میں سچا ہوں یا جھوٹا؟

چنانچہ وہ پانچوں ساتھی مسجد کے امام کی خدمت میں پہنچے اور اپنی اپنی باتیں بیان کرنے لگے۔ امام نے چاروں ساتھیوں کی باتیں سننے کے بعد پانچویں ساتھی سے پوچھا: ''نوجوان! تم کیا کہتے ہو؟ تمھارے ساتھی تمھارے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں کیا یہ سچ ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا: امام صاحب! اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اُن کی دیکھ بھال اور اخراجات کی تمام تر ذمے داری مجھ پر ہے۔ میں نہ کماؤں تو گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آ جائے۔ میرے والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ میں زیادہ تر وقت انھی کے ساتھ گزاروں۔ میں نہیں چاہتا کہ انھیں گھر میں تنہا چھوڑ دوں، اس لیے میں اللہ کے بھروسے پر مغرب کی نماز پڑھ کر اپنی بستی کی طرف روانہ ہو جاتا ہوں۔ راستے میں خطرات کا خدشہ تو ضرور رہتا ہے مگر ایک طرف یہ خطرات ہیں تو دوسری طرف میری جان سے زیادہ عزیز ماں باپ ہیں۔ میں روزانہ اپنے والدین کی خدمت ہی کے لیے جاتا ہوں۔ جب عشاء کے بعد گھر پہنچتا ہوں تو وہ کھانے سے فارغ ہو کر بسا اوقات سو جاتے ہیں۔ جب میں اپنے والدین کو نیند کی حالت میں دیکھتا ہوں تو انھیں جگانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خاموشی سے کھا پی کر اُن کے قدموں کے پاس چادر اوڑھ کر سو جاتا ہوں۔ صبح ہوتی ہے تو نمازِ فجر کے لیے انھیں جگاتا ہوں، وضو کے لیے پانی دیتا ہوں۔ ناشتہ بنا کر انھیں کھلاتا ہوں، پھر اُن کی دیگر ضروریات پوری کر کے واپس کام کے لیے اس بستی میں آ جاتا ہوں۔ میں اپنے اِس عمل پر اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے اس بات کی توفیق بخشی ہے۔ مجھے روزانہ آنے جانے میں مشقت تو ضرور جھیلنی پڑتی ہے مگر جب میں رات

کے سناٹے میں اپنے والدین کے قدموں کی چھاؤں میں سوتا ہوں اور صبح کام کے لیے گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے رات جنت میں بسر کی ہے۔ میرا دل بڑا مطمئن ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر میں نے دوستوں کے سامنے یہ کہا ہے کہ میں روزانہ جنت میں رات گزارتا ہوں۔

نوجوان مزدور کی باتیں سننے کے بعد امام مسجد اُس کے چاروں ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: اللہ کی قسم! تمھارے اِس ساتھی نے بالکل سچ کہا ہے۔ کیا تم نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں سنا کہ آپ نے والدین کے بارے میں کیا فرمایا ہے؟ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ»

''جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔''[1]

میں تمھارے اِس دوست کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم بھی اپنے والدین کے ساتھ اسی کی طرح حسن سلوک کرو، تاکہ تمھاری راتیں بھی جنت کی فضا میں گزریں۔[2]

---

[1] یہ حدیث بہت معروف ہے اور اس کی ہم معنی حدیث متعدد کتب حدیث میں وارد ہے۔ دیکھیے: سنن النسائي، الجهاد، حديث: 3106. [2] اس واقعے کے لیے دیکھیے کتاب: قصص مؤثرة في بر وعقوق الوالدين، ص:32,31، تالیف: فتح الرحمٰن محمد حسن جمیل۔

والدین کو
راضی رکھنے کے
چنداور اصول
(4)

والدین کو راضی رکھنے کے چند اور اصول

اگر والدین پڑھنے کے شوقین ہیں، مثلاً: روزانہ اخبار پڑھنے کے عادی ہیں تو آپ اُن کے لیے ایسا یقینی اہتمام کریں کہ صبح سویرے اُن کو روزانہ بروقت اخبار میسر ہو۔ بعض اچھے جرائد، رسالے اور کتابیں خرید کر ان کی خدمت میں پیش کریں۔ اگر آپ کے شہر میں کتابوں کی نمائش لگی ہو تو ان کی پسندیدہ کتابوں کا انتخاب کریں۔ پھر انھیں یہ کہتے ہوئے بطور تحفہ پیش کریں کہ میں نمائش میں تھا، آپ کے لیے یہ کتابیں خرید کر لایا ہوں، انھیں قبول کیجیے۔ باذوق اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے والدین کے لیے یہ ایک عظیم تحفہ ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آپ کے والدین امیر ہوں ان کو آپ کی طرف سے روپے پیسے کی ضرورت نہ ہو۔ مگر اس کے باوجود اولاد کی طرف سے نقدی کی صورت میں ہدیہ کی پیش کش انھیں بہت عزیز ہوتی ہے اولاد کا یہ ہدیہ پا کر انھیں بڑا اثر ور محسوس ہوتا ہے۔ اگر وہ ضرورت مند ہیں تو جب بھی آپ ان سے ملاقات کے لیے جائیں تو اپنی حیثیت کے مطابق ان کی جیب میں لازماً کچھ نہ کچھ رقم ضرور ڈال دیں۔ وہ بے شک انکار کریں مگر آپ ہر حال میں ان کی خدمت میں مالی ہدیہ پیش کرتے رہیں۔

آپ کی زندگی میں یقیناً ایسے بھی مواقع آئے ہوں گے کہ آپ اپنے والدین کے ساتھ شاپنگ سنٹر گئے ہوں۔ والدین جب بھی خریداری کریں تو آپ آگے بڑھ کر بل ادا کردیں۔ آپ کے اس عمل سے وہ بہت خوش ہوں گے۔

آج کل جگہ جگہ بنک کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کے لیے ممکن ہو تو بنک میں والدین کا اکاؤنٹ کھلوا دیں۔ اس کے علاوہ ان کے لیے اے ٹی ایم مشین کارڈ بنوا دیں۔ ان کو مشین سے رقم نکالنے کا طریقہ سکھا دیں تاکہ جب ان کو ضرورت ہو، خود ہی مشین سے رقم نکال لیں۔

اگر کبھی کسی وجہ سے والدین ناراض ہو جائیں تو ان کو فوری طور پر راضی کرنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ راضی نہ ہوں تو دیکھیں ان کے قریب کون ہے، جس سے وہ زیادہ محبت کرتے ہیں اور اُس کی بات سنتے ہیں۔ اُس کے پاس جائیں، اُن سے گزارش کریں کہ ہمارے مابین صلح کرا دیں۔ والدین کبھی ناراض ہو جاتے ہیں تو بہت جلدی راضی بھی ہو جاتے ہیں۔ انھیں راضی کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ بس ان کے پاؤں پکڑ لیں۔ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ لیں۔ یہ چند لمحات کی بات ہے، پھر ان کے دل خود بخود پسیج جائیں گے۔ واضح رہے کہ فقط والدین ہی ایسی ہستی ہیں جن کے سامنے ہاتھ جوڑنا ان کے پاؤں پڑ جانا کوئی عیب نہیں بلکہ یہ قابل فخر ہے۔ اُن کی ناراضی رب کی ناراضی ہے اور اگر وہ راضی اور خوش ہیں تو پھر رب العزت بھی خوش اور راضی ہے۔

دورانِ گفتگو پوری کوشش کریں کہ والدین کی بات پوری توجہ سے سُنیں، اُن کی بات کبھی نہ کاٹیں، ان کی گفتگو کے دوران کسی اور کی بات نہ سنیں۔ اپنے کان اور دل و

دماغ کو انھی کی طرف متوجہ رکھیں۔ جب وہ اپنی بات پوری کرلیں تو اُن کی بات کا جواب دیں، یا اس پر اپنا تبصرہ کریں۔ یہ بات ہمیشہ کے لیے ذہین نشین کرلیں کہ ان سے بڑی مشفق ہستی آپ کے لیے اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

والدین کے ساتھ آپ کا تعلق اِس قدر قریب ہونا چاہیے کہ اُن کے بارے میں ہر قسم کی معلومات سب سے پہلے آپ ہی کو ملیں۔ اللہ نہ کرے، اگر انھیں کوئی بیماری یا پریشانی لاحق ہے یا کسی کی وفات ہوگئی ہے تو سب سے پہلے آپ ان کو اِس خبر سے آگاہ کریں۔ اِسی طرح خوشی کے مواقع جیسے رمضان المبارک کا چاند، عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی خبر یا کوئی اور خوش آئند خبر ہو تو ایسی صورت میں سب سے پہلے آپ ان کو مبارک باد پیش کرنے والے ہوں۔ والدین کو اولاد کی جانب سے ایسا اہتمام بڑا پسندیدہ لگتا ہے۔

بعض والدین گرم مزاج ہوتے ہیں۔ بڑی جلدی غصہ میں آجاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اُن کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ اِس صورت میں صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں۔ وہ ڈانٹ بھی دیں تو مسکرا دیں۔ اللہ رب العزت سے اُن کے لیے اور اپنے لیے صبرو استقامت کی دعا کریں۔

اگر والدین بیمار ہوگئے ہیں اور آپ سفر پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں یا آپ کی بڑی اہم میٹنگ ہو، غرضیکہ آپ کو کتنا ہی اہم کام درپیش ہو آپ تمام کام ملتوی کرکے فوری طور پر اپنے والدین کے علاج کا بندوبست کریں۔

ذرا اپنے اردگرد جھانکیں اور ان لوگوں کا جائزہ لیں جن کے والدین وفات پا چکے ہیں، ان کے دل ٹٹولیں۔ آپ فوراً محسوس کرلیں گے کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم

ہو چکے ہیں۔ ذرا اُن سے پوچھیں کہ والدین کی کیا قدر و قیمت ہوتی ہے۔ اُن کی محرومی کے بارے میں اُن کے دل سے جواب مانگیں کہ والدین کے بعد وہ اپنے آپ کو کتنا محروم اور کس قدر تنہا سمجھتے ہیں۔ اِن حروف کے معانی راقم سے پوچھیں کہ والدین کا سایۂ شفقت اُٹھ جانے کے بعد وہ خیر و برکت کے کتنے بڑے اثاثے سے محروم ہو گیا ہے اور اپنے آپ کو کس قدر محرومیوں کا شکار سمجھتا ہے۔ اُن کی دعائیں، اُن کی نیک تمنائیں، قدم قدم پر اُن کے گرانقدر مشورے غرضیکہ ہر وہ چیز انھی کے ساتھ چلی گئی جس کی بدولت میری زندگی برکات و حسنات سے معمور تھی۔۔ جن کے والدین زندہ ہیں بلاشبہ وہ بڑے خوش قسمت ہیں۔

میں نے اپنے مطالعہ اور اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کے حوالے سے بعض نکات لکھے ہیں۔ یقیناً اور بہت سارے اہم نکات ہوں گے جن کا میں احاطہ نہیں کر سکا۔ میرا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ میں نے آپ کو سارے مطلوبہ مشورے دے ڈالے ہیں۔ بہرحال جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں اپنے والدین کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے اور اُن کی عزت و توقیر بڑھانے کی کوشش کریں۔

بعض اوقات والدین میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ ان دونوں میں یقیناً ایک کا موقف درست نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی ذمہ داری اور بڑھ جائے گی۔ دونوں ہی آپ کے لیے محترم ہیں۔ آپ کیسے والدہ یا والد کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ غلطی پر ہیں۔ ایسی صورت میں انھیں اس طرح بات سمجھانے کی کوشش کریں کہ اُن کے جذبات مجروح نہ ہونے پائیں۔ براہ راست ان سے یہ نہ کہیں کہ آپ غلط ہیں، نہ ان کو

نصیحت کریں۔ بلکہ یوں کہیں کہ میری رائے یوں ہے۔ تاریخ میں کچھ اس طرح آتا ہے۔ اِس قسم کے معاملات میں اللہ اور رسول ﷺ نے یہ رہنمائی فرمائی ہے۔ آپ ان سے کہہ سکتے ہیں کہ چلیے آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں۔ اگر براہ راست قرآن کی آیت یا حدیث ان کو سنانے کی ہمت نہیں تو پھر ان کو لکھ کر بھی پیش کر سکتے ہیں۔

والدین کی آپس میں صلح کی غرض سے آپ کو بات کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو اُن سے علیحدگی میں بات کریں، ان کو کبھی یہ باور نہ کرائیں کہ آپ کا موقف درست نہیں بلکہ یہ کہیں کہ میرا مشورہ یوں ہے۔ شیطان نہیں چاہتا کہ ہمارے گھر میں صلح رہے وغیرہ وغیرہ۔

اگر کبھی کسی ایسے بدقسمت شخص کو دیکھیں کہ وہ والدین کا نافرمان ہے تو آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ اُس نے آپ کو اِس گناہ سے محفوظ رکھا ہے۔ یاد رکھیں کہ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک اور اُن کی فرماں برداری بہت بڑی سعادت اور خوش بختی ہے۔

آپ پوری کوشش کریں کہ والدین کی طرف پشت نہ کریں۔ مجلس میں اُن کے قریب تر ہو کر بیٹھنے کی کوشش کریں۔ اُن کی طرف دیکھتے رہیں تاکہ اگر کسی بھی وقت اُنھیں کوئی ضرورت پیش آئے تو آپ لپک کر اُن کی مدد کر سکیں۔

والدین جب مجلس سے اٹھنے لگیں یا باہر جانے کا ارادہ کریں تو بھاگ کر اُن کی جوتیاں سیدھی کر دیں۔ اسی طرح اگر وہ مسجد میں داخل ہونے لگیں تو اس وقت بھی اُن کے جوتے اُٹھا کر مخصوص جگہ پر رکھ دیں۔ اب تو وضو کے لیے پانی کے لوٹے کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے مگر جن علاقوں میں پانی کی قلت ہو اور طہارت خانے نہ بنے ہوں اور وضو کے لیے لوٹا استعمال ہوتا ہو وہاں والدین کے لیے لوٹے میں پانی

لے کر آئیں۔ یہاں پر اللہ کے رسول ﷺ کے چچا زاد بھائی سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا واقعہ ملاحظہ فرمالیں کہ وہ ایک رات اپنی خالہ سیدہ میمونہ کے ہاں سوئے ہوئے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جب وضو کرنا چاہا تو یہ بھاگ کر گئے اور لوٹے میں پانی لا کر رکھ دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دریافت فرمایا کہ لوٹے میں پانی کون لے کر آیا ہے؟ جب بتایا گیا کہ یہ کام آپ کے چچیرے بھائی عبداللہ نے کیا ہے تو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھ اُٹھائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی: «اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ» ''اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطا فرما۔''[1] اس سے معلوم ہوا کہ از روئے اسلام والدین اور بزرگوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا نہایت اہم اور باعث اجر و ثواب بات ہے۔

اگر بیٹا والدین سے اُن کی رضا کا طالب ہو، اُن سے دعاؤں کا خواستگار ہو تو والدین کو یہ احساس ہوگا کہ ہمارا بچہ نہایت فرماں بردار ہے۔ وہ والدین کو ہر حال میں راضی دیکھنا اور رکھنا چاہتا ہے۔ یہی مقصودِ الٰہی ہے۔ والدین کے سامنے اپنی آواز ہمیشہ پست رکھیں۔ کبھی بھول کر بھی اونچی آواز سے نہ بولیں۔ اُن کی خدمت کو اپنا شعار بنالیں۔

اگر کسی وجہ سے آپ کا قیام والدین کے ساتھ نہیں ہے تو کوشش کریں کہ آپ کا گھر اُن کے قریب ہو تاکہ آپ اُن کی خدمت کے لیے فوراً پہنچ سکیں۔ اسی طرح جب آپ اُن سے ملنے جائیں تو اپنے بیوی بچوں کو اپنے ساتھ ضرور لے جائیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ پوتوں اور نواسوں کی محبت بعض اوقات اولاد سے بھی زیادہ

[1] صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 143.

ہوتی ہے۔ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ہماری اولاد کی اولاد ہمارے پاس آئے ہم ان کے ساتھ کھیلیں، ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنیں۔ اُن کی شرارتیں دیکھیں۔ اپنے پوتوں یا نواسوں کو دیکھ کر وہ اپنے غم اور پریشانیوں کو بھول جاتے ہیں۔

کبھی کبھار علیحدگی میں بیٹھ کر محاسبۂ نفس کریں۔ سوچیں کہ کہیں میں اپنے والدین کی کسی نافرمانی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا۔ کہیں اُن کے حقوق ادا کرنے میں سستی یا کوتاہی تو نہیں ہو رہی۔ انسان بنیادی طور پر کمزور ہے۔ بشری تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ مگر اپنا محاسبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ غور کریں کہ میں نے اپنے والدین کے کس حد تک حقوق ادا کیے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ میں اُن کی بہتر سے بہتر طور پر فرماں برداری اور خدمت گزاری میں مزید آگے بڑھ جاؤں۔ اِس قسم کے سوالات اور محاسبہ والدین کی عزت وتوقیر کے تقاضے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

یہ دنیا عمل اور اس کے نتائج کی جگہ ہے۔ آج آپ جو بوئیں گے کل وہی کاٹیں گے۔ اگر آپ اپنی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتے ہیں تو پھر والدین کی عزت کریں، اُن کے حقوق ادا کریں۔ ان شاء اللہ آپ دنیا وآخرت میں اس کے ثمرات پائیں گے۔

والدین کے پاس بیٹھیں تو انھیں اپنی زندگی کے خوشگوار واقعات سنائیں، مثلاً: کسی سفر کا واقعہ، آپ کس طرح گئے اور آپ کو کیا حالات پیش آئے۔ بہت ساری باتیں آپ اُن کے ساتھ (Share) کرسکتے ہیں۔ اِسی طرح آپ اُن سے ماضی کے حالات و واقعات سننے کی فرمائش کریں۔ چاہے وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہوں، اُن کی زندگی کے تجربات بہرحال ایک وسیع خزانہ ہے۔ بزرگوں کے پاس بیٹھ کر اپنے

خاندان کے حالات سننا نہایت مفید اور سبق آموز بات ہے، اُن کے ماضی کے قصے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ اگر آپ حقیقی علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے کسی ایسے بزرگ رشتہ دار کے پاس بیٹھ جائیں جو عالم بھی ہوں، اُن سے سوالات کریں۔ اُن کے جوابات ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہوں گے جن سے آپ بڑے بیش قیمت سبق سیکھ سکتے ہیں۔

راقم الحروف کو یاد ہے۔ میں مولانا محمد ادریس کیلانی کا شاگرد تھا۔ رشتہ میں وہ میرے چچا تھے۔ میں مغرب کی نماز کے بعد عموماً ان کے گھر چلا جاتا، وہ چارپائی پر لیٹے ہوتے۔ میں ان کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیتا۔ ساتھ ساتھ اُن سے مختلف سوالات کرتا جاتا۔ وہ بڑی محبت سے جواب دیتے جاتے تھے۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح ایک سوال سے نئے سوالات جنم لیتے ہیں۔ میں سوال پر سوال کرتا جاتا، وہ پے در پے جوابات مرحمت فرماتے چلے جاتے۔ نہ شاگرد تھکتا، نہ استاد محترم جواب دینے سے اکتاتے، یوں ان کے خوانِ دانش سے حاصل کردہ علم آج بھی میرے کام آ رہا ہے۔

میری اب بھی خواہش ہوتی ہے کہ میں بزرگوں کے پاس بیٹھ جاؤں، اُن سے کرید کرید کر ماضی کے واقعات معلوم کروں اور اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کا جواب پوچھوں۔ یاد رکھیے علم کی جو تشنگی اس طرح پوری ہوتی ہے ممکن ہے وہ کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ پوری نہ کر پاتے ہوں۔

سعودی عرب آنے کے بعد بھی متعدد علماء کی نجی مجالس میں جانے اور بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ فضیلۃ الشیخ عبد العزیز آل الشیخ مدتوں حرم مکی کے امام رہے، شاہ فیصل کے دور

میں وزیر بھی رہے۔ ریاض میں اُن سے تعارف ہوا۔ وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔میں ایک مدت تک ان کے پاس جاتا رہا،عصر کے بعد اُن کے پاس بہت کم لوگ ہوتے تھے۔ بلکہ اکثر میں اور وہ اکیلے ہی ہوتے۔نوکر ہمیں قہوہ اور چائے پیش کرتا رہتا۔ میں نے امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کی دعوت، آل سعود کے ساتھ اُن کے تعلقات اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ان دونوں خاندانوں کی خدمات کی مشترکہ تاریخ اُنھی کی زبانی سنی۔ کاش میں نے اس وقت سارے واقعات قلمبند کر لیے ہوتے۔ یادش بخیر میرے سب سے بڑے بیٹے عزیزی عکاشہ مجاہد کو انھوں نے گھٹی دی تھی۔

مجھے معالی الشیخ ابراہیم بن محمد آل شیخ کی مجالس میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ سعودی عرب کے سابق وزیر عدل تھے۔ اُن سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ اُن کی عارفانہ گفتگو اور علمی نکات سے بھرپور استفادہ کیا۔ میں اپنی مصروفیت کے باوجود اُن کے پاس جاتا رہتا۔ وہ بھی منتظر ہوتے۔ پھر میرے سوالات اور ان کے جوابات کا سلسلہ دراز ہوجاتا۔ یہ دونوں حضرات اللہ کو پیارے ہوکر اس دنیا سے رخصت ہوگئے مگر ان کی یادیں میرے دل کے حجرے میں اب تک مقیم ہیں۔ اللہ مغفرت فرمائے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)

بزرگوں سے استفادہ کی بات آئی ہے تو یہ بھی سُن لیجیے کہ میں نے فضیلہ الشیخ عبداللہ بن محمد المعتاز سے بہت کچھ سیکھا۔خصوصاً عقیدہ توحید کے بارے میں اُن کے نکات میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔جب بھی اُن کے پاس گیا کوئی نہ کوئی علمی بات لے کر آیا۔ بات لمبی نہ ہوجائے اس لیے میں مختصراً اپنے قارئین کرام کو مشورہ

دوں گا کہ وہ اپنے والد گرامی یا والدہ کے پاس بیٹھ جائیں، اُن سے سوالات کریں۔ آپ کے اس چھوٹے سے عمل کا بڑا فائدہ ہوگا۔ اس طرح آپ کے والدین کو احساس ہوگا کہ وہ اب بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ اُن کی اولاد اُن کی خدمت میں بیٹھ کر توجہ سے ان کی باتیں سنتی ہے۔ اسی طرح اپنے رشتہ داروں میں خاص طور پر جن کے پاس دینی یا دنیاوی علم ہو اُس سے ضرور استفادہ کریں۔ یاد رہے کہ آپ کو سب سے اچھا اور صحیح مشورہ دینے والے صرف آپ کے والدین ہیں۔

اگر آپ والدین سے ملنے گئے ہیں تو نشست و برخاست میں ان کی عزت وشرف کا خاص خیال رکھیں۔

والدین کی خوراک کا بے حد خیال رکھیں۔ اُن کی پسندیدہ چیزوں کا اہتمام کریں۔ اُن سے پوچھیں کہ آپ کا جی کیا کھانے کو چاہتا ہے۔ ان کی خواہش کے مطابق گھر میں کھانا تیار کرائیں۔ اگر اُن کا کسی کھانے سے پرہیز ہے تو اس چیز کا خاص لحاظ رکھا جائے، مثلاً: اگر والدین مرچ کم کھاتے ہیں یا اُن کی صحت کے لیے مرچ مضر ہے تو ہنڈیا میں مرچیں نہ ڈالی جائیں یا بہت ہلکی ڈالی جائیں۔ بلڈ پریشر کے مریضوں کے لیے نمک نقصان دہ ہے۔ آپ گھر میں ایسا نظام وضع کریں کہ جو بھی چیز پکے اُس میں نمک کم ہو۔ راقم الحروف اس کامیاب تجربہ سے گزر چکا ہے۔ اسی طرح شوگر کے مریضوں کے لیے چینی نقصان دہ ہے۔ آپ گھر میں چینی کے استعمال کو حتی الامکان کم کر دیں۔ آپ کے یہ اعمال یقیناً والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے زمرے میں آئیں گے۔

انسان جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے اُس میں طبعی طور پر چڑچڑاپن آتا جاتا ہے۔

اُسے جلدی غصہ آنے لگتا ہے۔ اس کا سبب بڑا واضح ہے کہ ایک وقت تھا جب وہ جوان تھے۔ اُن کے پاس اختیارات تھے۔ جسم میں طاقت تھی۔ اُن کا حکم چلتا تھا۔ گھر اور دفتر میں نوکر چاکر تھے، اب اُن کے اختیارات ختم ہوگئے، اُن کی خیر خیریت پوچھنے اور اُن سے فائدہ اٹھانے والے بہت کم رہ گئے۔ وہ بڑی حسرت سے اُن اچھے دنوں کو یاد کرتے ہیں جب انھیں اقتدار و اختیار حاصل تھا۔ یوں ماضی کی یادیں ہی ان کی جائے پناہ بن جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں جب اُن کی تمنا پوری نہیں ہوتی یا اُن کے احکام پر فوری عمل نہیں ہوتا تو اُنھیں غصہ آتا ہے، پھر وہ بڑبڑانے لگتے ہیں، کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم ان کی نفسیات کو سمجھیں کہ ان کا ماضی کیسے گزرا؟ اس کے مطابق ہی اُن سے برتاؤ کریں۔ ان کے مزاج کے خلاف کوئی کام نہ کریں۔ اُن کا ادب ہر حال میں ملحوظ رکھیں۔ اگر وہ ناراض بھی ہوں تو مسکرا دیں۔ اپنی اولاد کو بھی بتائیں کہ اِس عمر میں مزاج کے کچھ فطری تقاضے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ سبھی ماں باپ بڑھاپے میں چڑچڑے پن کا شکار ہو جائیں۔ بہرحال والدین سے حُسنِ سلوک کے بارے میں قرآن وسنت کی تعلیمات ہی آپ کے پیش نظر رہنی چاہئیں۔

والدین کے گھر جانے سے پہلے اپنی اولاد کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ دیکھو تم داداجان کے گھر جا رہے ہو وہاں چیزوں کو خراب نہیں کرنا۔ کوئی توڑ پھوڑ نہیں کرنی، شور وغل نہیں کرنا، کسی کو تنگ نہیں کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑی دیر کے لیے بچے دادی کے پاس آئیں پھر شور مچا مچا کر اور چیزیں الٹ پلٹ کر گھر کو تہس نہس کر ڈالیں۔اور دادی جان بعد میں گھر کی صفائی ہی میں مصروف ہو کر رہ جائیں۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے، انھیں کوفت ہوگی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ بچے آرام سے نہیں

بیٹھتے۔ شرارتیں ضرور کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر بچے گیند بلا کھیلیں اور گیند کی ضرب سے کھڑکی کا شیشہ چٹخ جائے یا کسی بچے کے ہاتھوں سے چینی کا کوئی برتن ٹوٹ جائے یا فرنیچر بے ترتیب ہوجائے تو گھر کی ازسرنو صفائی ضروری ہوجائے گی۔

ایسی صورت میں آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کردیں۔ یہ گھر کسی بیگانے کا نہیں ہے، آپ کے والدین کا گھر ہے۔ اگر کوئی توڑ پھوڑ ہوگئی ہے تو فوراً اس کی مرمت اور اصلاح کردیں۔ اس طرح آپ والدین کا دل جیت لیں گے۔

ماشاء اللہ! اگر والدین کی اولاد زیادہ ہے تو پھر بہن بھائیوں کو والدین کی زیارت کے لیے جدول مرتب کرنا چاہیے۔ اگر سارے بچے بیک وقت اُن سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے تو پھر گھر میں بڑا شوروغل برپا ہوجائے گا۔ اس لیے والدین سے ملاقات کا صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ آپ اپنے بہن بھائیوں سے رابطہ کرکے ایک پروگرام طے کرلیں تاکہ والدین سے ملنے کے لیے ایک وقت میں ایک ہی بہن یا بھائی اپنے بچوں کو لے کر جائے سب اکٹھے بچوں سمیت نہ جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ والدین کے آرام کا ہر حال میں خیال رکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر گھرانے کے افراد زیادہ ہیں، گھر چھوٹا ہے تو پھر کسی ریسٹ ہاوس، پارک یا تفریح گاہ میں ملاقات کا پروگرام ترتیب دیں۔ تاکہ بزرگ والدین پریشان ہوئے بغیر سب بچوں پوتا پوتیوں اور نواسا نواسیوں سے اطمینان سے مل کر اپنی خوشی منالیں۔ اس طرح کی خوشی کا صلہ وہ آپ کو ڈھیر ساری دعاؤں کی شکل میں دیں گے۔

آج کے جدید دور میں ٹیلیفون خاص طور پر موبائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا

جاسکتا۔ آپ والدین کے لیے نئے ماڈل کا موبائل خرید کر انھیں تحفہ میں دیں۔ انھیں اس کے استعمال کا طریقہ بتائیں۔ اور پھر ان سے کہیں کہ اس کے مصارف میرے ذمہ ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کو اس سے کتنی خوشی ہوتی ہے۔

اگر ان کے پاس پہلے سے موبائل موجود ہے تو اُن کو بڑے خوبصورت چھوٹے چھوٹے پیغام ارسال کریں۔ یقین جانیے آپ کے پیغامات اُن کے لیے سرمایہ حیات ہیں۔ وہ آپ کے پیغامات کو نجانے اپنے کتنے دوستوں اور جاننے والوں کو سنائیں گے اور بتائیں گے۔ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں مگر ان کی بڑی اہمیت ہے۔ والدین کے لیے ایسی خوشیوں کی فراہمی کا اہتمام کرتے رہیے۔

اگر آپ کے لیے ممکن ہوتو والدین کو چھوٹے موٹے تحفے، خوبصورت گفٹ پیپرز میں پیک کر کے دیں۔ ان سے کہیں کہ اگر آپ کے دوست احباب آپ سے ملنے کے لیے آئیں تو ان کی خدمت میں یہ تحفہ پیش کیجیے۔ آپ کا یہ اہتمام والدین کی خوشی کا سبب بنے گا۔

اگر آپ والدین کو فون کریں تو نہایت صبر وسکون سے اُن کی ساری باتیں سنیں۔ ہوسکتا ہے وہ لمبی بات کریں، آپ کو کوئی بھرپور واقعہ سنائیں، ممکن ہے کہ آپ کو جلدی ہو اس کے باوجود آپ ان کو بات مکمل کرنے کا پورا موقع دیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ میری محترم خالہ جان جو میری خوش دامن بھی ہیں، میں جب بھی ان کو فون کرتا ہوں تو وہ بڑی لمبی بات کرتی ہیں۔ سب کی خیر خیریت پوچھتی ہیں ایک ایک بات کی تفصیل سناتی ہیں، اِدھر حالت یہ ہوتی ہے کہ ہم سعودی عرب سے بات کررہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات جلدی ہوتی ہے اور بعض اوقات بل کا بھی فکر ہوتا ہے۔ مگر وہ

اِن سب باتوں سے بے نیاز ہوکر اپنی شفقت و مرحمت کا چھڑکاؤ کرتی رہتی ہیں۔ شاید انھیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ میری بات لمبی ہورہی ہے۔ ادھر ہم دونوں میاں بیوی کو ان کی باتوں میں عید کی سویّوں کا مزہ آتا ہے، ہم مسلسل سپیکر آن کیے ہوئے ان کی باتوں سے محظوظ ہورہے ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنی بات مکمل کرلیتی ہیں تو انھیں سکون مل جاتا ہے اور وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی عادت ہوگئی ہے کہ ان کی تفصیلی باتیں سنیں۔ یقین جانیے اس فون سے جو روحانی لذت ملتی ہے اس کا کوئی جواب نہیں۔

والدین کا جہاں بچپن گزرا ہو وہ جگہ انھیں زندگی بھر محبوب رہتی ہے۔ اگر آپ کسی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور اب اس جگہ کو چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہوچکے ہیں تو ایسا کیجیے کہ کبھی کبھار والدین کو اپنے گاؤں لے جائیں۔ وہاں انھیں قدم قدم پر بیتے دنوں کی نشانیاں نظر آئیں گی۔ ماضی کی یاد سبھی کو عزیز ہوتی ہے۔ خاص طور پر بوڑھوں کو! خوب یاد رکھیے آپ کے والدین گاؤں گوٹھ میں اپنے ماضی کے نشانات دیکھیں گے تو انھیں بڑی مسرت نصیب ہوگی جو آپ کے لیے دعاؤں کا خزانہ بن جائے گی۔

ماں کے قدموں کی مٹی

حضرت لقمان حکیم نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے سے کہا کہ جنت سے کوئی چیز لاؤ۔ وہ جلدی سے گئے اور مٹھی بھر مٹی لے آئے۔

عرض کیا ابا جان! یہ جنت کی مٹی ہے۔

حضرت لقمان نے پوچھا: یہ کہاں سے لائے ہو؟

جواب دیا: ابا جان! یہ میں اپنی والدہ کے قدموں سے لایا ہوں۔

صلہ رحمی کا کرشمہ

والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک اوران کی خدمت کا صلہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تو یقیناً دے گا، وہ اِس دنیا میں بھی اس کا بہترین بدلہ عنایت فرماتا ہے۔ یہ اُس آدمی کا قصہ ہے جو بوڑھا ہو چکا تھا۔ اُس میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ لبِ مرگ تھا۔ صرف اپنی اولاد کے رحم وکرم پر تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے جس سے جتنا ہوتا وہ اس کی خدمت کرتا۔ لیکن اس کے باوجود بوڑھے باپ کی جو خدمت ہونی چاہیے تھی اس کا حق ادا نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دن اس کے چاروں بیٹوں کی میٹنگ ہوئی۔ ایک بھائی نے تینوں بھائیوں سے کہا: آپ جانتے ہیں کہ ہمارے والد صاحب سخت بیمار ہیں۔ انھیں ہماری خدمت کی شدید ضرورت ہے۔ میں آپ بھائیوں کے سامنے یہ تجویز رکھتا ہوں کہ یا تو آپ تینوں مل کر والد صاحب کی خدمت کریں یا صرف میں۔ لیکن والد صاحب کی خدمت کرنے کی ایک شرط ہے کہ جو بھی اُن کی خدمت انجام دے گا اُسے اُن کے مال میں سے ایک پائی کی بھی وراثت نہیں ملے گی۔

بظاہر یہ تجویز عجیب سی تھی کہ والد کی خدمت بھی کرنی تھی اور خدمت کے عوض

اُس کے مال میں سے کچھ ملنا ملانا بھی نہیں تھا۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو والد کی خدمت کرتا اُسے اُس کے مال میں سے کچھ زیادہ ہی وراثت کا حصہ دیا جاتا۔ لیکن یہاں میٹنگ میں یہ تجویز رکھی گئی کہ جو والد کی خدمت انجام دے گا اُسے اُس کے مال میں سے بطور وراثت کچھ نہیں ملے گا۔ تینوں بھائیوں کو اپنے چوتھے بھائی کے دماغی توازن پر شک ہونے لگا۔ انھوں نے اپنے بھائی سے کہا: یہ تم کیسی تجویز دے رہے ہو؟ کیا تم نے اس کے مثبت اور منفی پہلو بھی سامنے رکھے ہیں؟ چوتھے بھائی نے جواب دیا: بھائیو! میں نے تمھارے سامنے یہ تجویز سوچ سمجھ کر رکھی ہے۔ باپ کی محبت اور اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ تجویز نہیں دی۔ اگر تمھیں یہ تجویز پسند نہ آئے تو تم بھی اپنی اپنی تجاویز دینے میں آزاد ہو۔ میں بھی تمھاری تجویزیں سننے کو تیار ہوں۔

بھائیوں نے اپنے چوتھے بھائی کی تجویز کو غنیمت جانتے ہوئے اس سے کہا: پھر تم ہی اس تجویز پر عمل کیوں نہیں کر لیتے؟ تمھیں باپ کی دولت میں سے وراثت کے طور پر کچھ نہیں ملے گا۔ چوتھے بھائی نے کہا: ٹھیک ہے، آج کے بعد میں اپنے والد کی خدمت کروں گا۔ اس کے عوض میں ان کے ترکہ میں سے کچھ بھی نہیں لوں گا۔ اس کے بعد چوتھا بھائی والد کی خدمت میں لگ گیا۔ ایک عرصہ تک خدمت کرتا رہا۔ آخر کار ایک دن باپ کا انتقال ہو گیا۔ إنا لله و إنا إليه راجعون.

والد کے انتقال کے بعد بھائیوں کے درمیان ترکہ تقسیم ہوا تو حسب شرط چوتھے بھائی کو کچھ نہیں ملا۔ اس کے بعد بات آئی گئی ہو گئی۔ والد کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد اُس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اُسے کہہ رہا ہے کہ فلاں جگہ جاؤ، وہاں سو دینار دفن ہیں وہ نکال لو۔ اس نے خواب ہی میں پوچھا کہ کیا ان دیناروں میں برکت ہے؟

جواب ملا: نہیں۔ صبح ہوئی تو اس نے بیوی سے اپنا خواب بیان کیا۔ بیوی نے کہا کہ جاؤ سو دینار لے آؤ۔ ہم اس سے کپڑے وغیرہ بنوالیں گے اور گھر میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں خرید کر رکھ لیں گے۔ لیکن اس نے یہ دینار نکالنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی خواب نظر آیا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ فلاں جگہ جاؤ اور وہاں سے دس دینار نکال لو۔ اس نے پوچھا: کیا اس میں میرے لیے برکت ہے؟ جواب ملا کہ نہیں، چنانچہ صبح ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی سے خواب بیان کیا۔ بیوی نے کہا جاؤ! یہی دینار نکال لاؤ۔ مگر اس نے اس مرتبہ بھی دینار نکالنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ جب اس میں میرے لیے برکت ہی نہیں ہے تو نکالنے سے کیا فائدہ؟ تیسرے روز بھی اسے خواب میں ایک آدمی نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ فلاں جگہ جا کر ایک دینار نکال لو۔ اس نے خواب ہی میں پوچھا کہ کیا اس میں میرے لیے برکت ہے؟ جواب ملا: ہاں۔

چنانچہ وہ وہاں گیا اور ایک دینار نکال لایا۔ دینار لے کر بازار گیا تا کہ کچھ کھانے پینے کا سامان خرید لائے۔ اس نے ایک آدمی کو دیکھا جو مچھلی بیچ رہا تھا۔ ایک دینار میں اُس نے دو مچھلیاں خرید لیں اور گھر آ گیا۔ گھر پہنچ کر جب اس نے مچھلی کو پکانے کے لیے کاٹا تو دونوں مچھلیوں کے پیٹ سے ایک ایک موتی نکلا۔ یہ موتی نہایت ہی خوبصورت اور قیمتی تھے۔

اس زمانے کا بادشاہ، موتیوں کا بہت شوقین تھا۔ وہ طرح طرح کے موتی خریدتا اور انھیں میوزیم میں رکھتا۔ اسے ایک خوبصورت موتی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو موتی کی تلاش میں بھیجا۔ وہ اِس نوجوان کی خدمت میں پہنچے اور ایک موتی تیس ہزار دینار میں خرید کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے جب موتی دیکھا تو

ہکا بکا ہوگیا۔ اسے یہ موتی بہت ہی خوبصورت لگا۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھا اور بولا: یہ موتی لاجواب ہے، میں نے آج تک ایسا درخشاں موتی نہیں دیکھا تم لوگ ایسا ایک اور موتی خرید لاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معیار کے دو موتی ساتھ ساتھ رکھوں۔ بادشاہ کے حکم پر اس کے کارندے دوبارہ باپ کے فرمانبردار نوجوان کے پاس پہنچے اور دوسرا موتی بھی خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ نوجوان نے دوسرا موتی بھی بیچ ڈالا۔ مگر اس دفعہ اُسے موتی کی دُگنی قیمت ملی، یعنی ساٹھ ہزار دینار!

میرے بھائیو! ذرا غور کرو کہ چوتھے بھائی کی نیت کا اللہ تعالیٰ نے کتنا شاندار صلہ دیا۔ وہ آدمی جس کو باپ کی دولت میں سے ایک پیسہ بھی بطور وراثت نہیں ملا۔ نہ اس نے باپ کے مال میں سے کچھ لینا چاہا۔ مگر باپ کی خدمت کا صلہ اسے اتنا زیادہ مل گیا کہ اس کے باپ کی دولت اس کو ملنے والے نوے ہزار دینار کے پاسنگ بھی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دولت اس نوجوان کو باپ کی اطاعت اور خدمت کے صلہ ہی میں عنایت فرمائی تھی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا اچھا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی!، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے والدین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں اور دنیا اور آخرت میں انعاماتِ ربانی سے فیض یاب ہوں۔ [1]

---

[1] دیکھیے شعب الإیمان للبیهقي: 208/6، حدیث: 7923، وکتاب: قصص مؤثرة في بر وعقوق الوالدین، ص: 43,42.

گدھے کی آواز والا نافرمان بیٹا

علامہ اصبہانی اس واقعے کے راوی ہیں۔ انھوں نے عوام بن حوشب کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ عوام بن حوشب کا بیان ہے کہ میں ایک بستی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس بستی کے قریب ایک قبرستان تھا۔ قبرستان کے پاس ہی ایک گھر میں میرا قیام تھا۔ میں نے دیکھا کہ عصر کی نماز کے بعد قبرستان کی ایک قبر پھٹی اور اس کے اندر سے ایک آدمی نکلا۔ اس کا سر گدھے کا اور بقیہ جسم انسانوں جیسا تھا۔ اس نے گدھے کی طرح تین دفعہ ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز نکالی۔ پھر قبر بند ہوگئی۔

قبرستان کے پاس ہی ایک بوڑھی خاتون کا گھر تھا۔ وہ اپنے گھر کے پاس بیٹھ کر سوت کاتا کرتی تھی۔ میں نے جب یہ منظر دیکھا تو ڈر گیا۔ میں اندر ہی اندر گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ ایک عورت نے مجھ سے کہا: تم اُس

بوڑھی خاتون کو دیکھ رہے ہو جو سوت کات رہی ہے؟

میں نے کہا: ہاں دیکھ تو رہا ہوں، کیا اس کا اس واقعہ سے کوئی تعلق ہے؟

عورت نے بتایا: یہ بوڑھی خاتون اُس آدمی کی ماں ہے جسے ابھی تم نے قبر سے نکل کر گدھے کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز نکالتے دیکھا ہے۔

میں نے پوچھا: آخر یہ آدمی ایسا کیوں کرتا ہے؟

عورت نے بتایا: بات یہ ہے کہ یہ آدمی شراب نوشی کا عادی تھا۔ جب بھی یہ شراب پیتا اس کی بوڑھی والدہ اسے منع کرتی اور اس سے کہتی کہ بیٹا! اللہ کا خوف کرو، آخر کب تک تم شراب نوشی کرتے رہوگے؟ ماں کی بات سے اُس کا بیٹا شدید غصہ میں آجاتا اور ماں سے کہتا کہ تم کیوں گدھے کی طرح بولتی رہتی ہو۔ بالآخر ایک دن یہ شخص مرگیا اور جب سے یہ دفن ہوا ہے، روزانہ عصر کے بعد اس کی قبر کھل جاتی ہے۔ یہ تین مرتبہ گدھے کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز نکالتا ہے، پھر اس پر قبر بند ہو جاتی ہے۔

علامہ اصبہانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس قصے کو ابو العباس الاصم نے نیشاپور میں حُفَّاظ کے ایک جم غفیر کے سامنے بیان کیا اور ان میں سے کسی نے اس واقعہ کو نہیں جھٹلایا۔[1]

---

[1] اس واقعے کے لیے دیکھیں کتاب غذاء الألباب، ص: 293، دارالنشر ودارلکتب العلمیہ، بیروت، بتحقیق محمد عبدالعزیز الخالدی طبع 1423ھ 2002م، مؤلف علامہ محمد بن احمد بن سالم سفارینی۔ یہ عجیب وغریب قصہ ہے۔ اگر عقل کی کسوٹی پر پرکھیں تو یہ حلق سے نہیں اترتا۔ لیکن اس کی صحت قدرے مضبوط ہے علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ دیکھیے صحیح الترغیب والترھیب: 665/2، حدیث: 2517، دراصل اس قسم کے قصوں کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

کاش! میں بیٹے کی صحیح تربیت کرتا......

سید ع.ف. بیان کرتا ہے کہ میں اپنے بیٹے کے معاملے میں بڑا سخت دل واقع ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ بیٹے کے ساتھ سخت رویہ رکھوں گا تو بیٹے پر رعب رہے گا میرا بیٹا میری عزت کرے گا۔ اس کے اندر خود اعتمادی آئے گی وہ با ہمت ہوگا۔ بڑا ہونے کے باوجود مجھ سے ڈرے گا۔ لیکن بیٹے کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے باوجود بیٹا میرے ڈھب پر نہیں آیا۔ ہمارے مابین باہمی مفاہمت کا فقدان تھا۔ میں اپنے بیٹے کو اپنی مرضی کے مطابق تربیت دینے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ میں ایک وادی میں تھا تو میرا بیٹا دوسری وادی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں میں بعد المشرقین تھا۔

میرا بیٹا اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ میں نے جس انداز میں اس کی تربیت کی تھی اور کر رہا تھا، اُس کے زیرِ اثر میرا بیٹا مجھ سے دور ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ہاں میری عاقبت نا اندیش تربیت کا اتنا اثر ضرور تھا کہ وہ مجھ سے محبت کی بجائے بہت خوف کھایا کرتا تھا۔ اس پر میرا رعب اور دبدبہ ہمیشہ سوار رہتا۔ وہ مجھ سے بات چیت کرتے ہوئے بھی ہچکچاتا، مبادا میں اسے جلی کٹی سنادوں۔ وہ دیگر لوگوں سے بھی خوف زدہ رہتا اور ان سے بات چیت کرنے میں جھجک محسوس کرتا تھا۔ اسے ہر وقت

یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ اگر میں نے کسی سے کوئی بات کی تو وہ میرا مذاق اڑائے گا، اس لیے وہ کبھی کسی سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ بچپن میں وہ جب بھی میرے سامنے کچھ کہتا، میں اس کا مذاق اڑا دیتا اور اس کی باتوں پر بے جا تبصرہ کرتا اور اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

مجھے اس بات کا کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں اپنے بیٹے کی تربیت جس ڈھب سے کر رہا ہوں اُس سے اس کی شخصیت مسخ ہو رہی ہے۔ اس کی صلاحیتوں کا گلا کٹ رہا ہے۔ اس میں احساس کمتری پیدا ہو رہا ہے۔ جب میں بوڑھا ہو گیا اور کاروبار پر پوری توجہ دینے سے قاصر ہو گیا تو میں نے اپنے بیٹے کو آفس کا انچارج بنا دیا۔ کیونکہ میرا بیٹا اب جوان ہو چکا تھا۔ میں اپنے آفس کا منیجر اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں بنا سکتا تھا۔ میرے حکم کے مطابق میرے بیٹے نے آفس کی چابی سنبھالی اور باضابطہ آفس میں میری کرسی پر بیٹھنے لگا۔ چونکہ میں نے اس سے پہلے اسے آفس اور کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، نہ اُسے اِس کام کے لیے تیار کیا تھا۔ نہ اس میں خود اعتمادی تھی کہ اس صورت حال کو سنبھال لیتا، اس لیے جب وہ آفس آیا تو اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ اس لائق نہیں ہے کہ باپ کی کرسی سنبھال سکے۔ اِدھر مجھے بھی اس بات کا شدید احساس تھا کہ میرا بیٹا آفس اور کاروبار کے سنبھالنے کے قابل نہیں ہے مگر اب میں کیا کر سکتا تھا۔ جو وقت اس کی تربیت اور تعلیم کا تھا وہ تو اب ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب سوائے کفِ افسوس ملنے کے میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

میرے بیٹے کو آفس اور کاروبار سنبھالے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ہماری بنائی ہوئی ساری روٹین درہم برہم ہو گئی۔ میری تجارت میں ہر طرف سے بے تحاشا نقصان

ہونے لگا۔ چونکہ میرے بیٹے نے لاعلمی اور عدمِ تجربہ کے پیش نظر ایسے کاروبار میں مال لگا دیا جس سے کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں تھا۔ میرے بیٹے کو کچھ ایسے ساتھی مل گئے جنھوں نے اسے غلط مشورہ دیا اور اس نے ان کے مشورے کے مطابق عمل کیا، چنانچہ میری کمپنی دیوالیہ ہوگئی اور چند ہی دن گزرے تھے کہ میرا آفس اجڑے ہوئے چمن کا نظارہ پیش کررہا تھا۔

قارئین کرام! یہ سچ ہے کہ میرے بیٹے کی وجہ سے میری تجارت ماند پڑ گئی اور میرے شگفتہ چمن میں الو بولنے لگا۔ لیکن میں اس کا ذمے دار اپنے بیٹے کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو مانتا ہوں۔ آخر میں نے اپنے بیٹے کی ایسی تربیت کیوں نہیں کی جو اُس کو مستقبل میں کامیابی کی راہ پر گامزن کرتی؟ سچ تو یہ ہے کہ میں نے بچپن میں اپنے بیٹے پر کبھی دھیان ہی نہیں دیا اور وہ بے لگام گھوڑے کی طرح زندگی گزارتا رہا، یہاں تک کہ وہ جوان ہوگیا اور بالآخر میرا بنا بنایا گھر اس کے ہاتھوں برباد ہوگیا۔

میں اپنی دلخراش داستان ہر باپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دوسرے باپوں کو بھی وہی کڑوا مزہ چکھنا پڑے جیسا کہ میں چکھ رہا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ کوئی بھی باپ اپنے بیٹے کے ساتھ بے اعتنائی نہ برتے جیسا کہ میں یہ غلطی کرکے آج افسوس کررہا ہوں۔ کیونکہ باپ کے لیے بیٹا ہی سب سے زیادہ قیمتی نعمت ہے۔ باپ کا سہارا اس کا بیٹا ہی بن سکتا ہے، اس لیے باپ کو بیٹے کی تربیت اور اچھی تعلیم پر دھیان دینا واجب ہے، اس لیے میں ہر ایک باپ سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے بیٹے کی نقل وحرکت پر کڑی نگاہ رکھے اور اس کی تربیت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔ [1]

---

[1] دیکھیے: مجلة الثقافة الصحية:43/59.

تمھارا بیٹا بھی تمھیں ذبح کردے گا

یہ بات حقیقت ہے کہ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی پھل اسے نصیب ہوتا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے آدمی کو فرماں بردار اور اطاعت گزار بیٹا نصیب ہوتا ہے۔ اسی طرح نافرمان اور بے وفا بیٹے کی اولاد بھی اسی کی طرح ہوا کرتی ہے۔ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ والدین کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنے والا بیٹا اپنے کرتوت کا کڑوا پھل اسی دنیا میں کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ماں باپ کی رضا و خوشنودی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی ماں باپ کی ناراضی میں ہے۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک نوجوان کا بوڑھا والد تھا۔ نوجوان اپنے بوڑھے والد کی فرمائشوں سے تنگ آ چکا تھا۔ اسے والد کی خدمت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دن وہ اپنے والد کو صحرا میں لے گیا۔ صحرا میں ایک ٹیلے کے پاس پہنچ کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ بوڑھا باپ بیٹے کی یہ حرکت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دریافت کیا: بیٹا! آخر تمھارا کیا ارادہ ہے؟ بیٹے نے جواب دیا: میں تمھیں ذبح کرنے کے لیے یہاں لایا ہوں۔

باپ کہنے لگا:

''اگر تم مجھے ذبح ہی کرنا چاہتے ہو تو اِس چٹان کے پاس نہیں، بلکہ سامنے والی چٹان کے پاس ذبح کرو کیونکہ تم سے پہلے میں بھی اپنے والد کا نافرمان تھا۔ اور میں نے اپنے والد کو اسی سامنے والی چٹان کے پاس ذبح کیا تھا۔ آنے والے دنوں میں تمھارا بیٹا بھی تم سے یہی سلوک کرے گا۔''

سب سے زیادہ بدبخت بیٹا

تاریخ اسلام میں اصمعی نام کے ایک ادیب گزرے ہیں۔ عربی ادب پر انھیں کمال کی مہارت تھی۔ بلکہ اُس دور میں جبکہ لغوی، صرفی اور نحوی قواعد کا اتنا رواج نہیں تھا، یہ اپنے فن کے امام سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ امام شافعی رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ عربوں کی تعبیریں اصمعی سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔ امام ذہبی نے انھیں امام، علامہ، حافظ اور عربی زبان وادب کے لیے حجت جیسے القاب سے نوازا ہے۔ ابن خلکان ان کی سیرت کے باب میں فرماتے ہیں کہ اصمعی لغت اور نحو کے امام تھے۔ انھوں نے نادر واقعات کے ذریعے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ان کی وفات 16 یا 17 ہجری میں 88 سال کی عمر میں ہوئی۔ ذیل میں جو واقعہ بیان کیا جارہا ہے اس کے راوی بھی اصمعی رحمہ اللہ ہی ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

''مجھ سے ایک اعرابی (بدو) نے بیان کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ یہ تہیہ کرلیا کہ اس روئے زمین پر چل پھر کر دیکھوں گا اور پتہ لگاؤں گا کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ بدبخت اور نافرمان آدمی کون ہے؟ چنانچہ میں گھر سے اسی تلاش میں نکلا۔ میں نگر نگر، بستی بستی اور قریہ قریہ گھوم رہا تھا اور لوگوں سے اس سلسلے میں معلومات بھی حاصل کر رہا تھا۔ اسی دوران میری رسائی اُس بوڑھے شخص تک ہوگئی

جس کی گردن میں رسی بندھی ہوئی تھی اور وہ ڈول میں پانی بھر بھر کر اونٹ کو پانی پلا رہا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک جوان تھا جو اُس کی گردن میں بندھی ہوئی رسّی کو پکڑے ہوئے تھا اور اوپر سے اس کی پیٹھ پر کوڑا بھی برسا رہا تھا۔

میں نے کہا: اے جوان! تو بھی کس قدر بے درد انسان ہے، کیا تجھے اس بوڑھے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہے؟ کیا اس بوڑھے کی تکلیف کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ اُس کی گردن میں رسی پڑی ہوئی ہے اور یہ اس عمر میں تیرے اونٹوں کو پانی پلا رہا ہے؟ پھر اس کی پیٹھ پر کوڑا برسانا، یہ تو ظلم کی انتہا ہے۔

میری باتیں سننے کے بعد وہ نوجوان بولا: تم کو یہ جان کر اور زیادہ تعجب ہوگا کہ یہ بڈھا میرا باپ ہے۔ یہ سننا تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہنا شروع کیا کہ اللہ تیرا ناس کرے، کیا کوئی بیٹا اپنے باپ کی یہ درگت بناتا ہے؟ کیا کوئی بیٹا اپنے بوڑھے باپ کو اتنا ذلیل اور رسوا کرتا ہے؟

میرے تبصرے پر وہ کہنے لگا: چپ رہو، اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھو تو بہتر ہے، یہ سلوک میں ہی اس کے ساتھ نہیں کر رہا، بلکہ مجھ سے پہلے یہ بھی اپنے باپ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا رہا ہے۔ مؤرخین کے الفاظ میں اس کے جواب کے الفاظ یہ ہیں:

> ''چپ رہ، یہ بھی اپنے باپ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا تھا اور اس کا باپ بھی اپنے باپ کے ساتھ ایسا ہی ظالمانہ سلوک کیا کرتا تھا۔''

اعرابی کا بیان ہے: میں نے جب باپ کے ساتھ بیٹے کا یہ وحشیانہ رویہ دیکھا تو مجھے یقین آ گیا کہ میں روئے زمین کے بدترین نافرمان تک پہنچ چکا ہوں۔ اس سے بڑا گنہگار اور اس سے بڑھ کر بدبخت نافرمان اس دھرتی پر اور کوئی نہیں ہوگا۔

یہ ہے سوچنے کی بات اس کو بار بار سوچ!

ابنِ رشد اندلسی رحمہ اللہ سے کون واقف نہیں۔ وہ علم فلسفہ کے امام اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کی پیدائش سرزمینِ اندلس کے معروف شہر قرطبہ میں 1126ء میں ہوئی۔ ان کا نام محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن احمد بن رشد القرطبی الاندلسی ہے۔ اُن کی کنیت ابو الولید تھی۔ یہ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے دادا محمد بن احمد اپنے زمانے کے جَید علماء میں سے تھے۔ فقہ وفتویٰ میں اُن کا اعلیٰ مقام تھا۔ بعد میں قرطبہ کے جج بھی مقرر ہوئے۔ اسی طرح ابنِ رشد کے والد احمد بن محمد بھی علم میں اپنے ہم عصروں پر فائق تھے۔ وہ قرطبہ میں جج کے عہدے پر فائز رہے۔

ابنِ رشد کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے والد کی بے حد عزت کرتے تھے۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکر سمجھے جاتے تھے مگر جہاں اُن کے والد کی بات آتی وہ فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا کرتے تھے۔ ابنِ رشد کو نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ بعد کے ادوار میں بھی بہت بلند مقام اور شہرت ملی، انھوں نے اپنے علم کا سِکّہ منوانے کے

لیے زبردست محنت ومشقت اور وقت کا بھرپور استعمال کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی مطالعہ ترک نہیں کیا۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اعلیٰ علمی معیار برقرار رکھنے اور اہلِ دنیا کے سامنے مضبوط فلسفہ پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مدلل اور معقول باتیں کی جائیں۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جبکہ خود کو کتابوں ہی کی دنیا کے لیے وقف کردیا جائے۔

ابنِ رشد نے اپنے استاد ارسطو کے فلسفہ سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ کہتے ہیں کہ ارسطو کے فلسفہ کا ابنِ رشد سے بہتر شارح نہیں دیکھا گیا۔ ابنِ رشد کے اخلاق اور صفاتِ حمیدہ میں سے جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اُن میں وہ تمام اوصاف حمیدہ شامل ہیں جو ایک اچھے انسان کے ہو سکتے ہیں، البتہ اُن میں ایک اور نادر وصف بھی تھا جو اُن کے اخلاقِ کریمانہ کے موتیوں میں سب سے زیادہ جگمگاتا تھا۔ وہ تھا والد کے ساتھ ان کی بے لوث محبت اور بے تحاشا لگاؤ۔ مؤرخین نے اُن کی سوانحِ حیات میں لکھا ہے کہ جب سے ابن رشد نے ہوش سنبھالا، انھوں نے زندگی بھر مطالعہ ترک نہیں کیا۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے دور میں فلسفہ کے ذریعے اسلام پر جو فکری یلغار ہو رہی ہے، اس کے دفاع میں مضبوط ہتھیار اسی وقت مہیا کیے جا سکتے ہیں جبکہ وقیع علمی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ کتابیں پڑھنا ہی اُن کا وظیفۂ حیات تھا۔ کتب بینی کو انھوں نے اپنی زندگی کا اصول بنا لیا تھا جسے وہ کسی بھی حال میں توڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔

یہ بات دنیا بھر میں اُن ہی کے زمانے میں مشہور ہوگئی کہ ابن رشد اور مطالعہ لازم اور ملزوم ہیں۔ لیکن ابنِ رشد کو پوری زندگی میں اپنا اصول توڑنے پر صرف دو مرتبہ مجبور ہونا پڑا۔ ایک اُس دن جس دن اُن کے والد احمد بن محمد قرطبی کا انتقال ہوا تھا اور

دوسرا وہ دن ہے جس دن ان کی شادی ہوئی۔ ان کی پوری زندگی میں یہی دو دن ایسے گزرے جن میں وہ کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکے۔ ان کی معروف کتاب ''بدایة المجتهد ونهاية المقتصد'' میں لکھا ہوا ہے:

''ابنِ رشد نے جب سے ہوش سنبھالا کتب بینی سے صرف دو (2) ہی رات محروم رہے، ایک اس رات جس میں ان کے والد کا انتقال ہوا اور دوسری اپنی سہاگ رات۔'' [1]

ابنِ رشد کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا اور پڑھا جاتا رہے گا۔ یہاں قارئین کرام کو ان کے بارے میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ اتنے بڑے فلسفہ کے امام بھی اپنے والد کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ اُن کے سامنے معمولی آدمی بلکہ ایک بچے کی طرح رہتے تھے۔ جب اتنے بڑے عالم، فلسفی اور مفکر کا اپنے والد کے سامنے یہ حال تھا تو ہم لوگوں کو اپنے والدین کے سامنے کس قدر تواضع اور انکسار سے رہنا چاہیے؟ [2]

ع............ یہ ہے سوچنے کی بات، اس کو بار بار سوچ!

---

[1] دیکھیے کتاب: بداية المجتهد ونهاية المقتصد، ص: 6، دار الکتب العلمیة بیروت کا ایڈیشن 2007ء۔ [2] ابن رشد کے بارے میں اگر معلومات حاصل کرنا چاہیں تو یہ کتابیں دیکھیں: ابن الأبار في التكملة: 553/2، و العبر: 287/4، و الوافي: 114/2، و النجوم: 154/6، و الشذرات: 320/4، و الديباج المذهب: 257/2، و سير أعلام النبلاء: 21/307-310 .

مجھے داستانِ عبرت وہ سُنا سنا کے رویا!

اس واقعہ کے راوی سعودی عرب کے ایک مشہور داعی اور خطیب جناب عبداللہ المطر ود ہیں۔ یہ واقعہ انھوں نے ''دار أھلھا یتکلمون'' نامی تقریر میں بیان کیا۔ یہ واقعہ ہم کیسٹ سے نقل کر رہے ہیں۔ انھوں نے ریاض کے مضافات میں واقع ہسپتال کا دورہ کیا۔ یہاں پر اکثریت ایسے مریضوں کی تھی جو سڑک کے حادثات میں زخمی ہوئے۔ انھوں نے مریضوں کے احوال دریافت کیے تو ان میں سے ایک 27 سالہ نوجوان نے اپنا واقعہ یوں بیان کیا:

آپ لوگ مجھے ہسپتال میں اس حالت میں دیکھ رہے ہیں کہ میں اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا، میں پابندِ بستر ہوں۔ دن رات بسترِ پر پیٹھ یا پیٹ کے بل لیٹا رہتا ہوں۔ میرا کئی سال پہلے ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ایکسیڈنٹ کے دن سے آج تک میں اسی ہسپتال میں داخل ہوں۔ میری کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ایک دن میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے ایک قریبی رشتے دار کے گھر جانا چاہتی ہوں، تم مجھے گاڑی سے پہنچا دو۔

میں نے کہا: مجھے کہیں اور جانا ہے، میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو چھوڑنے جاؤں، آپ کو بعد میں کبھی فرصت ملے گی تو ان سے جا کر ملاقات کر لینا،

ابھی میں مشغول ہوں اور مجھے کہیں جانا ہے۔

والدہ نے فرمایا: ''بیٹا! میں جن لوگوں کے پاس جانا چاہتی ہوں، اُن کا مجھ پر ایک عظیم احسان ہے، میں ان کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی، چاہتی ہوں کہ ان سے ملاقات کر کے انھیں سلام دعا کہہ آؤں، اس لیے میرا ان کے ہاں جانا از حد ضروری ہے، تم مجھے وہاں لے چلو۔''

''لیکن ایک شرط ہے۔'' میں نے ماں سے مخاطب ہو کر کہا

''وہ شرط کیا ہے بیٹا؟''

میں نے کہا: وہ شرط یہ ہے کہ میں تمھیں لے کر چلتا ہوں۔ میں تمھیں تمھارے رشتے دار کے گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور ٹھیک آدھے گھنٹہ بعد واپس آؤں گا۔ واپسی پر دروازے کے پاس پہنچ کر صرف ایک مرتبہ گاڑی کا ہارن بجاؤں گا، اگر ایک ہارن پر تم گھر سے نکلوگی تو ٹھیک، ورنہ میں تمھیں وہیں چھوڑ کر آگے نکل جاؤں گا۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ماں کو مطلوبہ مکان پر چھوڑ کر مجھے جہاں جانا تھا چلا گیا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد واپس آیا۔ دروازے کے پاس گاڑی روک کر صرف ایک مرتبہ ہارن بجایا۔ جب ماں باہر نہیں آئی تو میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور گاڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا دی۔ مجھے وہاں سے نکلے ابھی چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ اچانک میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور میں بُری طرح زخمی ہو گیا۔ اب آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں کہ میں رات دن روتا ہوں، نہ حرکت کر سکتا ہوں، نہ کھڑا ہو سکتا ہوں۔ کروٹ بدلنے سے بھی معذور ہوں۔ صرف منہ اور پیٹھ کے بل لیٹ سکتا ہوں۔ آہ! میں اس حالت کو ماں کی نافرمانی ہی کی پاداش میں پہنچا ہوں۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ!

احمد ابن تیمیہ کی طرف سے،
والدۂ محترمہ کے نام مکتوب

امام ابن تیمیہ ساتویں صدی ہجری کے بہت بڑے مفکر، محدث و مفسر، متکلم، دانشور اور شارح کتاب وسنت تھے۔ شرح علوم دین کے میدان میں ان کی تجدیدی مساعی کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ شیخ الاسلام کے بلند و بالا منصب پر فائز تھے۔ اپنے زمانے کے تمام علوم وفنون پر ماہرانہ و ناقدانہ ہی نہیں محرمانہ نظر رکھتے تھے۔ 661ھ میں شام کے شہر حران میں پیدا ہوئے۔ والد انھیں اُس دور کے مرکز علوم وفنون دمشق میں لے آئے۔ امام ابن تیمیہ نے دمشق میں مروجہ علوم وفنون کی تحصیل کی۔ ابھی بیس برس کے بھی نہیں تھے کہ مسند افتاء وتدریس پر متمکن ہوئے۔ حق کی راہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ افتاء و تدریس کے لیے مصر بلایا گیا۔ وہاں درباری ملاؤں کے ایک ٹولے نے امام ابن تیمیہ کے خلاف سازش کی۔ چنانچہ انھیں جیل میں قید کردیا گیا۔ 712ھ میں رہائی پاکر دمشق واپس آگئے۔ انھوں نے والدۂ محترمہ کو یہ خط مصر ہی سے لکھا تھا۔ تین سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں

سے چند ایک کتابیں کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ 728ھ میں قید خانے میں وفات پائی۔ شہر دمشق کے تمام افراد نے اسلام کے اس عظیم فرزند کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

آیئے ہم اس عظیم شخصیت کا خط بنام والدہ محترمہ، پڑھتے ہیں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سب سے پہلے تو یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فیضانِ نعمت سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرتا رہے اور آپ پر اپنے فضل و کرم کی برکھا برساتا رہے۔

پھر یہ دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے خدام میں شامل کرے۔

ہم آپ کے ساتھ مل کر اُس کی بے بہا نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جو حمد ہی کا اہل ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ وہ نبیوں کے خاتم، متقین کے امام جناب محمد (ﷺ) پر رحمتیں نازل کرے جو اس کے بندے اور رسول ہیں۔

حمد و ثنا کے بعد احوالِ واقعی یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمتوں کا لطف اٹھا رہے ہیں اور اُس کے بے پناہ احسانات سے پوری طرح بہرہ مند ہیں۔ ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے اور اُس سے مزید نعمتوں کے طالب ہیں۔

آپ تو جانتی ہیں کہ ہم آج کل یہاں چند ضروری کام نمٹانے ٹھہرے ہیں۔ یقین جانیے یہ کام بہت اہم ہیں۔ انھیں نہ نمٹایا گیا تو خدشہ ہے کہ معاملاتِ دین و دنیا بگڑ جائیں گے۔

واللہ! ہم جان بوجھ کر آپ سے جدائی اختیار نہیں کر سکتے۔ یہ پرندے ہمیں اٹھا سکتے تو ہم اڑ کر آپ کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ لیکن جو آدمی غیر حاضر ہو اس کا کوئی نہ کوئی عذر ہوتا ہے۔ اور اپنے عذر سے خود وہی واقف ہوتا ہے۔

یہاں قیام کے دوران اللہ تعالیٰ نے خیر و برکت اور رحمت و ہدایت کے وہ وہ دروازے کھولے ہیں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔

چند بڑے کام ابھی باقی ہیں۔ ان کاموں کو نظر انداز کیا گیا تو کئی طرح کے نقصانات سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہے۔ آپ سے بس یہی گزارش ہے کہ ہمیشہ کی طرح دعاؤں میں یاد رکھیے۔

دیکھیے نا! تاجر کو جب بیرونِ ملک سفر پر ضیاعِ مال و متاع کا ڈر ہوتا ہے تو ممکنہ خسارے سے بچنے کے لیے اسے وطن سے دور رہنا ہی پڑتا ہے۔ پھر ہمارے کام کی اہمیت تو بہت زیادہ ہے، اتنی کہ بیان کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

آخر میں آپ کو، سب گھر والوں کو، چھوٹوں، بڑوں اور تمام دوستوں کو فرداً فرداً میرا بہت بہت سلام پہنچے۔

حمد اللہ ہی کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے آقا محمد (ﷺ)، آپ کے اہل خانہ اور اصحابِ کرام پر بے شمار درود و سلام بھیجے۔

مرنے والے سے والدین راضی تھے

اس واقعے کا راوی بیان کرتا ہے کہ

ذوالحجہ کے اوائل کی بات ہے۔ میں سہ پہر کو دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ میرے ایک کولیگ احمد صاحب جو فرم کے دوسرے شعبے میں کام کرتے ہیں، میرے دفتر آئے۔ ایک صاحب اُن کے ساتھ تھے۔ عمر یہی کوئی تیس کے لگ بھگ تھی۔ میں نے اُن کا خیر مقدم کیا، چائے منگوائی اور کہا کہ فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

وہ صاحب بولے: ''جناب! بات یہ ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز جن کی عمر تقریباً چالیس برس کی تھی، بیرون ملک مقیم تھے۔ وہ وہاں بدھ کے روز وفات پا گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جمعرات کے روز 5 اور 6 ذوالحجہ کی درمیانی شب اُن کی نماز جنازہ حرمِ مکہ میں ادا کی جائے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس موقع پر حاجیوں کی بڑی تعداد مکہ پہنچ چکی ہوتی ہے۔ آج ہم پہلی فلائیٹ سے اُن کی میت لینے جا رہے ہیں۔ آپ سے صرف

اتنی درخواست ہے کہ ہوائی اڈے پر ہمارا انتظار کریں تا کہ آپ کی وساطت سے اُن کی میت مکہ پہنچ جائے۔ اُمید ہے کہ آپ کی مدد سے ضروری کاغذی اور تفتیشی کارروائی کا مرحلہ بآسانی طے ہو جائے گا۔ واپسی پر ہم وہاں کے ہوائی اڈے سے آپ کو فون کریں گے اور فلائیٹ کا نمبر بتا دیں گے۔"

میں نے ان شاء اللہ کہتے ہوئے ہامی بھر لی۔ اگلے روز مجھے فون پر فلائیٹ کا نمبر بتایا گیا۔

میں نے متعلقہ افسر کو فلائیٹ کا نمبر دیا اور پوچھا کہ یہ فلائیٹ کب پہنچ رہی ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ فلائیٹ پہنچنے والی ہے۔ میں ہوائی اڈے پہنچا۔ میت کے لواحقین بھی فلائیٹ کے منتظر تھے۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ فلائیٹ جدہ کے ہوائی اڈے پر اتری۔ میت کو ہوائی جہاز سے اتار کر ائیر پورٹ کی ایمبولینس گاڑی میں رکھا گیا۔ اس گاڑی نے تابوت ہوائی اڈے کے مین گیٹ پر اتار دیا۔

اب تابوت میری گاڑی میں رکھا گیا۔ میں اسے لیے اُن صاحب کے گھر روانہ ہوا۔ وہاں لوگ بے چینی سے میرے منتظر تھے۔ چند افراد بھاگے بھاگے گئے اور قریبی مسجد سے لکڑی کا تختہ اٹھا لائے جس پر میت کو غسل دیا جاتا ہے۔ غسل اور تجہیز و تکفین کے لیے جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ تابوت گاڑی سے اتارا گیا اور میت کو نکال کر تختے پر ڈال دیا گیا۔ غسل میت کا مخصوص کپڑا اوپر ڈالا اور بدن کے کپڑے اتار دیے گئے۔ مرنے والے کا جسم فربہ تھا، اس کے باوجود غسل کا مرحلہ تیزی سے طے ہو گیا اور زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ میت کو خوشبو لگا کر، کفن دے کر گھر کے ایک کمرے میں رکھ دیا گیا۔ گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی۔ میت کے دیگر لواحقین بھی ہوائی اڈے سے پہنچ

رہے تھے۔ ایک قریبی عزیز نے جو ابھی ابھی پہنچے تھے، ہمیں گھر کے باہر کھڑے دیکھا تو سمجھے کہ ہم اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔ بازو چڑھائے اور بولے: ''چلیے، کہاں غسل دینا ہے میت کو؟'' میں نے کہا کہ غسل تو ہم دے چکے۔ فجر میں ابھی خاصا وقت ہے۔ میں میت کو اپنی ذمے داری پر مکہ میں دفن کراؤں گا۔

یاد رہے کہ سعودی حکومت نے ذوالحجہ کے مہینے میں مکہ میں تدفین پر پابندی لگا رکھی ہے۔ حاجیوں کا بے پناہ رش ہوتا ہے۔ سال کے دیگر مہینوں میں مکہ میں تدفین کی اجازت ہے۔ لیکن اس کے لیے شمیسی کی چیک پوسٹ پر اجازت نامۂ تدفین اور پیشگی وفات نوٹس کی فوٹو کاپی دکھانی پڑتی ہے۔ بصورت دیگر جنازے کو مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ آج کل مکہ میں داخلے کے لیئے تین چیک پوسٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے ام سلم کی چیک پوسٹ پر جانچ پرتال کی جاتی ہے۔ پھر شمیسی پر چیک پوسٹ سے واسطہ پڑتا ہے۔ آخری چیک پوسٹ شہر مکہ میں داخلے سے پہلے آتی ہے۔ ان تینوں چیک پوسٹوں پر ٹھہر کر شناخت کرانی پڑتی ہے۔

ہم مکہ میں داخل ہو رہے تھے۔ میت کے لواحقین کی گاڑیاں ایمبولینس کے آگے پیچھے تھیں۔ پہلی چیک پوسٹ پر ٹھہرے۔ اگلی اور پچھلی گاڑیوں میں میت کے لواحقین سے شناخت طلب کی گئی۔ یہ مرحلہ طے ہوا۔ لیکن مجھ سے کسی نے شناخت نہیں مانگی۔ نہ یہ پوچھا کہ گاڑی میں کیا ہے۔ اجازت نامۂ تدفین اور پیشگی وفات نوٹس کی فوٹو کاپیاں میرے ہاتھ میں تھیں۔ میں نے اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال رکھا تھا۔ اس کے باوجود چیک پوسٹ کے افسر نے مجھے نہیں روکا۔ اس نے تو میری طرف دیکھا تک نہیں۔

اگلی دونوں چیک پوسٹوں پر بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ سب لوگوں کی جانچ

پڑتال ہوئی لیکن مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ تمھارے منہ میں گے دانت ہیں۔

اذان فجر سے تقریباً دو گھنٹے پیشتر ہی ہم شہر مکہ میں موجود تھے۔ اسی وقت حرم میں داخل ہونے کی کوشش کرتے تو عین ممکن تھا کہ سکیورٹی افسر حرم کے دروازے پر روک لیتا اور حاجیوں کی بھیڑ کے پیش نظر وہیں نماز جنازہ پڑھنے کو کہتا۔ لیکن میت کے لواحقین چاہتے تھے کہ نماز جنازہ حرم کے اندر ادا کی جائے۔ مرنے والے کے بھائی نے مجھ سے کہا کہ چلیے پہلے والد صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔ اہل خانہ میت کا منہ دیکھ لیں گے۔ ہم اذان فجر کے قریب آ کر حرم میں داخل ہو جائیں گے۔ تب امید ہے کوئی نہیں روکے گا۔

ایمبولینس والد صاحب کے گھر روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچے۔ گاڑی کو گیراج میں کھڑا کیا۔ مرنے والے کے بھائی نے کہا کہ میت کو اتاریے نہیں۔ گاڑی میں رہنے دیجیے۔ بس گاڑی کا دروازہ کھول کر منہ سے کفن ہٹا دیجیے۔ والد صاحب مارے غم کے چلنے سے قاصر تھے۔ دو آدمیوں کے سہارے آئے۔ میت کو دیکھا۔ رو پڑے۔ چہرے پر بوسہ دیا۔ وہ شدت سے نڈھال تھے۔

ہم فجر کی پہلی اذان کا انتظار کر رہے تھے۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ جنازے کے ساتھ حرم میں داخل ہونا اذان فجر کے قریب ہی ممکن تھا۔ ورنہ سکیورٹی افسر جنازے کو دروازے پر روک لیتے اور وہیں نماز جنازہ پڑھنے پر مجبور کرتے۔

فجر کی پہلی اذان ہو چکی تو میں بڑے راستے پر ہو لیا جو باب السلام تک پہنچتا ہے۔ جنازوں کو اسی راستے حرم میں لایا جاتا ہے۔

دروازے پر تعینات سکیورٹی افسر نے مجھے اندر جانے سے منع کیا۔ میں نے بتایا کہ

میرے ساتھ جنازہ ہے۔ بولا: ''جانتا ہوں لیکن تم اندر کیسے جاؤ گے۔ دیکھتے نہیں، کتنی بھیڑ ہے۔ حاجی پوری سڑک پر پڑے ہیں۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔''

میں نے جھنجھلا کر کہا: ''پھر جنازے کو کہاں پھینکوں؟''

کہنے لگا: ''بڑی سڑک کی طرف سے جاؤ۔''

میں جلدی سے اس طرف مڑا۔ ٹریفک سارجنٹ نے روکا۔

''کہاں جاتے ہو؟''

میں نے بتایا کہ میرے ساتھ جنازہ ہے۔

کہنے لگا: ''نظر نہیں آتا۔ حاجیوں کا ٹڈی دل یہاں سے وہاں تک پورے راستے پر چھایا ہوا ہے۔ تم کہاں سے گزرو گے؟ جنازے کو گاڑی سے اتارو اور کندھوں پر اٹھا کر حرم میں داخل ہو جاؤ۔''

''لیکن نماز جنازہ سے پہلے مجھے اجازت نامۂ تدفین اور پیشگی وفات نوٹس کی فوٹو کاپیاں دکھانے قبرستان بھی جانا ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔

بولا: ''نماز کے بعد راستہ بدل کر فوٹو کاپیاں دکھا آنا۔''

میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنا چاہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گاڑی کے آگے ایک اور جنازہ کندھوں پر سوار حرم کی طرف جا رہا ہے۔ لوگوں کو پتہ چلا کہ ایمبولینس میں جنازہ ہے تو وہ ایمبولینس پر ٹوٹ پڑے۔ پچھلا دروازہ کھولا۔ جنازے کو کندھوں پر اٹھائے حرم کی طرف چل پڑے۔ میت کے ایک عزیز نے جو جنازے کے ساتھ ساتھ تھے، بتایا کہ جنازے کو اتنے لوگوں نے اٹھا رکھا تھا کہ مجھے صرف ایک بار کندھا دینے

کا موقع ملا۔

میں نے گاڑی کے ایک جانب فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد حرم کے امام نے اعلان کیا کہ اب مرنے والوں کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ اس روز آٹھ جنازے حرم میں لائے گئے تھے۔ پانچ مردوں کے اور تین عورتوں کے۔ بیس لاکھ سے زائد مسلمانوں نے اُن آٹھ خوش نصیبوں کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ نماز جنازہ کے بعد تدفین تک کے تمام مراحل میں بھی بہت سے لوگوں نے حصہ لیا اور یہ امور بحسن و خوبی انجام پذیر ہوئے۔ یہ بہت بڑی سعادت تھی جو اُن آٹھ افراد کے حصے میں آئی۔

میں نے میت کے لواحقین سے میت کے بارے میں پوچھا تو سب کا ایک ہی جواب تھا کہ مرنے والے کے والدین اُس سے راضی تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ تجہیز و تکفین، حرم میں نماز جنازہ اور مکہ میں تدفین کے مراحل یوں آسانی سے کیونکر طے پا گئے۔ ان تمام معاملات کی انجام دہی بظاہر ناممکن معلوم ہوتی تھی۔

اللہ اللہ مکہ مکرمہ بیت الحرام میں نماز جنازہ کم و بیش 20 لاکھ حجاج کا نماز جنازہ پڑھنا کوئی معمولی اعزاز تو نہیں ...... یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا...... والی بات تھی۔ اور اس کا سبب والدین کی رضا تھی۔

آخری کہانی......

میری یہ پرانی عادت ہے کہ میں عربی زبان میں کیسٹیں سنتا ہوں۔ بطور خاص اگر کبھی ریاض سے باہر جانا ہو تو پھر گاڑی میں تقاریر سنتا ہوں۔ ان میں سے بہت سی تقریریں بھول جاتا ہوں اور بہت سی ایسی ہوتی ہیں جن کے اقتباسات یا واقعات یاد رہ جاتے ہیں۔ میں نے ایک عرب خطیب کی زبانی مندرجہ ذیل واقعہ سنا۔ مجھے اس کی مکمل تفصیل یاد نہیں۔ مگر جو کچھ یاد رہ گیا ہے اُسے حافظے کی مدد سے مختصراً لکھ رہا ہوں۔

آج سے لگ بھگ 20 سال پہلے عراق نے اچانک کویت پر قبضہ کر لیا۔ کویت ایک چھوٹا سا ملک تھا اور عراق ایک بڑی طاقت تھی۔ عراقی فوجیوں نے نہایت آسانی سے کویت کا انتظام سنبھال لیا۔ کویت اس وقت بھی دنیا کا امیر ترین ملک تھا اور آج بھی دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔ قبضے کی بعد افراتفری پھیل گئی۔ بے شمار خاندانوں نے سعودی عرب کا رخ کیا۔ جنھیں سعودی عرب نے خوش آمدید کہا۔ انھی خاندانوں میں ایک معزز اور محترم خاندان کویت سے ریاض روانہ ہوتا ہے۔ گھرانے کے دیگر افراد میں صاحب خانہ کی والدہ بھی شامل تھی۔ گھر سے نکلتے وقت انھوں نے کافی مقدار میں کھانا ساتھ لے لیا۔ کویت سے ریاض کا بارڈر دور نہیں تو زیادہ قریب

بھی نہیں ہے۔ راستہ میں صحرا ہے۔ ان کے پاس بڑی جی ایم سی گاڑی تھی۔ کویت شہر سے باہر نکلے تو یہ لوگ راستہ بھول گئے۔ اس وقت G.P.S ایجاد نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے کچھ فاصلہ طے کیا تو آگے ایک چوراہا نظر آیا۔ وہاں ایک عراقی فوجی پہرہ دے رہا تھا۔ انھوں نے گاڑی فوجی کے قریب روکی اور اس سے ریاض کا راستہ پوچھا۔ عراقی فوجی نے جانے بوجھے ان کو غلط راستہ بتایا، یہ صحرا کے نشیب وفراز کا تھا۔ آگے جا کر انسان بھول بھلیوں میں پھنس سکتا تھا۔ بعض اوقات صحرا میں بھٹکنے والے راہی پٹرول ختم ہونے کی وجہ سے یا پانی نہ ہونے کی وجہ سے ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔ فیملی نے فوجی کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی اس کے بتائے ہوئے راستہ پر روانہ ہوگئی۔ تھوڑا آگے گئے تو انھوں نے گاڑی روک کر کھانا کھایا۔ اچانک ان کی والدہ کہنے لگی کہ وہ فوجی جس نے ہمیں راستہ بتایا ہے نجانے کب سے بھوکا ہو گا۔ ہمارے پاس کافی کھانا بچ گیا ہے ہمیں یہ کھانا اسے دے دینا چاہیے۔ وہ کافی آگے جا چکے تھے مگر والدہ نے بیٹے کو حکم دیا کہ گاڑی واپس موڑو اور اس فوجی کو کھانا دے کر آؤ، پھر ہم سفر کریں گے۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد فرماں بردار بیٹے نے گاڑی واپس موڑی اور اُسی فوجی کے پاس پہنچ گیا۔ اُس سے کہا:

جناب! ہمارے پاس کھانا کافی مقدار میں بچ گیا ہے۔ میری والدہ نے حکم دیا ہے کہ آپ کو کھانا دے دوں۔ نجانے آپ کب سے بھوکے ہوں گے۔ اسی لیے ہم واپس مڑ کر آئے ہیں۔ وہ فوجی واقعی بھوکا تھا مگر وہ اس خوف سے بدک گیا کہ کہیں ان لوگوں نے کھانے میں زہر نہ ملا دیا ہو، اس لیے اس نے کھانا لینے میں تردد کیا۔ جب نوجوان نے اصرار کیا تو فوجی نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ کھانا اُسی

وقت قبول کروں گا جب تم خود اسے میرے سامنے کھاؤ گے۔

صاحب خانہ کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ اس نے کچھ لقمے اس کے سامنے کھا لیے۔ اب اس فوجی کو یقین ہو گیا کہ کھانا بالکل ٹھیک ہے اور یہ نوجوان والدہ کے حکم کی تعمیل میں یہاں آیا ہے۔

اب اس فوجی کا ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے کہا: واقعی تم سعادت مند نوجوان ہو۔ ماں کا حکم مان کر اتنی دور سے مجھے کھانا کھلانے آئے ہو۔ لازم ہے کہ میں بھی تم سے نیکی کا برتاؤ کروں۔ اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں نے تمھیں غلط راستہ بتایا تھا۔ ریاض کا صحیح اور سیدھا راستہ اس طرف ہے ..... یہ کہہ کر فوجی نے صحیح رُخ کی طرف اُنگلی اُٹھادی اور اشارہ کرتے ہوئے اس کی رہنمائی کی۔

اس طرح والدہ کا حکم ماننے کا نقد صلہ یہ ملا کہ وہ لوگ تپتے ہوئے صحرا میں یقینی ہلاکت سے بچ گئے۔

Walidain

Written By: ABDUL MALIK MOJAHID

والدین

اطاعت ونافرمانی، واقعات کی زبانی

زیر نظر کتاب میں والدین کی اطاعت ونافرمانی کے حوالے سے مختلف واقعات جمع کئے گئے ہیں۔ ان واقعات میں بلاشبہ بڑی عبرت ہے۔ والدین کو کیسے راضی کیا جائے، یہ بڑا اہم سوال ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے اپنے ذاتی تجربات اور مختلف کتابوں کے مطالعہ کی روشنی میں بتایا ہے کہ والدین کی خوشنودی اور رضا کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہم والدین کے ساتھ حسن سلوک اور نافرمانی کے واقعات پڑھ کر ان سے سبق حاصل کریں۔ اپنے والدین کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ وہ زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں، دونوں صورتوں میں ان کو ہماری ضرورت ہے۔

MAKTABA BAIT-AL-SALAM
MAUNATH BHANJAN - U.P. (INDIA)